یادگارِ ایوب قادری

اردو کے معلم و ادیب سید ظفر الحسن مرحوم کی یاد میں
یہ کتاب کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو
حیدرآباد دکن کو پیش کی جاتی ہے

مجلس ادبیات مشرقی
بی - ۹/۲۶ - ناظم آباد - کراچی

ادارۂ دانش و حکمت

ڈی ۱۳ - بلاک بی - نارتھ ناظم آباد - کراچی

(7)

سال اشاعت ۱۹۸۶ء

مطبع

ایجوکیشنل پریس ۔ پاکستان چوک ۔ کراچی

مشمولات

گشت از گردشِ ایام فسانہ شخصے
رفت از محفلِ ما آہ یگانہ شخصے
ہمچو اُو فاضل و نقّاد و محقق دیدی؟
بود آں خُلد مکاں "فخرِ زمانہ شخصے"

۱۹۸۳ء

کلیمؔ زیدی

تہدیہ

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم ہمارے لئے نہ صرف ایک محقق، مصنّف اور ادیب تھے بلکہ ادارۂ دانش و حکمت کے معتمد بھی تھے۔ اس لئے اُن کا سانحۂ ارتحال ہمارے لئے کئی گنا الم انگیز ہے۔ اُن کے پر خلوص مشوروں، صائب رائے اور ہر طرح کے تعاون کی وجہ سے ہمیں بڑی تقویت تھی۔ ادارے کے کاموں کو وہ جس جوش اور جذبہ کے ساتھ انجام دیتے تھے اُس کی وجہ سے یہ ایک فعال ادارہ بن گیا تھا اور اُن کے زمانہ میں ادارہ کی جانب سے جتنا کام ہوا اُس کا بڑا حصّہ اُن ہی کی سعی و عمل کا رہین منت ہے۔ اُن کے اچانک فوت ہو جانے سے ادارہ کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور باوجودیکہ اُن کی رحلت کو تین سال ہو چکے ہیں لیکن نہ ابھی تک اُن کی جگہ پُر ہو سکی نہ آئندہ پُر ہونے کی امید ہے۔ اراکینِ ادارہ نے اُن کے انتقال کے فوراً بعد سے ہی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے اِس محسن کو اُن کی خدماتِ جلیلہ، فضائلِ علمی اور خصائلِ پسندیدہ کے اعتراف کے طور پر اُن کے مدّاحین و مخلصین کی نگارشات و تاثرات کا ایک مجموعہ بہ طور ہدیہ کتابی شکل میں پیش کریں گے۔ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن اوّل تو مواد کے جمع کرنے میں کافی وقت لگا۔ پھر کتابت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ ہم چاہتے تھے کہ تمام کتابت ہمارے مخلص دوست محمد ذکی دہلوی

ہی کریں تاکہ سوادِ خط یکساں رہے لیکن اُن کی مسلسل علالت کی وجہ سے دیر ہوتی رہی۔ مجبوراً ہمیں اپنی خواہش کو ترک کر کے ایک اور اچھے خوش نویس جناب کوثر صاحب کی امداد حاصل کرنی پڑی۔ اس تدبیر سے کام مکمل ہوا اور ہم کتاب کو طباعت کی منزل سے گزار کر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے۔ خط کے بدل جانے کا ہمیں بے حد افسوس ہے لیکن ہم بہ امرِ مجبوری اس چیز کو گوارا کر رہے ہیں۔ ہم ان تمام مخلصین و محبین کے ممنونِ کرم ہیں جن کے تاثرات اس مجموعے میں شامل ہیں۔ نیز عبدالمجید صاحب کا جنھوں نے سرورق کے لئے ڈیزائین تیار کیا اور ذکی صاحب اور کوثر صاحب کا بصمیمِ قلب شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آخر میں ہم اپنے مرحوم ساتھی اور محسن کی خدمت میں یہ ہدیۂ خلوص و عقیدت پیش کر کے بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ ان کو آخرت کی نعمتوں سے نوازے اور ان کی روح کو ابدی راحت نصیب کرے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

شمس الدین احمد حنفی

ثناء الحق صدیقی

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

ڈاکٹر ایوب قادری نے یوپی کے علاقے روہیل کھنڈ کے مشہور تاریخی قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں جولائی ۱۹۲۶ میں زندگی کا پہلا سانس لیا۔

ڈاکٹر ایوب قادری نے اسی قصبے کے مکتب مدرسہ تعلیم المومنین میں پرائمری کا امتحان پاس کیا اور وظیفے کے مستحق ٹھہرے۔ پھر اسی قصبے کے اڈورڈ اسکول سے مڈل کا امتحان نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کرنے کے بعد ضلع بدایون کے قصبہ اوجھیانی کے این ایم ہائی اسکول سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران اپنی پھوپھی (جولاولد تھیں) کے پاس بدایون میں قیام کیا۔ بدایون میں ننھال تھا۔ چنانچہ حافظ صدیق اسلامیہ کالج سے ۱۹۵۰ء میں انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد پاکستان کے لیے ہجرت کی اور اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان پہنچ گئے۔ چند ماہ دادو میں قیام کے بعد کراچی آئے اور وزارت صنعت کے دفتر سپلائی اینڈ ڈیولپمنٹ میں ملازمت اختیار کی۔ اس زمانے میں وہاں محشر بدایونی بھی ملازم تھے۔ ملازمت کے دوران ۱۹۵۳ء میں اردو کالج کی شام کی کلاسوں میں بی اے میں داخلہ لیا جہاں ملازمت کرنے والے افراد کے لیے خصوصی طور پر شام میں بی اے کا تین سالہ کورس شروع کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی پیش کش اپنے ذوق کی خاطر لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت

اختیار کی۔ جامعہ کراچی سے ۱۹۶۲ء میں ایم اے اردو کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اول بدرجۂ دوم پاس کیا اسی دوران ۹ جنوری ۱۹۶۲ء سے ۴ مارچ ۱۹۶۳ء تک اردو کالج میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں جبکہ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے اردو کالج میں باقاعدہ طور پر ملازمت اختیار کی اور آج کل بھی اردو (آرٹس) کالج میں صدر شعبۂ اردو ہونے کے علاوہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی زندگی میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں آنولہ سے ہندی کا امتحان بہ حیثیت فرسٹ لینگویج کے پاس کیا جس میں تحریر و تقریر دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد محترم مولوی مشیت اللہ قادری سے حاصل کی جبکہ مولوی اسد علی خاں مرحوم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا جو بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر التوا کا شکار رہا۔ لیکن اس دوران ڈاکٹر صاحب کی بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور بالآخر پی ایچ ڈی کے مقالے بہ عنوان "اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ۔ شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک" کو ۱۹۷۹ء میں پیش کر کے ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کے بارے میں ان کے ایک ممتحن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی رائے ہے کہ یہ مقالہ پی ایچ ڈی سے بڑھ کر ڈی لِٹ کی ڈگری کے لیے بہتر ہے۔

ڈاکٹر ایوب قادری کی تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں :

تالیفات

۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی، کراچی ۱۹۵۷ء

۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، کراچی ۱۹۶۳ء

۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی، کراچی ۱۹۶۶ء

۴- اربابِ فضل و کمال (یادگار ریلی) کراچی ۱۹۷۰ء

۵- تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ، کراچی ۱۹۷۱ء

۶- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) کراچی ۱۹۷۶ء

تراجم

۱- تذکرۂ علمائے ہند (رحمان علی) کراچی ۱۹۶۱ء

۲- وقائع نصیر خانی (مرزا نصیر الدین) کراچی ۱۹۶۱ء

۳- مجموعہ وصایا اربعہ (شاہ ولی اللہ وغیرہ) حیدر آباد ۱۹۶۴ء

۴- مآثر الامراء (صمصام الدولہ شاہنواز خاں) تین جلدیں لاہور ۱۹۶۸ء-۱۹۷۰ء

۵- فرحت الناظرین (محمد اسلم انصاری) کراچی ۱۹۷۲ء

۶- سیر العارفین (جمالی) لاہور ۱۹۷۶ء

ترتیب و حواشی

۱- علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی) دو جلدیں، کراچی ۱۹۶۰ء

۲- تواریخ عجیب (کالا پانی) (محمد جعفر تھانیسری) کراچی ۱۹۶۲ء

۳- عہدِ بنگش کی سیاسی علمی و ثقافتی تاریخ (تاریخ فرخ آباد) مولف مولوی فرحت اللہ فرخ آبادی، کراچی ۱۹۶۵ء

۴- مقالاتِ یوم عالمگیر، کراچی ۱۹۶۶ء

۵- تذکرہ نوری (مفصل حالات و سوانح حضرت شاہ عبد الحسین نوری مارہروی) لائیلپور ۱۹۶۸ء

۶- مرقعِ شہابی (حالات مفتی انتظام اللہ شہابی) کراچی ۱۹۷۹ء

۷- جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور (خلیفہ محمد معظم عباسی ۱۷۹۴ء) کراچی ۱۹۸۰ء

مشترکہ مصنف :-

۱۔ خط و خطاطی، کراچی ۱۹۶۱ء

۲۔ علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، کراچی ۱۹۷۰ء

۳۔ نقوشِ سیرت، کراچی ۱۹۷۷ء

اس کے علاوہ ڈاکٹر ایوب قادری نے تقریباً تیس کتب کے مقدمات تحریر کئے اور ان کے تقریباً دو سو قابلِ قدر مضامین برصغیر پاک و ہند کے ممتاز علمی و تحقیقی رسائل و جرائد کی زینت بنے۔

ح و :۔ ڈاکٹر صاحب، آپ کے ادبی ذوق کی ابتدا کس ماحول کی مرہونِ منت ہے؟

اق :۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کرنا چاہونگا کہ جس کی وجہِ شہرت باوجود حافظِ قرآن ہونے کے دروغ گوئی تھی۔ یعنی آنولہ میں میرے پڑوس میں حافظ سعادت اللہ صاحب رہا کرتے تھے۔ لوگ سوائے قرآن مجید کے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ محض زیب داستان کے لیے چونکا دینے والا انداز اختیار کرتے ہوئے انتہائی مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ میں نے ان کی تمام باتوں کا تجزیہ کیا کہ اگر لوگوں سے کوئی بات بھی کہیں تو اس کا ماخذ قریب تر اور ہم عصر دلائل کے ساتھ ہونا چاہیئے اور محض زیبِ داستان کے لیئے نمک مرچ لگا کر مبالغہ کے ساتھ پیش نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بات میں توازن ہونا چاہیئے ورنہ لوگوں کی نظر میں وقعت نہیں رہتی۔ مجھے اس بات نے بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ والدِ محترم کو تاریخ سے بھی ذوق تھا۔ چنانچہ ان کی تربیت نے تاریخ سے بھی ذوق پیدا کیا۔ اساتذہ میں ہمارے ہائی اسکول کے استاد وصی احمد، جو کہ فارسی کے بھی استاد تھے جن کا بہت اعلیٰ ادبی ذوق تھا یا ہندی کے استاد پنڈت بہاری لعل جنھیں اسلامی تاریخ و مذہب سے بڑی واقفیت تھی اور فارسی و اردو کا بڑا ذوق رکھتے تھے، ان دونوں اساتذہ نے میری ابتدائی تربیت میں

اہم کردار ادا کیا جبکہ کراچی میں میرے اساتذہ میں پروفیسر حبیب اللہ غضنفر صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے مجھے متاثر کیا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور بہت فیض حاصل کیا اور یہ سب انہی بزرگوں کی خصوصی توجہ اور صحبت کا نتیجہ ہے جس کے سبب علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا شبلی کی تحریروں سے بھی اثر قبول کیا۔

ح و :۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا مضمون کب اور کس موضوع پر تخلیق کیا۔ اور وہ کہاں شائع ہوا؟

ا ق :۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا مضمون "افتراق المسلمین" کے نام سے لکھا جس میں مسلمانوں کے نسلی اور مذہبی افتراق کو پیش کیا تھا اور یہ مضمون علیگڑھ میں طلبہ کے ایک پرچے "صبحِ نو" میں غالباً ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ جہاں سے اس مضمون کو دوسرے پرچوں اور اخبارات نے نقل کیا۔ اور یہ کئی جگہ شائع ہوا۔ "صبحِ نو" تو غالباً سال چھ ماہ بعد بند ہو گیا مگر یہ مضمون بعد میں بھی کئی جگہ چھپا۔ کتابی شکل میں میری سب سے پہلی کاوش مئی ۱۹۵۷ء میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی کے عنوان سے شائع ہوئی۔

ح د :۔ ڈاکٹر صاحب آپ بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی ہیں۔ کیا آپ موجودہ تحقیقی و تخلیقی معیار سے مطمئن ہیں؟

اق :۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل جو تحقیقی چیزیں سامنے آ رہی ہیں، ان کا جو معیار ہونا چاہیئے وہ نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل عربی اور فارسی سے نابلد ہے اور تحقیق میں جتنی محنت کی جانی چاہیئے وہ اس سے جی چراتی ہے جبکہ تحقیق کے لئے بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ مطلوبہ مواد اکثر غیر متعلق جگہ ملتا ہے لہذا جانکاہی، محنت، اپنے موضوع سے مناسبت، متعلقہ مواد اور کتابوں تک دسترس۔ جب یہ تمام چیزیں

میسّر ہوں تو تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ تحقیق کے لئے عصر اور زمانے کو دیکھنا پڑتا ہے۔ صحیح معلومات کے لئے بہت سی باتوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ایک صحیح بات کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی تحقیق کے لئے جس صبر و تحمل اور محنت کی ضرورت ہے اس سے ہماری نسل جی چرانی ہے اور ہر کام منٹوں اور سیکنڈوں میں کرنا چاہتی ہے جس کے سبب تحقیق کا معیار بھی گر رہا ہے تخلیقات کا معیار اس لئے بلند نہیں کہ نئی نسل مطالعہ پر کامل توجہ نہیں کرتی اور اچھی تخلیق کے لئے کامل مطالعہ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معیار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ح د :۔ ڈاکٹر صاحب، آپ نے بہت سی اہم کتابوں کے تراجم کئے، تحقیق پر توجہ دی، کیا ان قدیم کتب میں آپ کو کسی ایسی ادبی تحریک یا محرکات کی جھلک نظر آئی جو آج کے دور سے مطابقت رکھتی ہو؟

اق :۔ میں نے جو تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس میں کوئی ادبی تحریک نظر نہیں آتی کیونکہ اس زمانے میں مذہب کی بالادستی اور معاشرہ مذہب پر محیط تھا اس لئے کوئی ادبی تحریک تو نظر نہیں آئی البتہ ادبی انداز اور اسٹائل ضرور ملتا ہے۔ مثلاً ابو الفضل کا اندازِ تحریر مشکل پسندی، غرابتِ الفاظ، مشکل لغات اور اصطلاحات نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کا تتبع کیا ہے۔ اسے ابو الفضل کا انداز کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے وہ انداز اپنایا جبکہ وہ چیز سامنے نہیں آئی جسے کسی خاص تحریک یا اس کے محرکات کہا جائے۔

ح د :۔ آپ کی تالیفات کا موضوع کیا ہے اور اس کی ضرورت آپ کو کیوں محسوس ہوئی؟

اق : میرے تالیفی کام کا مقصد صوفیائے کرام اور علمائے کرام کی تعمیری کوششوں کا ذکر اور مسلمانوں خصوصاً مغلوں کے تہذیبی، ثقافتی علمی پس منظر کو اجاگر کرنا اور تحریک آزادی میں عوام نے جو موثر کردار ادا کیا ہے اسے پیش کرنا ہے میرا ترجمہ "ماثر الامراء" جو تین ضخیم

جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مغلیہ حکومت کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور جنگی زندگی کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں اور یہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک حصّہ ہے جس سے ہماری نئی نسل کا واقف ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کرتیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا دیں۔

ح و:۔ ڈاکٹر صاحب! عصری ادب کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

اق:۔ اگر عصری ادب سے آپ کی مراد یہاں موجودہ ادب سے ہے تو اس کے متعلق جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ موجودہ ادب کا معیار غیر تسلی بخش ہے اور موجودہ دور میں جو چیزیں جدید ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہیں، مثلاً آزاد شاعری یا نثری شاعری کا جسے نام دیا جا رہا ہے، ہمارے علمی، ادبی اور ثقافتی پس منظر سے مطابقت نہیں رکھتیں اور وہ افسانے یا ناول جو کسی خاص اشتراکی نظریئے کے تحت تحریر کیئے جائیں یا جن میں فحاشی یا عریانیت کا پرچار کیا جائے میرے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ انہی وجوہات سے ہمارا ادب انحطاط کی طرف مائل ہے۔ اور اس وقت جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ غیر تسلی بخش ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہمیں بہت اچھی تخلیقات بھی ملتی ہیں مگر مجموعی طور پر ایسا کم ہوتا ہے اور اگر اچھے ادب کا تناسب کم ہو تو ہم مجموعی طور پر ادب کے معیار کو بہتر نہیں کہہ سکتے۔

ح و:۔ ڈاکٹر صاحب، مختلف حضرات ادب میں آفاقیت کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں، آپ کے نزدیک آفاقی ادب کی تعریف کیا ہے؟

اق:۔ آفاقی ادب سے مُراد ایسا ادب ہے جو تمام دنیا کے لئے قابلِ قبول ہو اور جس میں کسی خاص علاقے، فرقے اور مذہب یا تحریک کا پرچار نہ کیا گیا ہو۔ ادب سے مُراد خوبصورت باتوں کو خوبصورت انداز میں پیش کرنا جو فلاحِ انسانیت کا موجب بنیں۔

ح و:۔ ڈاکٹر صاحب ادب کی اس تعریف کی روشنی میں اردو ادب میں اسلامی ادب یا پاکستانی ادب کی گنجائش کس حد تک ہے۔ اور کیا اس سے ادب کی آفاقیت

مجروح ہوتی ہے؟

ا ق :- جی نہیں، اسلامی ادب یا پاکستانی ادب سے ادب کی کوئی آفاقی قدر متاثر نہیں ہوتی کیوں کہ ادب کی آفاقی اقدار تو مذہبی اقدار سے مطابقت رکھتی ہیں کیونکہ مذہب کا کام بھی فلاحِ انسانیت ہے اور ادب کی آفاقی اقدار کا بھی۔ لیکن پہچان کے لئے جس طرح چیزوں کے یا انسانوں کے نام رکھ دئے جاتے ہیں اسی طرح پاکستانی قوم یا پاکستان کے حوالے سے پاکستان کے تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی تحریروں کو ہم اگر پاکستانی ادب کا نام دیتے ہیں یا اسلام کی اقدار کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریروں کو ہم اسلامی ادب کا نام دیتے ہیں تو یہ ادب کی آفاقیت مجروح کرنے کا باعث نہیں بلکہ آفاقی ادب میں تحدید ہے جو ملک و قوم اور مذہب کے تشخص کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ادب کی کوئی آفاقی قدر متاثر یا مجروح نہیں ہوتی اور اس سلسلے میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادب کو صرف ادب ہونا چاہیئے، اسلامی ادب یا پاکستانی ادب کی چھاپ نہیں لگانی چاہیئے۔ تو ان کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ ترقی پسند ادب، رومانوی ادب، کلاسیکی ادب، جدید ادب؛ یہ ادب پر چھاپ نہیں ہے یا اگر یہ ایک خاص قسم کے ادب کا تشخص ہے تو پاکستانی ادب اور اسلامی ادب بھی ایک خاص پس منظر میں اپنے تشخص کے مظہر ہیں۔

میں اپنے مخصوص موضوع کے اعتبار سے یہ بتا تا چلوں کہ علماء کے مذہبی رسائل کلکتہ سے پشاور تک اور دلی سے مدراس تک اردو کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ تھے۔ گویا یہ ہمارے ادبی نظریات اور تبلیغ کا بھی ذریعہ بنے۔ میں ایبٹ آباد کے قریب ایک مقام دھمتوڑ جہاں حکیم ابو الفتح گیلانی کا انتقال ہوا، وہاں ایک صاحب کے یہاں گیا۔ ان کے پاس میں نے دلی کی مطبوعات ۱۸۵۷ء سے قبل اور لبعد کے رسالے اردو کے دیکھے جن کے ذریعے سے وہاں کے لوگ اردو زبان و ادب سے آشنا ہوئے اور ادبی و مذہبی رسالے اردو زبان کے فروغ کا ذریعہ بنے

ع و :- اسلامی ادب کے فروغ کے لئے ہمیں کن باتوں پہ نظر رکھنا ضروری ہے؟

اق :۔ وہ ادب جس میں اسلام کے آفاقی نظریات کی تبلیغ ہو۔ وہ اسلامی ادب ہے۔ اسلامی ادب میں اسلام کی اعلیٰ اقدار کے علاوہ کسی خاص فرقے یا گروہی عقائد کی تبلیغ مقصود نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنی . . . . . .

اسلام نے فلاحِ انسانیت کے لیئے جو چیزیں پیش کی ہیں وہ تو ہوں مگر اس کی آڑ میں کسی خاص فرقے یا عقائد کو پیش کرنے سے ادب کی اقدار مجروح ہوں گی۔ اسلامی ادب کے فروغ میں ذرائع ابلاغ ہی موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آج کل کے ذرائع ابلاغ سے اسلامی ادب کے صحیح خدوخال کو صحیح سمت میں پیش کرنا چاہیئے۔ اور اسلام کی اعلیٰ اقدار اور ان کے حوالے سے وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کریں تو اسلامی ادب کے فروغ میں مدد ملے گی اور لوگوں کا رجحان اسلامی ادب کی طرف بڑھے گا۔

ح و :۔ ڈاکٹر صاحب ترقی پسند ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

اق :۔ وہ ادیب جو خود کو ترقی پسند کہتے تھے، منافقت کا شکار تھے اور ان کے قول و فعل میں تضاد تھا اور وہ خود اپنی تحریک کے لئے مخلص نہیں تھے بلکہ اپنے بیرونی آقاؤں کے نظریات کا پرچار ان کا مقصد تھا اسی لئے ان کی تحریک ناکام ہوگئی۔

ح و :۔ ادب میں فحاشی کا جو رجحان پیدا ہو رہا ہے اس کی وجوہات کیا ہیں ؟

اق :۔ فحش نگاری کو ادب یا علم کی کسی صنف میں بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جاسکتا اور ادب میں تو یہ سب سے زیادہ نامناسب بات ہے۔ ادب کو اخلاق اور انسانیت کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ نہ کہ جذبات کو بھڑکانے اور اخلاق کو بگاڑنے کا۔ اور جو لوگ اس قسم کا ادب تخلیق کرتے ہیں یا اس قسم کے ادب کی حمایت کرتے ہیں ان کا مقصد نوجوانوں کو متاثر کرنا اور سستی شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے بہ طور فیشن بھی استعمال کرتے ہیں۔

ح و :۔ ڈاکٹر صاحب جسارت میں فحش نگاری پر کچھ عرصہ قبل ایک گرما گرم بحث چھڑ چکی ہے۔ آپ کو یہ علم ہوگا کہ یہ گفتگو سلیم احمد صاحب کے حوالے سے ہوئی ہے جو عصمت چغتائی

کو لحاف اور منٹو کو بو جیسے افسانے لکھنے کی اجازت دینے کے حق میں ہیں کیا اس طرح فحش نگاری کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟

اق :- اگر سلیم احمد صاحب نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے تو اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ ان کی ہر بات مان لی جائے۔ میں ان کی یہ بات کیا، بہت سی باتوں سے اختلاف رکھتا ہوں اور ہر پڑھا لکھا اور ذی شعور آدمی یہ جانتا ہے کہ اگر وہ اسلامی اقدار کا حامی ہو اور فحش نگاری کی حوصلہ افزائی بے جا تاویلوں سے کرے تو یہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے والی بات ہے۔ اور اگر میں بھی ایسا کروں گا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجھ میں ذہنی عدم توازن ہے اور اگر میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے ناراض نہ ہو تو ؎

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

سلیم احمد نے جو کچھ کہا مجھے تعجب ہے کہ یہ بات انھوں نے کیسے کہہ دی۔ آپ کے سوال کے جواب میں اتنا تو میں نے عرض کر دیا ورنہ میں نے تو سلیم احمد صاحب کی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی اکثر تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک عامیانہ انداز ہے جسے اکثر لوگ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ جس ملک و قوم کے شاعر یا ادیب فحاشی یا فحش نگاری کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں۔ خصوصاً اس قوم کے نوجوان کے اخلاق کا کیا عالم ہوگا۔ اور ایسے بے ضمیر لوگ جو اپنی تہذیبی اسلامی ثقافتی اقدار کو پسِ پشت ڈال کر کسی ایسے کمزور سہاروں اور حمایتیوں کو تلاش کریں جو انھیں لذت سے آشنا کرے۔ یا اخلاقی اقدار سے ان کی جان چھڑائے، سلیم احمد جیسے حمایتیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور سلیم صاحب نے فحاشی کی جس انداز میں حمایت کی ہے اس سے بے ضمیر اور کمزور عقیدہ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ جبکہ ایک اچھے ادیب اور شاعر کا مقصد نوجوانوں کے اخلاق کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ اور ادیب کا فرض ہے کہ وہ جو بات بھی کہے نہایت سوچ سمجھ کر کہے کیونکہ کسی بھی ادیب کی تحریروں سے ایک بڑا طبقہ متاثر ہو سکتا ہے، خواہ وہ مثبت انداز ہو یا منفی۔ (انٹرویو)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے میری دیرینہ ملاقات تھی، جب جب کراچی جانے کا موقع ملا، وہ بہت ہی عزیزانہ طور پر ملے، ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ اپنی کھلمنساہت شرافت طبع، عجز اور انکسار کا ثبوت دیتے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوتے، جیسا کہ حسب ذیل مضمون سے ظاہر ہوگا، ان کے قلم میں بڑی برق وشی تھی، کسی کتاب کو دیکھنا یا ترجمہ کرنا شروع کرتے تو بڑی کم مدت میں یہ کام ختم کر دیتے، وہ جس بلند مرتبہ کے مصنف تھے، اپنے عجز و انکسار کی بدولت اس سے اپنے کو کم ہی ظاہر کرتے، وہ اپنی ہر کتاب دارالمصنفین ضرور بھیجتے اس کو یہ راقم شوق سے پڑھتا، جب انہوں نے کراچی کے قیام میں شاہنواز خاں کی تصنیف مآثر الامراء کی تین جلدوں کے ترجمے ہدیہ کئے تو یہ تینوں جلدیں میری میز پر رہیں اور جب کبھی ان میں سے کسی اقتباس کو اصل فارسی سے ملایا، تو ان کو ہر طرح صحیح، سلیس اور فصیح پایا اس سے ترجمہ کرنے میں ان کی مہارت

اور قدرت کا معترف ہوا، جب وہ طبقاتِ اکبری کا ترجمہ کر رہے تھے تو ان سے یہ
گفتگو ہوئی کہ اکبر نامہ کا ترجمہ ایک انگریز نے انگریزی میں کر دیا ہے، لیکن یہ بڑی
ندامت اور شرم کی بات ہے کہ اب تک اس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکا، گو یہ
بہت مشکل کام ہے، لیکن جب اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو سکتا ہے، تو کوئی وجہ
نہیں کہ اردو میں نہ ہو سکے، جناب ایوب قادری نے کہا کہ طبقاتِ اکبری کے ترجمہ
کے بعد انشاء اللہ اکبر نامہ کی جلدوں کا ترجمہ کر کے لوگوں کی ندامت کو دُور کر دوں گا
اس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی، گزشتہ نومبر میں میرے قیام کراچی ہی میں اُن
کی المناک وفات ہوئی، وفات سے ایک روز پہلے ان کا ٹیلی فون آیا کہ ہم ان کے
ساتھ رات کو کھانا کھائیں، جس روز یہ دعوت طے تھی، اسی روز خبر ملی کہ وہ اللہ
کو پیارے ہوئے، اس عظیم سانحہ سے بڑا دکھ ہوا، پاکستان کے تمام اخباروں
میں ان کا بڑا ماتم ہوا، تمام مشاہیر کے تعزیتی بیانات شائع ہوئے، ان پر اخباروں
میں اچھے اچھے مضامین بھی لکھے گئے، جس سے پتہ چلا کہ وہ اپنے علمی رتبہ کی وجہ
سے وہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان سے جو علمی تعلقات
تھے اس بنا پر برابر یہ خیال رہا کہ ان پر ایک طویل مضمون لکھوں لیکن اپنی
مشغولیت کی وجہ سے یہ حق ادا نہ کر سکا، جس کا بڑا افسوس ہے، لیکن وہ
برابر یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے رہیں گے، ان کے چھوٹے بھائی جناب
نعمت اللہ قادری عرف ابومعاویہ صاحب کو بھی دار المصنفین سے بڑا لگاؤ
رہا، انہوں نے تو اس کی زیارت کرنے کے لئے یہاں آنے کی زحمت بھی گوارا
کی، وہ اس کی مطبوعات کے بڑے قدردان تھے، اور ان کی اشاعت کے لئے
برابر فکر مند رہتے، ان کی وفات بھی سڑک ہی پر ہوئی، ایک بس کے حادثہ
میں وہ جان بحق ہوئے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو

اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے، آمین! "ص۔ع"

ہند و پاک میں مستند علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اور اس قلیل تعداد میں بھی ہر ایک عالم اور محقق پر تکیہ نہیں کر سکتے، بلکہ ان میں بھی بعض اعلیٰ اور بعض اعلیٰ تر ہیں۔ انہی ہستیوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا بھی ہے، جو ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء سے مرحوم کے اضافہ کے ساتھ لکھا اور بولا جانے لگا ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق، مؤلف اور مترجم کی حیثیت سے متعارف ہے، انہوں نے بعض ایسے علمی موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو اربابِ علم نظر انداز کئے ہوئے تھے اور بعض ایسی کتابوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا جو نادر و کمیاب تھیں۔

قادری مرحوم کا موضوع تاریخ، سوانح، ادب، فن اسماء الرجال اور حوالہ جاتی ادب تھا، اس میں وہ شبلی اسکول سے بڑی حد تک قریب نظر آتے ہیں، ان موضوعات کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، ان پر وہی قلم اٹھائے گا جس نے خود کو علم و ادب کے لئے وقف کر دیا ہو، یا تلاش و جستجو جس کا مزاج ہو اور جس کی زندگی کا مقصد و مدعا بھی محض علم و ادب کی خدمت ہو، مشفق خواجہ لکھتے ہیں :-

"قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آجاتے ہیں، جنھوں نے ہر طرح کی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر خدمتِ علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا، قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً

چھبیس برسوں سے ہے، میں نے اس دوران میں انہیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی کام کی لگن میں سرشار ملے، کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے، تو کبھی کسی مخطوطے کا، کبھی گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے تو کبھی کسی معروف مصنف کے کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جا رہی ہے، خدا انہیں تادیر سلامت رکھے کہ ان سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ ان "دیوانوں" سے ابھی خالی نہیں ہوا، جو ہمیشہ "بکارِ علم" ہشیار رہتے ہیں"۔ (مشفق خواجہ، دیباچہ، کاروانِ رفتہ، کراچی ۱۹۸۳ء)۔

قادری مرحوم کے موضوعات تحقیق یوں تو بہت کچھ تھے لیکن انھوں نے بحیثیت کیفیت و کمیت "حوالہ جاتی ادب" اور علمائے ہند و پاک کے مستند سوانح، مسلم تاریخوں اور علماء کی مستند مگر غیر معروف کتابوں پر جس انداز سے دادِ تحقیق دی ہے، وہ ان کے خاص موضوعات کہے جا سکتے ہیں، اس ضمن میں انہوں نے کثیر سرمایہ چھوڑا ہے۔

قصبہ آنولہ ضلع بریلی کا ایک تاریخی قصبہ ہے، بجز قنوج کے اس کی تاریخی قدامت کی ہمسری اتر پردیش کا کوئی شہر نہیں کر سکتا، یہ حکومت روہیلہ کا پہلا دار الحکومت تھا، اور اس حکومت کے پہلے فرمانروا نواب علی محمد خاں (ف ۱۷۴۹ء) تھے ان کی وفات کے بعد حافظ رحمت خاں ان کے جانشین ہوئے، جنہوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی، نواب علی محمد خاں اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ابتدائی عہد میں روہیل کھنڈ

کا صدر مقام آنولہ ہی رہا اور اس دور میں یہاں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ مولوی حکیم عبد الغفور لکھتے ہیں :۔

"روہیلوں کے زمانے میں شہر آنولہ علماء، فضلاء، شعراء، اور اہل اللہ کا مرکز بن گیا، نواب علی محمد خاں کے فرزند نواب محمد یار خاں امیر کے دربار سے قدرت اللہ شوق، مصحفی، قائم چاندپوری اور فدوی لاہوری، جیسے مشاہیر شعراء وابستہ تھے۔ مصحفی نے آنولہ کی یاد بڑی دردمندی سے کی ہے، چنانچہ وہ اپنے تذکرے "ہندی گویاں" میں قائم کے ذکر میں لکھتے ہیں" واللہ کہ یاد آں صحبت داغ ناکامی بر دل دردمندمی گزارد۔[1]

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں :۔

آنولہ نواب محمد علی خاں کے عہد میں دارالاسلام تھا، اور نواب ممدوح نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی آبادی میں ترقی دی تھی، قلعہ اور مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔ آنولہ کی دینداری پر بلاد اسلام کو رشک تھا۔"[2]

حافظ رحمت خاں کے بریلی منتقل ہونے اور اس کے شجاع الدولہ کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہونے پر بھی اس کی رونق اور عظمتِ رفتہ کے کچھ نقوش نصف صدی تک قائم رہے، جن کی طرف ڈبلیو فرنیکلن نے "ہسٹری آف شاہ عالم" میں اشارہ کیا ہے۔

---

[1] سوانحات المتاخرین آنولہ ص ۱۲ (قلمی مملوکہ راقم الحروف) مولف حکیم عبد الغفور (مرحوم)

[2] اخبار الصنادید بحوالہ سوانحات المتاخرین آنولہ۔

یہی وہ تاریخی قصبہ ہے جو ایوب قادری کا آبائی وطن تھا، ان کے مورثِ اعلیٰ روہیلوں کے عہد میں آنولہ آئے، نواب علی محمد خاں والیِ روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نوری غازیؒ کی زیارت کے بعد جو بڑی اراضی وقف کی تھی اس کے متولی حکیم احمد اللہ تھے جو اپنے دور کے نامور عالم اور خطیب تھے، ان کے صاحبزادے حکیم حبیب اللہ تھے، جو علم و فضل میں ممتاز تھے، ان کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری تھے جو علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، معارف المیراث، کاشف الحقائق، تفسیر سورہ والعصر ان سے یادگار ہیں، انہوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے، ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ [1]

حکیم عظیم اللہ قادری کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش، حکیم سعید اللہ، میاں وحید اللہ اور حافظ امام الدین تھے، حکیم سعید اللہ ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں وفات پائی، خاندانی پیشہ طبابت تھا، ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خان کی فوج میں بھرتی ہوکر ککرالہ ضلع بدایوں اور کنپلہ فرخ آباد میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا، انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور بعض کتابوں پر قیمتی حواشی بھی لکھے ہیں[2]، حکیم سعید اللہ کے ایک فرزند مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۲۰ء) تھے جنہیں فنِ خطاطی میں کمال حاصل تھا، ابنِ عربی کا خاص مطالعہ کیا تھا، عربی ادب پر بھی گہری نظر تھی ان کے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۵۹ء) تھے اور یہ قادری مرحوم کے والد ماجد تھے۔

---

[1] و [2] سوانحات المتاخرین آنولہ صفحات: ۴۶، ۴۷ اور ۴۸

فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی، تاریخ اور انساب پر بڑی گہری نظر تھی۔[۱]
ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"تبلیغ دین اور مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی، مختلف مقامات خصوصاً بمبئی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران قیام میں مناظرے کئے تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے، اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان کیا، تحریک پاکستان کے زبردست مؤید تھے، ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے، دادو (سندھ) میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا، تاریخ انساب اور ردّ آریہ اور ردّ شیعہ میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں، پروفیسر قادری کے علاوہ عبدالقیوم عنایت اللہ اور نعمت اللہ ان کے فرزند ہیں"[۲]

اس خاندانی تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قادری مرحوم کا خاندان شروع سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، تاریخ، انساب اور علوم دینیہ سے دلچسپی اس کا نمایاں وصف رہا ہے اور قادری مرحوم کو یہ چیزیں علمی وراثت میں ملیں۔

محمد ایوب نام، قادری نام کا جزو ہے، ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ بروز بدھ قصبہ آنولہ میں پیدا ہوئے، قصبہ کے ایک بزرگ مولوی حکیم عبدالغفور (ف ۱۹۶۴ء) نے ان کے کان میں اذان دی اور "چراغ علم" سے تاریخ پیدائش نکالی، اور رواج کے مطابق ابتداءً قرآن مجید حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے پڑھا، پھر مدرسہ تعلیم المومنین آنولہ میں مکتبی تعلیم

---

[۱] سوانحات المتاخرین ص ۵۰۔ ۴۹ [۲] ڈاکٹر معین الدین تعارف غالب اور عصر غالب کراچی ۱۹۸۲ء

پائی ۱۹۳۹ء میں پرائمری کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے اور وظیفہ کے مستحق قرار پائے، ۱۹۴۲ء میں مڈل کے امتحان میں بھی درجۂ اول میں کامیاب ہوئے، ۱۹۴۷ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، اسی دوران میں انھوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، فارسی کی کچھ کتابیں مولوی اسد علی خاں اور حکیم عبد الغفور سے پڑھیں، ۱۹۵۰ء میں انٹر اسلامیہ کالج بدایوں سے کیا، اواخر اپریل ۱۹۵۱ء میں ان کے والد ماجد نے پاکستان کو ہجرت کی، قادری مرحوم سے والد کی جدائی برداشت نہ ہوئی چنانچہ وہ بھی مئی ۱۹۵۱ء میں پاکستان پہنچے، ابتداءً والد کے ساتھ دادو (سندھ) میں ہی قیام کیا، تلاشِ روزگار میں کراچی پہنچے اور پھر تادم زندگی وہیں کے ہو رہے۔

ستمبر ۱۹۵۱ء سے سپلائی اینڈ ڈولپمنٹ (وزارتِ صنعت محکمۂ رسد و ترقیات) سے ملازمت کا آغاز کیا، جو مئی ۱۹۵۷ء تک قائم رہی، اس دوران میں تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا، ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی۔ اے کیا۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نے ہندوستان سے ہجرت کرکے کراچی میں سکونت اختیار کی اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" بھی جاری کیا، اسی دوران میں سید صاحب کی ملاقات قادری مرحوم سے ہوئی، انھوں نے اُن کے جوہر ذاتی کو پرکھ لیا، "العلم" کے لئے ان سے کثرت سے مضامین لکھوائے اور شائع کئے، ۱۹۵۷ء میں قادری مرحوم کی پہلی تصنیف "مولانا فیض احمد بدایونی"

شائع ہوئی جو اگرچہ بہت مختصر تھی، لیکن اس سے ان کی تحقیقی و تصنیفی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا، ہسٹاریکل سوسائٹی کے معتمد ڈاکٹر معین الحق نے اپنے ادارہ میں معاون تحقیق اور ریسرچ افسر کی حیثیت سے بلا لیا، ملازمت کا یہ سلسلہ مئی ۵۵ء سے ۶۳ء تک قائم رہا، پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر کے مشورہ پر جن کا ساتھ ہسٹاریکل سوسائٹی میں رہا تھا، انہوں نے ۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ایم۔ اے کی ڈگری سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کو اردو کالج میں جز وقتی لکچرار کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، ستمبر ۶۲ء سے ۴ مارچ ۶۳ء تک انہوں نے اس طرح تدریسی خدمت انجام دی، ۵ مارچ ۶۳ء سے اسی کالج میں مستقل لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے کچھ دنوں بعد صدر شعبہ کے منصب پر فائز کر دیئے گئے، ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:-

"اس عرصہ میں انہوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۵ء میں اردو کالج کی جانب سے "ہلال اردو تمغہ" کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۷۶ء میں "اکیڈمک ایوارڈ میڈل" اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے، اسی سال قائد اعظم کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے "تمغہ قائد اعظم" حاصل کئے، پھر اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی، تاریخی اور ادبی کانفرسوں میں بھی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔"[1]

۱۹۸۰ء میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو میں پی۔ ایچ ڈی کیا،

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ تعارف غالب اور عصر غالب (کراچی ۱۹۸۲ء)

ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) تھا۔

افسوس ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو ایک کار ایکسیڈنٹ میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، قادری مرحوم بحیثیت انسان بڑی خوبیوں کے مالک تھے، سادہ مزاج تھے اور نام و نمود سے بے نیاز، صاف دل اور صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مخلص بھی تھے، مصلحت کوشی، زمانہ سازی اور مذہب بیزاری سے کوسوں دور علماء کی عزت اور اہلِ فن کی قدر کرنا ان کا شعار تھا، یہی وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں ان کا احترام پیدا کر دیا تھا بقولِ شاعر ؎

صرف باتوں سے تو ہوتی نہیں عزت دل میں ٭ آنکھ کچھ دیکھتی ہے تب وہ ادب کرتی ہے

قادری مرحوم نے تصنیفات و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی ایک بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔

تصانیف

۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی: مولانا فیض احمد رسوا ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں تھے، انہوں نے قوت سیف و قلم دونوں سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، کبھی وہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرتے نظر آتے، اور کبھی بہادر شاہ ظفر کی عدالت کے حاکم، کبھی انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے، کبھی شعر و ادب سے شغل کرتے،

غرض ان کی خدمات گوناگوں تھیں، قادری مرحوم نے اس کتاب میں ان کی متنوع شخصیت اور گوناگوں خدمات کا تعارف تاریخ و تحقیق کی روشنی میں کرایا ہے، یہ کتاب پاک اکیڈمی کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ مخدوم جہانیاں گشت: یہ کتاب تحقیقی انداز پر ترتیب دی گئی ہے، حضرت مخدوم رح کو ایک مافوق الفطرت ہستی کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے

انہیں ایک عالمِ باعمل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے جسے ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا، اس ادارہ کی بنیاد مارچ ۱۹۶۲ء میں رکھی گئی تھی، ایوب قادری اس کے بنیادی رکن اور معتمد اعزازی تھے، اس ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب تھی۔

۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی: یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی،

۴۔ ارباب فضل و کمال بریلی: ۱۹۷۰ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

۵۔ تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ: ۱۵۲ صفحات پر مشتمل مکتبہ معاویہ کراچی سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی،

۶۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں: یہ کتاب قادری مرحوم کی وقیع کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، ۱۹۷۶ء میں پاک اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی،

۷۔ غالب اور عصر غالب:۔ یہ کتاب غالب سے متعلق نو تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، مضامین کے عنوانات یہ ہیں، نواب الٰہی بخش خاں کا غیر مطبوعہ کلام، غالب اور سر سید احمد خاں۔ غالب اور غیاث اللغات، غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ، غالب اور مارہرہ، غالب کے چند شاگرد، غالب اور روہیل کھنڈ، مطائباتِ غالب، قطعاتِ تاریخ انتقال، مزارِ غالب یہ مضامین غالبیات میں مفید اور وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان مضامین سے نہ صرف یہ کہ غالبیات بلکہ کلاسیکی ادب کی تاریخ و تہذیب کے چند نئے باب بھی وا ہوتے ہیں، تعارف ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے، ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

کاروانِ رفتہ :- چھبیس ۲۶ شخصی اور سوانحی مضامین پر مشتمل ہے، یہ مضامین مرحومین سے متعلق ہیں، جن میں علمی و ادبی اور مذہبی شخصیات شامل ہیں، ۱۹۸۳ء میں مکتبہ اسلوب کراچی سے شائع ہوئی، دیباچہ جناب مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔

ترجمے

۱۔ تذکرہ علمائے ہند: جناب مولانا رحمان علی صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ ۱۹۶۱ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا،

۲۔ مجموعۂ وصایا اربعہ: حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا،

۳۔ ماثر الامرا: صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی تصنیف کردہ تین جلدوں کا ترجمہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے بالترتیب ۱۹۶۸ء، ۶۹ء، ۷۰ء میں شائع ہوا، یہ ترجمے قادری مرحوم کی محنت و صلاحیت کے غماز ہیں، تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی طرف متوجہ ہونا اور پھر فارسی سے اردو کا جامہ پہنانا اُن ہی کا حصہ تھا۔

۴۔ فرحت الناظرین: محمد اسلم انصاری پسروری کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔

۵۔ سیر العارفین: شیخ فضل اللہ جمالی کی مشہور تصنیف ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

ترتیب و حواشی

حسب ذیل کتابوں کو مرتب کیا اور ان پر حواشی لکھے:-

۱۔ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ۲۔ جلد دوم (وقائع عبدالقادر خانی) ۳۔ تواریخ عجیب عرف کالاپانی (محمد جعفر تھانیسری)......

۴۔ عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (تاریخ فرخ آباد مؤلفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی) ۵۔ مقالات یوم عالمگیر ۶۔ تذکرۂ نوری (مفصل حالات ابوالحسن نوری مارہروی) ۷۔ مرقع شہابی (حالات مفتی انتظام اللہ شہابی) ۸۔ جنگ نامہ آصف الدولہ نواب رامپور (خلیفہ محمد معظم عباسی)۔

ان کاوشوں کے علاوہ بعض کتابوں میں وہ شریک مؤلف بھی رہے ہیں، اس قسم کی کتابوں میں "خط و خطاطی" "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" اور "نقوش سیرت" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اِن مستقل تصنیفات و تالیفات کے علاوہ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ علمی و تحقیقی مقالے لکھے، جو ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے، تقریباً تینتیس کتابوں پر مقدمے لکھے۔

علمی و ادبی صحافت میں ان کا دخل رہا، سہ ماہی "بصائر" (کراچی) کے اعزازی مدیر اور ماہنامہ "سرحد" کے نگراں رہے، اردو کالج کراچی کے مجلہ "برگِ گل" کے بھی ایک عرصہ تک نگراں رہے، ان کی نگرانی میں اس مجلہ کے کئی اہم نمبر شائع ہوئے، سرسید نمبر، تعلیمی پالیسی نمبر، قائد اعظم نمبر، محمد علی جوہر نمبر وغیرہ، "العلم" کراچی کا غالب نمبر بھی انہوں نے ترتیب دیا تھا، یہ تمام کاوشیں گو ماضی کا سرمایہ ہیں، لیکن مستقبل کے لئے یہ ایک ورثہ کے طور پر محفوظ رکھی جاسکتی ہیں۔

راقم الحروف کے ان سے بڑے تعلقات تھے، اکثر خط و کتابت رہتی تھی خطوط میں اپنی سرگرمیوں پر کبھی کبھی روشنی ڈال دیتے تھے چنانچہ ۱۹۸۱ء میں انھوں نے مجھے لکھا،

"مغلیہ عہد کے ایک مورخ نظام الدین احمد بخشی کی ضخیم کتاب "طبقات اکبری"

سے عنقریب فارغ ہوا ہوں، مرکزی اردو بورڈ اسے شائع کرے گا۔"

ایک اور خط میں تحریر کیا تھا کہ "غزنوی عہد کے ایک عربی نژاد" بجلیم پر ایک کتاب چل رہی ہے"۔ خدا کرے کہ یہ کتابیں بھی جلد شائع ہوں۔

قادری مرحوم نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ غالباً اشاعت کے لئے زندگی ہی میں کسی پبلشر کے سپرد کر دیا ہوگا، اس کا موضوع "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) تھا اس کے متعلق انہوں نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں بتایا کہ اردو نثر کی عام تاریخ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے، پھر اس کے بعد خطوطِ غالب کا ذکر آتا ہے جن کا آغاز ۱۸۵۰ء میں ہوا[1]، اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں نثر کا سلسلہ شروع ہوا، جس کو سر سید احمد خاں نے تقویت بخشی، فورٹ ولیم کالج اور غالب کے درمیانی دور میں اردو نثر میں کافی کام ہوا، اس دور میں دینی اور دنیوی تعلیم کی حدود آج کی طرح علیحدہ نہیں تھیں اس لئے علماء نے اس میدان میں خاصا کام کیا، اور علماء کی تصانیف نے اردو نثر کے دامن کو خاصا مالا مال کیا، مگر سوئے اتفاق کہ ادبی مورخین نے علماء کے کام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے فورٹ ولیم کالج سے ابتدا کرتے ہیں، اور پھر غالب سے جست لگا کر سر سید احمد خاں پر پہنچ جاتے ہیں، اور یوں اردو نثر کی عمارت کی تاریخ اس مثلث پر قائم ہے، اسی بنا پر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ علماء کی نثری تصانیف کا اس اعتبار سے جائزہ لینا چاہئے، چنانچہ میں نے اس موضوع پر مطالعہ کیا تو

---

[1] ۱۸۵۰ء غالباً سہو کاتب ہے کیونکہ یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ غالب کی خطوط نگاری کا آغاز ۱۸۴۷ء سے ہوتا ہے اور قادری مرحوم اس سے ناواقف نہ ہونگے واللہ اعلم،
شمس بدایونی

تو معلوم ہوا کہ علمار نے اردو نثر کے میدان میں انتہائی دقیق کارنامے انجام دیئے ہیں اور میرے خیال کے برعکس یہ میدان بہت وسیع معلوم ہوا، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ شیخ مراد علی سنبھلی کی تصنیف (تفسیر مرادیہ) ۱۷۷۰ء کی تالیف ہے اور وہ اردو نثر کا سہل اور سلیس نمونہ ہے۔

مقالے میں اکیاسی علمار کی ایک سو باون[152] تصانیف میری تحقیق کا موضوع رہی ہیں، جن میں سے پچاس[50] خطی کتابیں، بقیہ مطبوعہ کتابیں (جو گرچہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں) ہیں۔

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، اس کا پہلا باب شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادگان اور ان کے ہمعصر علمار کی تصانیف سے متعلق ہے۔ اس باب میں آٹھ علمار کی گیارہ تصانیف ہیں، ان میں شاہ عبد القادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور حکیم شریف خاں کا نام تو ادبی تاریخ میں مل جاتا ہے، باقی حضرات کے نام اور اُن کی تصانیف انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرے اور تیسرے باب میں سید احمد شہیدؒ اور اُن کے رفقار کے نثری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، سید احمد شہیدؒ کو ہم نے اردو نثر کے مصنف کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، سید صاحب کے رفقار میں مولوی سید عبد اللہ بن بہادر علی حسینی کی علمی سرگرمیوں کا خاص طور سے تعارف کرایا ہے کہ انھوں نے کلکتہ میں مطبعِ احمدی قائم کرکے اردو زبان کی نشر و اشاعت کا بڑا کام کیا۔

ان دونوں ابواب میں چودہ[14] علمار کی سینتالیس[47] تصانیف پر اظہارِ خیال ہے، ان میں تقویۃ الایمان اور تنبیہ الغافلین کا تو ادبی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے، باقی مصنفین اور کتابیں ایک نوع سے پہلی مرتبہ متعارف ہوئی ہیں۔

چوتھا باب شاہ اسحٰق دہلوی کے تلامذہ اور رفقاء کی تصنیفات پر مشتمل ہے۔ اس میں تیرہ[۱۳] علماء کی پچیس[۲۵] کتابوں پر بحث کی گئی ہے، ان میں مفتی صدرالدین آزردہ، نواب قطب الدین خاں، مفتی عنایت احمد، شاہ احمد سعید، مولوی محمد شاہ اور قاری عبدالرحمٰن جیسے علماء، حکیم نصراللہ خاں وصّال ناظہور علی ظہورؔ جیسے شاعر اور مولوی شیخ عبداللہ جیسے مبلغ شامل ہیں،

پانچواں اور چھٹا باب علمائے روہیل کھنڈ کی تصنیفات کے جائزہ پر مشتمل ہے ان دونوں ابواب میں پچیس[۲۵] علماء کی چالیس[۴۰] تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے، اس جائزہ میں سید شاہ حقانی کی "تفسیر حقانی" ۱۷۹۲ء کی تالیف ہے، اسی طرح مولوی شاہ عبدالمجید بدایونی نے ۱۸۱۶ء میں "سیرت رسول" پر ایک کتاب "محافل الانوار" اردو نثر میں سب سے پہلے لکھی۔

ساتواں باب علمائے اودھ کی علمی کاوشوں پر مشتمل ہے، ان میں تیرہ[۱۳] علماء کی سترہ[۱۷] تصانیف کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

آٹھویں اور آخری باب میں بنگال اور بہار کے علماء کی کتابوں کو متعارف کرایا گیا ہے، اس باب میں چھ[۶] علماء کی گیارہ تصانیف پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

پروفیسر سید محفوظ علی

الوداع اے آفتابِ علم و حکمت الوداع

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سرزمین ہند و پاک میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم ایسی نابغۂ روزگار شخصیت تھے جسے زمانہ برسوں میں جنم دیتا ہے۔ لیکن صد افسوس کہ وہ اس دنیائے آب و گل میں ستاون سال گزار کر اس دارِ فانی سے ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء بروز جمعہ ہزاروں دوست و احباب اور اعزاء و اقربا کو سوگوار چھوڑ کر کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موت و حیات یوں تو ایک قانونِ فطرت ہے مگر بعض انسانوں کی موت کے رنج و غم کا دائرہ بڑا وسیع و دور رس اور دیرپا ہوتا ہے۔

رخصت ہوا کون خوں رسیدہ
ہر اہلِ وفا ہے آبدیدہ!

بحیثیت ایک عالِم ان کی موت ایک عالَم کی موت تھی۔ وہ ایک بلند پایہ محقق مورخ و ادیب تھے۔ آپ بروز چہار شنبہ مطابق ۲۸ جولائی

۱۹۲۶ء کو آنولہ (بریلی) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے قرآنِ کریم پڑھا۔ ۱۹۴۷ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک بدرجۂ اوّل پاس کیا اور اردو اور ریاضی میں امتیاز حاصل کیا۔ آپ ۱۹۵۰ء تک بدایوں میں رہے جہاں سے انٹر پاس کیا۔ بعد ازاں اسی سال پاکستان ہجرت کی اور فوری طور پر محکمہ رسد و ترقیات حکومتِ پاکستان میں ملازمت اختیار کرلی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم اور تعلیمی کاوشوں کا سلسلہ چلتا رہا آپ نے سرکاری ملازمت ۱۹۵۷ء تک جاری رکھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی میں معاون محقق اور ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا جہاں ملک کی نامور شخصیت ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے آپ کا تعارف اور رابطہ قائم ہوا اور آپ نے ان سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر قریشی صاحب نے "علماء ان پالیٹکس" اور اپنی بعض دوسری کتابوں اور نجی گفتگو میں کیا ہے۔ مرحوم قادری اکثر مجھے وہاں کی بعض دلچسپ و مفید کارروائیوں کا حال سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۳ء آپ اردو کالج میں جز وقتی اور بعد ازاں مستقل ایک معزز درجہ پر فائز رہے۔ مگر موت کے ظالم پنجے سے پروفیسری (جو ان کی عظمت کے آگے ایک حقیر شے تھی) ملنے سے کچھ ہی پہلے (خود کالج کی نظر میں ان کی پروفیسری یقینی تھی محض ایک میٹنگ کی کسر تھی) آدبوچا اور وہ اس کی حسرت دل ہی میں لئے جاں بحق ہو گئے ؎

آ نہیں سکتا لبِ اظہار تک کربِ الم

اب ایک بوجھل دل سے یہی کہا جا سکتا ہے

الفراق والوداع اے تاجدارِ شہرِ علم ؎ الفراق والوداع اے روشنئ مہرِ علم

۱۹۷۵ء میں کالج کی طرف سے آپ کو "ہلالِ اردو" کا تمغہ ۱۹۷۶ء میں پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے "اکیڈیمک ایوارڈ میڈل" اور اسی سال قائدِ اعظم کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے "تمغۂ قائدِ اعظم" ملا اس عرصہ میں آپ نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی تاریخی اور ادبی کانفرنسوں میں بحیثیت مندوب شرکت کی اور بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۸۰ء میں آپ نے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں "اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ" پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ لاہور میں زیرِ طبع تھا کہ اچانک آپ کو عدم کا رختِ سفر باندھنا پڑا۔

آپ کو بچپن ہی سے مطالعہ اور کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اس وقت کتابوں کا ذاتی ذخیرہ کئی ہزار کتابوں اور قلمی نسخوں پر مشتمل ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی مثال آپ پر صادق آتی تھی۔ آپ کو ابتدائی تعلیمی زندگی میں تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ آپ اکثر مختلف رسالوں اور مجلوں میں مضامین لکھا کرتے۔ آپ کو دینی شعور اور علمی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ کیونکہ آپ کے آبا و اجداد اپنے وقت کے عالم و فاضل لوگوں میں سے تھے۔ آپ کے دادا مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷ - ۱۹۲۰) فنِ خطاطی کے ماہر اور عربی ادب، تاریخ اور اسماء الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کے والد مشیت اللہ قادری مرحوم فارسی عربی اور ہندی میں فارغ التحصیل تھے اور تاریخ و ادب اور اسماء الرجال پر گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ غالباً برصغیر میں فنِ اسماء الرجال میں ان کا اس وقت کوئی ہمسر موجود نہیں تھا۔ انہیں تبلیغ و مناظروں سے بھی شغف تھا اور تحریکِ پاکستان کے زبردست موئید و حامی تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں دادو میں انتقال کیا۔ ان ہی تمام صفات کے حامل ڈاکٹر

ایوب قادری مرحوم بھی ـــــ تھے۔ وہ ایک متدین عالم اور بے مثال ادیب و مورخ تھے۔ وہ پر گو اور زود قلم تھے۔ دنیاداری اور دنیا کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ وہ دینی اور ادبی خدمات بھی انجام دیتے رہے اور دوستوں سے جو کثیر التعداد تھے تعلقات و روابط برابر قائم رکھتے تھے۔ ان کے روزمرہ کے معمولات سے جو واقف ہے اسے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ان معمولات کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ کیونکر قائم رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے نہ رہا گیا اور بالآخر سوال کر ہی بیٹھا کہ وہ لکھنے پڑھنے کا وقت کب نکال لیتے ہیں۔ ان کے جواب سے معلوم ہوا کہ وہ سحر خیزی کے عادی تھے اور ناشتہ کے وقت تک لکھنے پڑھنے کے بیشتر کام سے فراغت حاصل کر لیتے تھے۔ اپنے وقائع عبدالقادر خانی کو "علم و عمل" کے نام سے دو جلدوں میں ضروری حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ مولوی رحمٰن علی کے تذکرے "علمائے ہند" کو طویل حواشی کے ساتھ ترجمہ کیا۔ مولانا فیض احمد بدایونی کے حالاتِ زندگی پر ایک کتابچہ شائع کیا۔ اردو کالج سے باقاعدہ وابستہ ہونے کے بعد سے آپ کی تحقیقی و تصنیفی سرگرمیوں کو اور مہمیز لگی اور آپ نے اس دوران "مخدوم جہانیاں جہاں گشت"، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، "ارباب فضل و کمال (بریلی) کی سوانح عمریاں اور علمی کارنامے"، "تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ" اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات و شخصیات پر جامع تصانیف کے ذریعہ اپنے علمی کارناموں میں اضافہ کیا۔ آپ نے "مجموعہ وصایا اربعہ"، "مآثر الامرا"، "فرحت الناظرین" اور سیر العارفین کا ترجمہ کیا اور عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ کو ترتیب دے کر اور ضروری حواشی درج کئے۔

ان علمی کاوشوں کے علاوہ علمی و ادبی صحافت میں بھی آپ کا خاصا

مقام تھا۔ آپ نے ہند و پاکستان کے متقدر رسالوں اور مجلوں میں مستقل اہمیت کے مقالے لکھے آپ اردو کالج کے شہرۂ آفاق مجلہ "برگ گل" کے ایک عرصہ تک نگراں رہے اور اس کے متعدد خصوصی نمبر ترتیب دیئے۔

غالباً مشرقی ادب میں ایسے جامع مقدمات نہیں لکھے جاتے ہیں جیسے کہ انگریزی ادب میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ ایک اہم فن ہے جس میں مرحوم کو کمال حاصل تھا۔ آپ ایک زبردست مقدمہ نگار تھے۔ آپ نے کم و بیش پچیس کتابوں کے دیباچے اور مقدمے لکھ کر ان کا تعارف کرایا۔ آپ کی بعد کے زمانے کی تصانیف میں خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی ضخیم تاریخ "طبقات اکبری" کا اردو ترجمہ اور غالب اور عصر غالب" شامل ہیں۔ غرضیکہ پروفیسر قادری مرحوم نے ایک وافر و قیع اور قابل فخر علمی ورثہ چھوڑا ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں ؎

کتاب دوراں کے ہر ورق پر حیات اس کی رقم شدہ ہے

آپ برصغیر کی ایک یگانہ اور متنوع شخصیت تھے۔ وہ درویش صفت انسان تھے۔ سادگی انکساری خوش خلقی اور نمود و نمائش سے حد درجہ گریزان کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ بہترین دوست اور مخلص رفیق تھے۔ ایک مرتبہ کسی سے تعلق پیدا ہو جاتا تو تمام عمر اس کو نبھاتے بلکہ خوب نبھاتے کہیں ٹیلی فون سے خیریت دریافت کرتے کہیں جاکر ملاقات کرتے اور کہیں گھر پر مدعو کر کے ملاقات کرتے اور ہر شخص کے کام آتے۔ اعزا اقربا دوست احباب سبھوں سے میل جول قائم رکھتے۔ وہ بڑے متواضع انسان تھے ان کی شخصیت پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

اک ہمالہ جس کے قد سے پوری دنیا آشنا ٭ اک سمندر اپنی گہرائی سے خود نا آشنا

ڈاکٹر معین الدین عقیل

ایک ممتاز محقق

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق، مولف اور مترجم کی حیثیت سے خاص شہرت کے حامل ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کی اسلامی تاریخ اور اسماء الرجال ان کی دل چسپی کے خاص موضوعات ہیں۔ اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کے سبب نہ صرف وہ ایک خاص اہمیت اور مقام رکھتے ہیں، بلکہ انھیں علمائے ہند اور ہندوستان کی مذہبی و اسلامی تحریکات پر استناد کا درجہ بھی حاصل ہے۔ ان کا کمال محض یہی نہیں کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی ہی نہایت وقیع اور رادق موضوعات، علم و تحقیق کی تلاش و جستجو میں گزار دی۔ اور ہماری تہذیب اور علمی تاریخ کی بعض اہم کتابوں کو ترتیب، حواشی اور ترجمہ کے ذریعہ اردو دنیا سے متعارف کرایا، بلکہ انھوں نے علم و تحقیق کے ایسے موضوعات منتخب کئے اور ایسی شخصیات اور تحریکات پر دادِ تحقیق دی جو علمی دنیا کے لئے بالعموم اجنبی اور اس کی رسائی سے دور رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی ساری زندگی اور ساری دل چسپیاں علم و تحقیق کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ طرزِ زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ ہے۔ فقر و قناعت اور بے نیازی اور خلوص و محبت اور شفقت و پاسداری ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کی محنت اور لگن اور جانفشانی اور دقتِ نظری ان کی زندگی کے ہر انداز اور ان کی لکھی ہوئی ہر ہر سطر سے ظاہر ہوتی ہے۔

وہ اپنی علمی اور تدریسی زندگی کے ذریعہ مفید اور لائقِ تحسین خدمات انجام دے

رہے ہیں۔ ان دنوں اردو کالج کراچی میں شعبۂ اردو کے صدر اور اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اردو کالج میں ایم اے (اردو) کی تدریس ہوتی ہے، ان کی شخصیت کے ان اوصاف کی تشکیل میں جہاں ان کی فطری لگن اور محنت و جانفشانی کا دخل ہے وہیں وہ اپنے خاندان کے ایک شاندار علمی ورثہ کے بھی حامل ہیں جس کے زیر سایہ ان کے علمی و ادبی مزاج کی ترتیب و تعمیر ہوئی ہے۔

ان کے ایک جد اعلیٰ حکیم احمد اللہ اپنے عہد کے نامور عالم اور خطیب تھے۔ ان کا خاندان بدایوں میں توطن پذیر تھا۔ مگر روہیلوں کے عہد میں قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) میں آکر آباد ہوا۔ نواب علی محمد خاں والئ روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نور غازی کی زیارت (واقع منونہ) سے متعلق ایک بڑی اراضی وقف کی تھی، اس کے متولی حکیم احمد اللہ تھے۔ ان کے صاحب زادے حکیم حبیب اللہ علم و فضل میں ممتاز ہوئے۔ حکیم حبیب اللہ کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری بھی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ انھیں علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی "معارف المیراث"، "کاشف الحقیقت"، "تفسیر سورۃ العصر" ان سے یادگار ہیں۔ انھوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی تحریر کئے۔ درس و تدریس اور مطب ان کے مشاغلِ زندگی تھے۔ غالباً اطبائے رامپور یا نواب رامپور نے انھیں "اشرف الحکماء" کا خطاب دیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں ہوا۔

ان کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش، حکیم سعید اللہ، میاں وحید اللہ اور حافظ امام الدین تھے۔ ان میں سے مولوی حکیم سعید اللہ مرحوم سے پروفیسر قادری صاحب کا سلسلہ ملتا ہے۔ حکیم سعید اللہ (۱۸۲۶ء - ۱۹۰۷ء) سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ خاندانی پیشہ طب اور زمینداری سے متعلق رہا۔ کئی کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں پر حواشی تحریر کئے۔ ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں کی فوج میں بھرتی ہو کر کگرالہ (ضلع بدایوں) اور کنیلہ (ضلع فرخ آباد) میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے ایک فرزند مولوی

رحیم بخش (۱۸۵۷ء - ۱۹۲۰ء) یادگار چھوڑے۔ یہ پروفیسر قادری صاحب کے دادا تھے۔ انھوں نے علوم متداولہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فنِ خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ کئی کتابیں اور رسالے اور کتابیں لکھیں۔ عربی ادب پر گہری نظر تھی اور ابن عربی کا خاص مطالعہ تھا۔

انھوں نے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ قادری (۱۸۸۹ء - ۱۹۵۹ء) یادگار چھوڑے یہ پروفیسر قادری صاحب کے والد ماجد تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم خلیفہ ضیاء علی سے حاصل کی۔ فارسی کی کتابیں اپنے والد اور مولوی اسد علی خاں سے پڑھیں اور فارسی میں بہت اچھی قابلیت حاصل کر لی۔ عربی اپنے دادا حکیم سعید اللہ قادری سے تحصیل کی اور کتب متوسطات تک ان سے پڑھیں۔ پھر مولانا سراج الدین شاہجہان پوری سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ اور مفتی حافظ بخش بدایونی سے تکمیل کی۔ منشی جو کھے لال سے ہندی پڑھی۔ بعض دیگر فنون بھی سیکھے۔ فنِ شہسواری سے بھی دل چسپی تھی۔ تاریخ و ادب میں کمال رکھتے تھے۔ تاریخ روہیل کھنڈ اور انساب و رجال پر گہری نظر تھی۔ تبلیغِ دین اور مناظرہ سے خاص دل چسپی تھی۔ مختلف مقامات پر، خصوصاً بمبئی میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۳ء کے دورانِ قیام میں مناظرے کیے۔ تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ تحریکِ پاکستان کے زبردست موید تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ دادو (سندھ) میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ تاریخ، انساب اور ردِ آریا اور ردِ شیعہ میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔ پروفیسر قادری کے علاوہ عبد القیوم، عنایت اللہ اور نعمت اللہ ان کے فرزند ہیں۔ اول الذکر نے ۱۹۴۳ء میں بدایوں میں اور آخر الذکر نے ۱۹۸۱ء میں کراچی میں رحلت پائی۔

پروفیسر قادری صاحب آنولہ میں بروز چہارشنبہ بتاریخ ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء پیدا ہوئے۔ شہر کے ایک مقتدر عالم اور بزرگ مولوی حکیم عبد الغفور نے ان کے کان میں اذان

دی اور "چراغِ علم" سے تاریخ پیدائش نکالی۔ حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے قرآن کریم پڑھا۔ پھر مدرسہ تعلیم المومنین میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۹ء میں پرائمری اور ۱۹۴۲ء میں مڈل درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ ریاضی میں امتیاز حاصل کیا۔ یہیں سے ۱۹۴۳ء میں ہندی مڈل کا امتحان بھی کامیاب کیا اور اردو اور ریاضی میں پھر امتیاز حاصل کئے۔ اس اثناء میں اپنے والد اور مولوی اسد علی خاں سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ میزان و منشعب مولوی حکیم عبدالغفور سے پڑھیں۔ بدایوں ان کا ننہالی وطن ہے۔ ان کے نانا حاجی وہاب الدین بدایونی نہایت دیندار اور صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ تعلیم کے سلسلہ میں پروفیسر قادری صاحب چار سال تک بدایوں میں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے وہاں سے اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۰ء میں اس کا امتحان کامیاب کیا۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے لئے ہجرت کی اور والد کے ساتھ کچھ عرصہ دادو میں قیام رہا، بعدہٗ کراچی آکر ۱۲ ستمبر ۱۹۵۰ء کو محکمہ رسد و ترقیات حکومتِ پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اردو کالج کراچی سے ۱۹۵۶ء میں بی اے کامیاب کیا اور پھر ۱۹۶۲ء میں جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔

ان کی سرکاری ملازمت کا سلسلہ مئی ۱۹۵۷ء تک جاری رہا۔ اسے ترک کر کے وہ مئی ۱۹۵۷ء سے مارچ ۱۹۶۲ء تک "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" میں معاون محقق اور ریسرچ افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی ستمبر ۱۹۶۲ء سے مارچ ۱۹۶۳ء تک اردو کالج کراچی میں جز وقتی استاد شعبۂ اردو کی حیثیت سے منسلک رہے۔ یکم پھر ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے مستقل لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق برقرار ہے اور وہ اب ایک سینئر استاد کی حیثیت میں ایک معزز اور محترم درجہ پر فائز ہیں۔

اس عرصہ میں انھوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۵ء میں اردو کالج کی جانب سے "ہلال اردو تمغہ"، کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں "اکیڈمک ایوارڈ میڈل"، اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے اسی سال قائد اعظم کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے "تمغۂ قائد اعظم" حاصل کئے۔ پھر اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی، مذہبی، تاریخی اور ادبی کانفرنسوں میں بھی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ اور ساتھ ہی برعظیم پاک و ہند کے کئی اہم کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔

پروفیسر قادری صاحب ابتدائی تعلیمی زندگی ہی سے علم و ادب سے خصوصی لگاؤ کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی عمر ہی سے انھیں کتابوں کے مطالعہ اور انھیں جمع کرنے کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب کئی ہزار اہم، نادر و کمیاب اور سینکڑوں قلمی نسخوں پر مشتمل ہے، جن میں تاریخ و رجال پر نہایت وقیع اور مفید کتابوں کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ ابتدائی تعلیمی زندگی ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق پروان چڑھا اور مختلف رسالوں کے لئے مضامین لکھنے کی مشق جاری رہی۔ ان کا ابتدائی علمی و تحقیقی کارنامہ مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات پر مشتمل ایک کتابچہ تھا، جو مئی ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی یہ کاوشیں علمی دنیا میں انھیں متعارف کرانے کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوئی۔ پھر انھوں نے بہت جلد یکے بعد دیگرے کئی اہم کاوشیں علمی دنیا کے سامنے پیش کیں۔ جن میں وقائع عبد القادر خانی کو "علم و عمل" کے نام سے دو جلدوں میں اپنے قیمتی حواشی کے ساتھ مرتّب کرنا اور مولوی رحمان علی کے معروف اور اہم تذکرہ "علمائے ہند" کو اپنے طویل مقدمہ اور مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرنا اور مرتّب کرنا شامل ہے۔ علمی دنیا کو چونکانے اور ان کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ اپنی محنت، دقیقہ رسی، خلوص اور لگن سے پروفیسر قادری صاحب نے ان کتابوں کو پہلے سے کہیں زیادہ مفید اور وقیع بنا دیا۔ ان کتابوں کے منظرِ عام پر آنے کے وقت تک وہ

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے منسلک تھے۔

اردو کالج سے بحیثیت استاد وابستہ ہوتے کے بعد ان کی علمی و تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ مزید وسیع ہوگیا۔ اس زمانے کی کاوشوں میں "مخدوم جہانیاں جہاں گشت"۔ "مولانا محمد احسن نانوتوی"۔ "ارباب فضل و کمال" (بریلی) کی سوانح عمریاں اور ان کے علمی کارناموں کا مفصل تذکرہ اور پھر تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ اور "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات و شخصیات" پر ان کی جامع اور وقیع تصانیف ان کے یادگار علمی کارنامے ہیں۔ ان کے علاوہ تراجم میں "مجموعہ وصایا اربعہ" (شاہ ولی اللہ وغیرہ) "ماثر الامرا" (شاہ نواز خاں کی تصنیف کردہ تین جلدیں) "فرحت الناظرین" (محمد اسلم انصاری پسروری) اور "سیر العارفین" (جمالی) اور ترتیب و حواشی میں "تواریخ عجیب" (کالا پانی) عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ، مقالات یوم عالمگیر، تذکرہ نوری (حالات شاہ ابوالحسین نوری مارہروی) اور جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رامپور (معظم عباسی) وغیرہ اُن کی ایسی کاوشیں ہیں جو علمی دنیا کے لئے مستقل استفادہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کاوشوں کے ساتھ ساتھ شریکِ مولف کی حیثیت سے "خطوط خطاطی"، "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" اور "نقوشِ سیرت"، مستقل اہمیت کی حامل بن گئی ہیں۔

اِن مستقل اور مفصّل علمی و تحقیقی کاوشوں کے علاوہ پروفیسر قادری صاحب نے برعظیم پاک و ہند کے بلند پایہ اور مقتدر علمی اور تحقیقی مجلوں اور رسالوں میں مستقل اہمیت کے حامل مقالات اور مضامین لکھے۔ اور تقریباً پچیس کتابوں پر مقدمات اور دیباچے تحریر کئے۔ علمی اور ادبی صحافت میں بھی ان کا دخل رہا ہے۔ سہ ماہی "بصائر" (کراچی) کے اعزازی نائب مدیر اور ماہنامہ "سرحد" (کراچی) کے اعزازی نگراں رہے۔ اردو کالج کے مجلہ "برگِ گل" کے ایک عرصہ تک نگراں رہے۔ ان کی

نگرانی کے زمانہ میں انھیں کے اہتمام سے اور ان کی ادارت میں اس مجلہ کے سرسید نمبر (نقش ثانی) تعلیمی پالیسی نمبر اور قائداعظم نمبر شائع ہوئے۔ اسی طرح "العلم" (کراچی) کا غالب نمبر انھوں نے مرتب کیا۔

ابھی حال ہی میں انھوں نے پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لئے جامعہ کراچی میں ایک مبسوط تحقیقی مقالہ "اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ" پیش کیا تھا جس پر جامعہ کراچی نے انھیں ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔ یہ مقالہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر قادری صاحب کی تخصیص اور اُس پر ایک طویل مدت کی جانفشانی یقیناً اس مقالہ کی اہمیت اور اس کے درجہ کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

(تعارف — غالب اور عصر غالب)

ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کا مولد و وطن علاقہ روہیلکھنڈ کا قصبہ آنولہ اور وطن ثانی بدایوں تھا۔ قصبہ آنولہ میں اُن کی ددھیال تھی اور بدایوں ننھیالی وطن تھا اب یہ فیصلہ کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ ایوب صاحب اپنے جدی وطن آنولہ کے لئے باعثِ فخر ہیں یا ان کے لئے آنولہ کا ہونا موجبِ افتخار ہے۔ میں اگر یہ کہوں اور اس کے علاوہ مجھے کوئی اور بات کہنی بھی نہیں چاہئے کہ ایوب صاحب اپنے وطن کے لئے باعثِ صد افتخار ہیں تو مجھ پر ایک دوست کی جانبداری کا الزام لگا دیا جائے گا لہٰذا میں آنولہ اور ایوب صاحب دونوں کے کوائف بتا کر اس مسئلہ کا حل قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

قصبہ آنولہ کو روہیلکھنڈ کا پہلا دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل ہے سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں شمالی ہندوستان میں جو حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان میں روہیلکھنڈ کی حکومت کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس حکومت کے پہلے فرمانروا نواب علی محمد خاں تھے ان کا انتقال ۱۴ ستمبر ۱۷۴۹ء کو ہوا

انہوں نے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا نواب علی محمد خاں کے پورے دور حکومت اور حافظ رحمت خاں کے ابتدائی دور میں روہیلکھنڈ کا صدر مقام آنولہ رہا اس وقت اس کو غیر معمولی رونق اور ترقی نصیب ہوئی۔ محلات اور مساجد اور دیگر شاندار عمارتیں کثرت سے تھیں۔ چند سال آنولہ میں قیام کے بعد حافظ رحمت خاں نے بریلی میں سکونت اختیار کر لی اور روہیلکھنڈ کا صدر مقام آنولہ کے بجائے بریلی ہو گیا جس کی وجہ سے پہلے دار الحکومت کی رونق میں کمی آتی گئی۔ پھر بھی اس کی عظمتِ رفتہ کے نقوش نصف صدی سے زیادہ عرصہ بعد تک قائم رہے چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب ڈبلیو فرینکل نے تاریخ شاہ عالم لکھی تو اس نے آنولہ کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے:

"شہر آنولہ جو روہیلکھنڈ کے بہترین حصہ اور مرکز میں ایسی مناسب و موزوں جگہ پر واقع ہے کہ وہاں سے نواحی علاقہ کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے نواب ندی نام کا چشمہ شہر کے جنوب مغربی سمت میں بہتا ہے آبادی کافی وسیع ہے اور اس میں متعدد خوبصورت عمارتیں ہیں جن میں سے بیشتر کھنڈر ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ابھی تک بہت سی وہ چیزیں باقی ہیں جنہیں دیکھ کر اس جگہ کی عظمتِ رفتہ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اس نمایاں مقام کے بلند ترین حصہ میں اینٹوں سے بنا ہوا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ تقریباً پچاس سال قبل کٹھیر کی روہیلہ حکومت کے بانی علی محمد خاں نے تعمیر کیا تھا۔ یہیں اُن کا دربار لگتا تھا۔ قلعہ کے اندر ہی علی محمد خاں کا محل ایک خانقاہ اور کئی دوسری عام عمارتیں ہیں۔ آنولہ کے قرب وجوار میں محلوں، باغوں اور مسجدوں کے کھنڈرات ہیں۔ نواحی علاقہ قدرتی طور پر حسین ہے لیکن زراعت کے کلیتہً فقدان سے اس منظر پر ایک اداسی، سی چھائی ہوئی ہے۔ آنولہ بریلی سے بجانب شمال مغرب سولہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بسولی سے چودہ میل دور ہے اور دہلی اور پیلی بھیت

سے مساوی فاصلہ ہے۔

یہ حالت تو اس وقت تھی جب اٹھارویں صدی عیسوی اپنا دور پورا کر رہی تھی۔ اس کے بعد سے اس کو برابر زوال ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ تقسیم ملک کے وقت یہ ایک اوسط درجہ کا قصبہ رہ گیا تھا۔ تاہم اس وقت بھی وہاں کچھ پرانی عمارتیں باقی تھیں اور مسجدوں کی تعداد تو حدو شمار سے باہر تھی جن کی وجہ سے قصبہ پر اسلامی اثرات غالب نظر آتے تھے

یہی وہ تاریخی مقام آنولہ ہے جہاں جون ۱۹۲۶ء میں ایوب صاحب نے آنکھ کھولی اور پہلے پہل ضیائے مہر کا مشاہدہ کیا۔ اُن کا تعلق قصبہ کے ایک متوسط خاندان سے تھا۔ اُن کے پدر بزرگوار شیخ مشیت اللہ صاحب کسی کالج، جامعہ یا دارالعلوم کے فاضل تو نہ تھے لیکن اس زمانہ میں جو تعلیم نجی طور پر حاصل کی جاتی وہ بھی اس معیار کی ہوتی تھی کہ اس وقت کا معمولی پڑھا لکھا آدمی آجکل کے گریجویٹوں سے زیادہ قابل ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اُن کا اردو، فارسی اور عربی کا مطالعہ ایسا تھا کہ اِن زبانوں کی معیاری کتابیں ان کو مستحضر تھیں ایوب صاحب نے ادبی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا اور ذاتی شوق اور محنت سے اس وصف کو جو جلا بخشی وہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔

پرانے رواج کے مطابق انہوں نے ابتداً قرآن مجید اور کچھ مذہبی کتابیں پڑھیں، عربی اور فارسی اپنے والد صاحب سے سیکھی۔ اس کے بعد مقامی پرائمری اسکول میں داخل ہو گئے۔ سابقہ مطالعہ، ذہانت اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ ممتاز رہے اور ۱۹۳۹ء میں پرائمری کے امتحان میں شریک ہوئے تو نہایت اچھے نمبر حاصل کئے اور وظیفہ کے مستحق قرار دیئے گئے تین سال بعد ۱۹۴۲ء میں اردو مڈل کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔ ریاضی میں امتیازی

نمبر ملے، دوسرے سال ہندی میں مڈل پاس کیا۔ اور انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے۔ اپنی محنت اور قابلیت سے بہت جلد طلبہ اور اساتذہ میں خلصے مقبول ہو گئے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں یوپی بورڈ سے ہائی اسکول کا امتحان بھی درجہ اوّل میں پاس کیا۔ ریاضی اور اردو میں امتیاز حاصل کیا اور ایک بار پھر سرکاری وظیفہ کے مستحق قرار دیئے گئے اعلیٰ تعلیم کے لئے بدایوں چلے گئے اور وہاں اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔ بعض وجوہ سے ۱۹۴۹ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک نہ ہو سکے اور ۱۹۵۰ء میں یوپی بورڈ سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال ماہ اپریل میں ترکِ وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ ابتداً دادو میں قیام رہا۔ پھر تلاش روزگار میں کراچی آئے اور ۱۲ ستمبر ۱۹۵۳ء کو وزارتِ صنعت میں سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ سے منسلک ہو کر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن علمی مشاغل بھی جاری رہے۔ قلیل آمدنی کے باوجود وحید آباد میں ایک معمولی سا مکان بھی بنایا اور کتابیں خریدنی اور جمع کرنی شروع کیں۔ کتب بینی کثرت سے کی جس کی وجہ سے بہت جلد ان کی علمیت کا شہرہ مشک کی خوشبو کی طرح پھیلنے لگا۔ خوش قسمتی سے اسی عرصہ میں سید الطاف علی بریلوی نے بھی بھارت سے مہاجرت اختیار کر کے کراچی میں توطن اختیار کیا اور آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس قائم کی۔ ساتھ ہی اس کا ترجمان سہ ماہی رسالہ "العلم" جاری کیا۔ ایوب صاحب کی ملاقات ان سے ہوئی تو سید صاحب نے اپنی فراست سے ان کے جوہر ذاتی کو پرکھ لیا اور انہیں مضمون نگاری کی طرف راغب کیا۔ صلاحیت تو پہلے سے تھی۔ اس سہارے نے اسے مہمیز کیا۔ ایوب صاحب کے مضامین 'العلم' میں شائع ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے کالج میں بڑھ کر کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس وقت

تک مضمون نگاری میں اتنی مشق و مزاولت بہم پہنچائی کہ بی۔ اے پاس کرنے کے دوسرے سال یعنی ۱۹۵۷ء میں اپنی پہلی تصنیف "فیض احمد بدایونی" شائع کی اگرچہ یہ چھوٹے سائز کے ۴۰ صفحات کا ایک مختصر سا کتابچہ ہے پھر بھی اس سے ان کی تصنیفی صلاحیتیں اس قدر آشکارا ہوئیں کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کے معتمد جناب ڈاکٹر معین الحق صاحب نے ان سے سیکریٹریٹ کی ملازمت چھڑوا کر اپنے ادارہ میں ریسرچ افسر کی حیثیت سے رکھ لیا تقریباً آٹھ سال ایوب صاحب اس ادارہ سے منسلک رہے۔ یہ زمانہ ہسٹاریکل سوسائٹی کا دورِ عروج ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اپنی صحت بھی اچھی تھی اور وہ خود بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے۔ ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایوب صاحب موجود تھے۔ پھر مفتی انتظام اللہ شہابی اور پروفیسر غضنفر صاحب جیسے ذی علم اور اور محنتی حضرات کا تعاون حاصل تھا۔ سب پر طرہ یہ کہ سابق وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن صاحب کی سرپرستی حاصل تھی اور وہ ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ادارے نے جتنا علمی کام اس زمانہ میں کیا اس کا عشرِ عشیر بھی کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔

اسی زمانہ میں ایوب صاحب نے اپنی پہلی گرانقدر کتاب تذکرہ علمائے سند مرتب کی جو ۱۹۶۱ء میں ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع ہوئی۔ اگرچہ یہ کتاب مولوی رحمٰن علی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایوب صاحب نے جو اضافے کئے ہیں اور برصغیر میں اشاعتِ علم کے سلسلہ میں جن علماء نے کام کئے ہیں ان کے بارے میں جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس کی بنا پر انہوں نے اس کتاب کو اپنا لیا ہے اور یہ ان کی ذاتی تصنیف معلوم ہونے لگی ہے۔ اس کتاب نے انہیں طبقہ علماء میں متعارف کرایا اور ان کا شمار صفِ اول کے مصنفین میں ہونے لگا۔

تذکرہ علمائے ہند پیش کرنے سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۶۰ء میں وہ وقائع عبدالقادر خانی کے ترجمہ کو مرتب کرکے اور وقائع نصیر خانی کا ترجمہ کرکے علم وعمل کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سے شایع کرا چکے تھے۔

ملازمت اور تصنیف وتالیف کے مشغلہ کے ساتھ ساتھ ایوب قادری صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پروفیسر غضنفر صاحب کے مشورہ سے انہوں نے اُردو کا مضمون لے کر ایم۔ اے کی تیاری کی اور ۱۹۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہوئے۔ درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن تھی۔ اس کا ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ہسٹاریکل کانفرنس کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کو اردو کالج میں جز وقتی لیکچرر کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، ستمبر ۱۹۶۲ء سے ۴ مارچ ۱۹۶۳ء تک انہوں نے اس طرح کام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے اسی کالج میں منتقل ہو گئے اور ہسٹاریکل سوسائٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر آئندہ پوری توجہ سے تدریس وتصنیف کا سلسلہ جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر صدر شعبۂ اُردو ہو گئے۔

۱۹۶۲ء کے بعد سے ایوب صاحب کی تصنیف وتالیف کی رفتار بہت تیز ہو گئی ۱۹۶۲ء میں تواریخ عجیب عرف کالا پانی مصنفہ جعفر تھانیسری کو قیمتی اور مفید حواشی کے ساتھ ترتیب دے کر سلمان اکیڈمی سے شائع کرایا۔ دوسرے سال مخدوم جہانیاں جہاں گشت لکھی جو ۱۹۶۳ء میں ادارہ تحقیق وتصنیف سے شائع ہوئی۔ اس ادارہ کی بنیاد مارچ ۱۹۶۲ء میں رکھی گئی تھی۔ ایوب قادری صاحب اس کے بنیادی رکن اور معتمد اعزازی تھے اس ادارہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے اشاعتی پروگرام میں سب سے پہلے یہی کتاب شامل کی گئی۔ اس کتاب کے لئے مواد جمع کرنے کی غرض سے ایوب صاحب نے دو مرتبہ اوچ کا سفر کیا، جس قدر ماخذ ان کی دسترس میں

تھے سب کو کھنگالا اور ایک ایک واقعہ کی چھان بین کر کے داخلِ کتاب کیا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اس وقت تک لکھی جانے والی تمام کتابوں میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا انداز عقیدہ تمندانہ سے زیادہ محققانہ اور ناقدانہ ہے انہوں نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو ایک فوق الفطرت ہستی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کو گوشت و پوست کا ایک ایسا پیکر بنا کر پیش کیا ہے جو اپنے دور کے انسانوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ اور جس نے آئندہ نسلوں کے لئے بھی انسانیت کا ایک بلند معیار قائم کیا۔ اس کے بعد ایوب صاحب کی کتابیں حسب ذیل ترتیب کے ساتھ شائع ہوئیں:۔

(تالیفات) مولانا محمد احسن نانوتوی (۱۹۶۶ء) ارباب فضل و کمال (۱۹۷۰ء) تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ (۱۹۷۱ء) جنگ آزادی (۱۹۷۶ء) غالب اور عصرِ غالب (۱۹۸۲ء) اور کاروانِ رفتہ (۱۹۸۲ء) (تراجم) مجموعہ وصایائے اربعہ (۱۹۶۴ء) مآثر الامراء، جلد اول (۱۹۶۸ء) جلد دوم (۱۹۶۹ء) جلد سوم (۱۹۷۰ء) اور فرحت الناظرین (۱۹۷۲ء) سیر العارفین (۱۹۷۶ء)۔

ترتیب و حواشی عہدِ بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (۱۹۶۵ء) اور مقالاتِ یوم عالمگیر، (۱۹۶۶ء) تذکرۂ نوری (۱۹۶۸ء) مرقع شہابی (۱۹۷۹ء) جنگ نامہ آصف الدولہ (۱۹۸۰ء)۔

ویسے تو یہ سب ہی کتابیں اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ان میں دو کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، پہلی کتاب مآثر الامراء ہے جو ایوب صاحب کی محنت و جانفشانی ترجمہ کی صلاحیت اور ایڈیٹنگ کی خوبی کے لحاظ سے شاہکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کتاب کے علاوہ ایوب صاحب کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی وہ صف اول کے مصنفین میں شمار کئے جاتے۔ تین ضخیم جلدیں جن کی ضخامت کو دیکھ کر ہی اچھے

اچھوں کے ہوش اڑ جائیں۔ ان کو ایوب صاحب نے جس لگن اور محنت سے ترکی آمیز فارسی سے اردو میں منتقل کیا وہ ان ہی کا کام ہے۔

کسی اور سے اس کام کا انجام پانا ممکن نہیں تھا۔ اس کتاب کے حوالے مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کی بعض تحریروں میں اکثر مل جاتے تھے ورنہ اس کی دقیق عبارت اور کتاب کی ضخامت کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ براہ راست اس سے استفادہ کرے۔ ایوب صاحب نے ترجمہ کرکے اسے عوام تک کے لئے قابل فہم بنا دیا ہے۔ قیمتی حواشی اور اشاریہ نے اس کی افادیت میں معتد بہ اضافہ کر دیا ہے۔

دوسری کتاب جو ایوب صاحب کے تاجِ شہرت کا سب سے قیمتی اور چمکدار موتی ہے وہ اُن کی تالیف جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ہے اس موضوع پر اتنا کام ہو چکا تھا کہ بظاہر کوئی گوشہ باقی نہیں رہا تھا لیکن ایوب صاحب نے اپنے لئے ایسے موضوع نکال لئے جن پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی انہوں نے بعض ایسے انکشافات کئے جن سے دوسروں کے لئے بھی تحقیق کے میدان کھل گئے۔

منتقل تصانیف و تالیفات کے علاوہ ایوب صاحب نے ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰ سے زیادہ علمی اور تحقیقی مقالے اور مضامین لکھ کر مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد میں شائع کرائے تقریباً تین ۳ کتابوں پر مقدمے لکھے۔ ان کو بھی رسمی کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر مقدمہ تحقیق و تفحص کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

اگرچہ ایوب صاحب کے پاس ایک بہت بڑا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں تین ہزار سے زیادہ نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔ مخطوطات کی تعداد بھی کافی ہے۔ اس کے باوجود تحقیق کے سلسلہ میں برصغیر کے حسب ذیل کتب خانے

دیکھے اور ان کی نادر کتابوں سے اپنی علمیت میں اضافہ کیا۔ کراچی۔ حیدرآباد۔ منصورہ بھاولپور۔ ملتان۔ فقیروالی (مدرسہ قاسم العلوم)۔ صادق آباد۔ محمد آباد۔ گجرانوالہ اسلام آباد۔ پشاور۔ اکوڑہ خٹک۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ بریلی، دیوبند، رام پور، بدایوں

ایوب صاحب کی کئی تصانیف ایسی ہیں کہ ان میں سے کسی پر بھی پاکستان یا بھارت کی کوئی بھی یونیورسٹی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے سکتی تھی مگر چونکہ ضابطہ کی بعض کارروائیاں کئے بغیر یہ اعزاز حاصل ہونا تقریباً ناممکن ہے اس لئے ایوب صاحب کو اس ڈگری کے حصول کے لئے مقررہ منازل و مراحل سے گزرنا پڑا انہوں نے ایم۔ اے کرنے کے فوراً بعد ہی کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرالیا تھا لیکن دیگر مشغولیات کی وجہ سے وہ اپنے موضوع پر کئی سال تک جم کر کام نہیں کر سکے تھے۔ اگر اس طرف تھوڑی سی توجہ کر لیتے تو وہ شاید بہت پہلے ڈاکٹر محمد ایوب قادری ہو گئے ہوتے، لیکن ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے لہذا انہیں ۱۹۸۰ء تک انتظار کرنا پڑا۔ پچھلے دو تین سال میں جب احباب نے ان پر زور ڈالا تو وہ اس طرف متوجہ ہوئے جو مواد ان کے حافظہ میں تھا اور انہوں نے مختلف کتب خانوں اور اپنے ذاتی کتب خانہ کے نوادر سے جمع کیا تھا اس کو اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) کے عنوان سے ترتیب دے کر کراچی یونیورسٹی میں پیش کر دیا۔ مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کے گائیڈ اور محترم غلام مصطفی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے مشاہیر ان کے ممتحن تھے۔ انہوں نے اس مقالہ کو بیحد پسند فرمایا اور پرزور الفاظ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے اس کے منظور کئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ یونیورسٹی نے ایوب صاحب کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کا اعلان کر دیا اور اس طرح وہ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر بنا دیئے گئے۔

ایوب صاحب میں دل و دماغ کی کئی خوبیاں تھیں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انتہائی سادہ مزاج تھے۔ نمود و نمائش نام کی کوئی چیز اُن میں نہیں تھی صاف دل اور صاف گو تھے۔ جس سے ملتے صاف دلی اور خلوص کے ساتھ کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو بر ملا اُس کا اظہار کر دیتے۔ بعض حضرات کو اُن کی صاف گوئی کھل جاتی لیکن ایوب صاحب اپنی عادت سے مجبور تھے وہ مصلحت کوشی اور زمانہ سازی نام کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے اور نہ ان باتوں پر عمل کرتے تھے۔

ایوب صاحب کو معروف معنوں میں مذہبی آدمی تو نہیں کہا جا سکتا تھا تاہم نہ وہ مذہب بیزار تھے اور نہ علماء سے سوءِ ظن رکھتے تھے اور نہ بے وجہ اُن کی مذمت کرتے۔ بلکہ علماء کے بارے میں انہوں نے جس قدر لکھا ہے اس کو دیکھ کر ایک اجنبی آدمی کو تو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی دینی ادارے کے ایسے فاضل ہوں گے جو لمبی ڈاڑھی اور شرعی لباس میں رہتے ہوں گے۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ ایسا ہوا ہے اور ان سے ملاقات کرنے پر حقیقت منکشف ہوئی۔

قدرت نے انہیں ذہن اور حافظہ دونوں سے نوازا تھا۔ اس پر ان کی کام کرنے کی عادت اور محنت کی دھن اور لگن نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو علمی دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے جتنی صلاحیتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب ایوب صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کی ایک خوبی ایسی تھی جو محنت اور اکتساب سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اس کو ایک قدرتی عطیہ ہی کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کسی بھی نئی کتاب کو جب وہ دیکھتے تو اس کے ورق الٹ پلٹ کر اور ادھر ادھر سے دو دو چار چار سطریں پڑھ کر وہ اس کتاب کے مضمون کو اس خوبی سے سمجھ لیتے کہ دوسرے

پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد بھی وہ بات حاصل نہیں کر سکتے تھے غالباً اسی وصف نے ان میں یہ ایک اور خوبی بھی پیدا کر دی تھی کہ جس چیز کی طرف مائل ہوتے اس کی جانب تھوڑی سی توجہ سے عبور حاصل کر لیتے چنانچہ علم عروض اور تاریخی مادے نکالنے میں انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کمال حاصل کیا کہ بعض اوقات تو ان کی اس خوبی پر کرامت کا دھوکہ ہونے لگتا تھا۔

ایوب صاحب کی ہر تحریر میں تحقیق کی شان پائی جاتی تھی۔ ان کو صاحب طرز ادیب تو نہیں کہا سکتا اور ہر مصنف یا محقق کے لئے صاحبِ طرز ادیب ہونا ضروری بھی نہیں ہے تاہم ان کی تحریر میں ڈھیلا پن، ابہام اہمال یا ژولیدگی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ اس میں گٹھاؤ اور زور پایا جاتا ہے اور وہ جو کچھ کہتے ہیں سادہ اور صاف الفاظ میں اور نہایت قطعیت اور اعتماد کے ساتھ یقین ہے کہ ان کی تحریریں آئندہ کے محققین و مصنفین کے لئے شمع راہ ثابت ہوں گی اور لوگ پورے بھروسے کے ساتھ ان کے حوالے دیا کریں گے۔ واحسرتا! ایک ایسی عزیز الوجود اور گرانمایہ ہستی ۲۵ نومبر ۸۳ء کو جمعہ کے دن تقریباً ۴ بجے شام ٹریفک کے ایک حادثہ کا شکار ہو کر آغوش لحد میں جا سوئی اور اپنے عزیزوں اور بیشمار ساتھیوں، دوستوں اور محبوں اور مداحوں کو سوگوار کر گئی۔ رحمتہ اللہ علیہ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

یوں تو افسانہ نگار سمجھا جاتا ہوں لیکن درحقیقت نثر نگاری کا رسیا ہوں اور اسی سلسلہ میں بارہ چودہ کردار نگاریاں قلم سے نکل گیئں جو ملک کے مشہور جرائد میں چھپیں، معز زحاضرین، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مولانا صلاح الدین احمد، جگر مرادآبادی، مولانا رازق الخیری اور مشاہیر ادبی میں شمار نہ کریں تو منشی جی فیض اللہ اور فخر تاریخ پروانہ ہائے شمع رسالت غازی عبدالرشید شہید، غازی علم الدین شہید، غازی عبدالقیوم شہید مرحومین سے متعلق ہیں۔ اور ایک بابائے افسانہ سلطان حیدر جوش سے متعلق زیر طبع ہے اور ان مرحومین کے علاوہ عمرت ہادراز و قلم زندہ ایک ڈاکٹر جمیل جالبی اور دوسری ضیا جالندھری کے متعلق ملک کے دو مشہور جرائد میں چھپ کر پسند کی جاچکی ہیں۔

اور زندگی کے اس گراں مایہ یادوں کے ذخیرہ میں اب اپنی بے آب دگیاہ زندگی میں یہی دو چار سہارے رہ گئے ہیں ......

اور اب کسی کسی وقت اپنی چاپ کان کے بالکل قریب، اور جیسے کوئی پکارتی سی آواز سنائی پڑ پڑ جاتی ہے۔ اللہ انھیں زندگی تندرستی اور قلمی و

علمی فراغت دے۔ یوں تو بہت آئے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں لیکن ایوب قادری تو نہ تیار تھا اور نہ ہم ہی اس کے مرثیہ کے لئے تیار تھے، اور وہ چلا گیا۔

حالانکہ وہ مردم خیز شہر بدایوں کے ساکن نہ تھے۔ ان کی پیدائش آنولہ ضلع بریلی میں ہوئی۔ اس طرح وہ قصباتی مصاقاتی تھے۔ جو شہر بدایوں سے ۱۶ میل شمال میں (روہیلہ دور کے خطاب) "حکیم"، روسائے عظام اور سوداگرانِ پنجابی مالداروں کی بستی ہے۔ ویسے تو اول الذکر کوئی کام نہیں کیا کرتے مگر شمالی ہند میں قصبہ آنولہ کے روسا پطوں کی کاشت میں شوقیہ دلچسپی لیتے تھے۔ خصوصاً اعلیٰ قلمی آموں سے متعلق اُن کی تحقیق سے آنولہ کا قصبہ کو سٹی آف فروٹس بنا دیا تھا اور یہی قصبہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی جائے پیدائش تھا۔ ان کے والد شیخ مشیت اللہ قادری اسی قصبہ کے متوسط حیثیت کے (سوداگر پنجابی نہیں) مگر درمیانی تجارت پیشہ تھے اور روسائے قصبہ زمیندار اور سوداگران پنجابی دونوں متضاد طبقوں میں عزت اور ساکھ کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جیسے کہتے ہیں "کھاتے پیتے ذی عزت آدمی تھے"

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تعلیم و تربیت شہر بدایوں ان کی ننہالی قرابت داروں میں ہوئی۔ ان کے نانا میاں جی احمد حسن بدایوں شہر بلکہ شاید اپنی ڈویژن بھر کے پروفیسر جادر چند حکم ورتی ماہر ریاضی مانے جاتے تھے۔ کسی ورناکیولر مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ بدایوں شہر اور مضافات کے ریاضیات کے ٹیوٹر تھے اور شاید اپنے وقت کے سب سے گراں مشاہیرہ لینے والے، ہزاروں لاکھوں کی ضرب تقسیم زبانی لگانے کے شعبدے دکھلایا کرتے اور الجھے سے الجھے ارتھمیٹک کے سوال سلیٹ پر چٹکیوں میں حل کر دیتے۔ انگریزی میں شُدبُد تھی۔ لیکن سن کر ارتھمیٹک کا انگریزی زبان کا سوال آن کی آن میں ذہن نشین کر لیتے۔ اور باتوں ہی باتوں میں حل کر دیتے۔ میاں جی بچپن، لڑکپن میں میرے ٹیوٹر

رہے۔ اور میں بدنصیب ان کے مضمون سے نابلد ہی رہا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر یا ماسٹر نظیر احمد ان کے ماموں (غالباً رشتہ کے) میرے بڑے بھائی کے کالج کے ہم جماعت رہے تھے۔ میرے بڑے بھائی ایل ایل بی کر کے وکیل بنے اور یہ بی اے ایل ٹی کر کے گورنمنٹ بدایوں اسکول میں جغرافیہ کے ٹیچر لگے اور یوپی کے کئی اضلاع میں گورنمنٹ ہائی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہو کر ریٹائر ہوئے اور اس تعلیمی ماحول میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

ان کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے حافظ صدیق مشن اسکول (بعدہٗ کالج) میں انٹرمیڈیٹ تک ہوئی۔ وہ میرے بھتیجوں بھانجوں کے ہم جماعت اور انٹر کالج تک اسکول کے ساتھی رہے۔ اور انہیں نوخیزوں کے توسل سے مجھ سے اور میرے والد چودھری ابوالحسن صدیقی بصیر بدایونی تک دید و شنید اور رسائی ہوئی۔ جان پہچان گو فاصلہ والی خوردانہ بزرگانہ تھی مگر دور کی علیک سلیک تک محدود نہ رہی۔ نوخیز ایوب قادری میں بزرگ قربتی کا سراغ ملا خوردانہ بزرگانہ روابط سے ہو گئے۔ ساتھ ہی خورد نوازی اپنا بھی شعار تھا۔ اور کالج کے خوردوں میں ہمیں ایوب قادری کا رکھوا سا مٹر کا نامستقبل کا پروفیسر اور پھر ڈاکٹر ایوب قادری نظر آیا۔ گاہے گاہے ملاقاتیں اس زمانے میں بھی معمول رہیں اور پھر جیسے اسی وضع دارانہ انداز میں کراچی میں بھی ان کا اور میرا معمول رہیں جس طرح بدایوں میں ہوتی تھیں۔ مگر جب خوردانہ بزرگانہ ہی تھیں، لیکن اب مساویانہ، چھوٹے بڑے بھائیوں جیسی وضع دارانہ .... کبھی کبھی وہ بدایوں شہر سے میرے نواحی گاؤں (صرف تین فرلانگ پار عارف پور نوادہ) میرے یہاں آنکلتے اور حسنِ اتفاق سے کم و بیش یہی دوریوں کے شہر کراچی میں بھی ان کا معمول رہا۔ کراچی میں میرے یہاں بالعموم سہ پہر کو مہینہ پیچھے دو چار مرتبہ آتے۔ یا گاہے گاہے کسی ان کی چھٹی کے دن علی الصبح جب میں ٹہلنے کے موڈ میں ہوتا تو ان کے یہاں جا دھمکتا۔ دیر تک ادبی گپ شپ رہتی۔ میرے یہاں رات گئے تک اور

ان کے یہاں دوپہر تک جیسا کچھ بدایوں میں معمول تھا، کراچی میں رہا۔ اور اس میں جیسے
اسی وضع دارانہ عادت کو دخل تھا۔

ویسے تو وہ اردو کے پروفیسر تھے اور ڈاکٹریٹ میں بھی ان کا تھیسس اردو نثر
کے ارتقا میں علماء کا حصہ ۱۸۵۷ء تک ہے۔ مگر "دلیٹر موغلس"، اورنگ زیب کے بعد
زوال پذیر تاریخ ہندوستان اور تاریخ روہیلہ سرداراں پر اُن کی نگاہ عمیق تھی۔ ان کے
اگرچہ تاریخ ان کا موضوع نہ تھا۔ لیکن اس
دور کی معتبر مفصل تاریخ پر معلومات نہایت عمیق اور مستند تھیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کی ایک اور صفت علمی کی جانب ایک روز بر سبیل تذکرہ
نشاندہی کی جس کا مجھے بھی کچھ اندازہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ایوب قادری علم الرجال
میں بے اندازہ معلومات کے حامل ہیں۔ اور لطف یہ کہ تاریخ وار مفصل و مستند۔ اور اس
سلسلہ میں بعض غیر معروف سے بھی لوگوں کے متعلق میں نے ان سے بات کی تو انھیں حیرت
انگیز طور پر نام کے ساتھ ان کے حالات و کوائف سے آگاہ پایا۔ ورنہ مشاہیر کو کون نہیں
جانتا۔

ایک صاحب کے متعلق جو علیگڑھ کالج کے اس صدی کے اوائل دور کے "FUNNY"
قسم کے ڈپٹی کلکٹر تھے، میں نے ایک مزاحیہ انداز میں مضمون لکھ کر حلقہ اربابِ ذوق
کی نشست میں سنایا۔

ظاہر بات ہے موصوف کی معلومات ان بزرگ سے سطحی سنی سنائی تھی اور میری بھی
ایسی ہی تنقیدی بحث کے دوران انھوں نے ان کا نام، ان کے بھائی کا نام، جو ڈپٹی کلکٹر
تھے۔ اور ان کے ریٹائرمنٹ کے حالات بتائے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے بھائی کے بھی
"FUNNY" قسم کے کئی واقعات بتائے۔ حتیٰ کہ ایک ضلع بدایوں کے شوقین بوڑھے ماہر
نجوم جو چھوٹے سے زمیندار تھے اور ان کا اکلوتا بیٹا گھوڑے سے گر کر ریڑھ کی ہڈی سے

معذور مدّتوں سے صاحب فراش تھا اور معالجین اطبائ نے اس کی موت کی پیشنگوئی اور تقریباً مدّت تخمینی کا بھی تعین کر دیا تھا۔ اور بوڑھا بدنصیب ماہر نجوم اپنی موت اور اپنے بیٹے کی موت کی تقدیم و تاخیر کا حساب کتاب لگا کر خود پہلے مرنے کی آرزو کیا کرتا۔ اور طرح طرح سے اپنے پہلے مرنے اور بیٹے کی موت کے داغ سے بچنے کی آرزو میں کھینچ تان کر اپنی موت کا میزان بیٹے سے پہلے لگانے کی کوشش کیا کرتا۔ ان کے شاگردوں اور نجوم کے شائقین کا روہیل کھنڈ بھر کے چھیوں اضلاع اور ریاست رام پور میں شہرہ تھا۔ کبھی کبھی میرے یہاں بھی آیا کرتے۔ دو چار شاگرد ساتھ لگے رہتے۔ میرے والد صاحب قبلہ سے ہم شہری کے روابط تھے۔ کئی کئی دن ہمارے یہاں بھی اچھی لمبی نشست نجوم کی گپ شپ ہوجاتی۔ ثقل سماعت کا شکار تھے۔ میں بھی ان کے درمیان جا بیٹھتا۔ باتیں دلچسپ ہوتیں۔ ایک روز والد صاحب قبلہ نے ان کے بیٹے کی موت کے متعلق حساب کتاب کا ذکر چل پڑنے پر تقریباً زیر لب یہ شعر مجھ سے مخاطب ہو کر پڑھا۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

تو ثقلِ سماعت کے باوجود سن لیا۔ اور رو پڑے وغیرہ وغیرہ ۔ کچھ عرصہ قبل کسی المیہ افسانہ کے لئے یہ مواد میری گانٹھ میں سے ابھر رہا تھا۔ اور میرے موضوعات تو میرے پڑھنے والے جانتے ہی ہیں کہ اپنے ہی ہوتے ہیں۔ اور ابھی سیکڑوں میری انٹی میں لگے ہیں۔ بھوک اور جنس بھی ہوتی ہے تو میرے اپنے زاویۂ نگاہ اور ٹریٹ مینٹ سے ہوتی ہے اور خواہ یقین کریں یا نہ کریں، میری ہر تحریر ذراسی زیب داستاں کے ساتھ غیر ذاتی تجربہ ورنہ کم از کم آنکھوں دیکھا سنا حال ہوتی ہے۔ یہ باپ بیٹے کی موت کی تقدیم و تاخیر کی کہانی کئی روز سے میرے ذہن میں باز گشت کر رہی تھی۔ اوّل تو کوئی چیز بڑی مشکل سے ملتی ہے اور قلم لکھنے نہ لکھنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اور میں کاغذ قلم دوات کے حیلوں بہانوں کی

کشمکش میں تھا کہ گاہے گاہے معمول کے مطابق ڈاکٹر محمد ایوب قادری آ پہنچے۔ چلو آج تو پناہ ملی۔ کچھ زیادہ ہی تپاک سے لیا۔ اور اس پناہ گیری کے لئے انھیں رات گئے تک بٹھایا بھی۔ ظاہر بات تھی، بات ان نجومی کے متعلق ہی چلی۔ اور یہ ۲۵-۱۹۲۴ء کا واقعہ تھا جب ان کا بیٹا گھوڑے سے گر کر صاحب فراش ہوا۔ تاہم مجھے حادثہ کی نوعیت کا علم تو تھا مگر یہ پتہ نہ تھا کہ باپ پہلے فوت ہوا یا بیٹا۔ اور کہانی نہ شروع کرنے کے لئے خوئے بد را بہانہ بسیار یہی بہتر تھا۔ ذکر میں ذکر چل پڑنے اور "ان دنوں کیا لکھ رہے ہو؟" کے رسمی یا ادیب سوال پر میں نے بتایا کہ ایک واقعہ ذہن کی بازی گاہ بنا ہوا ہے۔ مگر بات بنائے نہیں بنتی اور "بہانہ بسیار" یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ میرے والد کے گاہے گاہے ملنے والوں میں تھے۔ اور واقعہ یوں تھا...... اب بات بنائے نہ بنے، یہ ہے کہ نہ تو مجھے یہی پتہ ہے کہ باپ کا نام کیا تھا۔ خیر یہ بھی بیکار سی بات ہے کچھ لکھ دوں لیکن رکاوٹ یہ ہے کہ یہ پتہ نہیں کہ باپ پہلے فوت ہوا یا بیٹا پہلے داغِ مفارقت دے گیا۔ جس سے بدنصیب باپ کا بیٹا تھا۔ اے لو، ایوب قادری تو اس بدنصیب باپ بیٹے دونوں کے نام سے واقف نکلے۔ اور یہ کہ بیٹا یوں لمبی مدت حادثہ میں صاحبِ فراش رہا۔ اور یہ کہ باپ کا نام نیاز محمد خاں اور شوقین مشہور نجومی تھے وغیرہ وغیرہ ساتھ ہی یہ بھی کہ ایک دن کے اندر تقریباً ایک ہی وقت میں باپ بیٹا دونوں کی موت ہیضہ سے واقع ہوئی۔ نیز یہ بھی بتایا کہ بیٹا ادھر بستر پر پڑا اپنی موت کی پہلے آرزو کیا کرتا تھا کیونکہ باپ ہی گھر کے اندر معذور محض بیٹے کی تیمارداری اور خدمت کیا کرتا تھا۔ اور ہیضہ کی بیک وقت موت میں ایک دن اس طرح فوت ہوئے۔ لطف یہ کہ نہ تو باپ کی وفات کی خبر بیٹے کو ہوئی نہ باپ ہی کو بیٹے کی۔ یہ ۲۴-۱۹۴۱ء میں بدایوں کے مضافات میں ہیضہ کی وبا پڑنے کا واقعہ ہے۔ جب ہیضہ کی ویکسین ایجاد نہیں ہوئی تھی اور گھر کے گھر لقمۂ اجل بنے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری معلومات کا خزینہ تھے۔ اور علم الرجال ان کی مہارتِ خاص تھی۔ جب بیٹھتے تو غضب شب میں سابق اور حال کے بیسیوں لوگوں کے متعلق ایک نشست میں معلومات بہم پہنچتی۔ مشاہیر ادبا کے کرداروں کو تو سبھی جانتے ہیں لیکن اچھوں بروں کسی کے بھی متعلق ذکر آیا تو انھیں انسائیکلوپیڈیا پایا۔ ذہن اور حافظہ میں غضب کی مماثلت تھی۔

اور مطلب کی جیسے گانٹھ باندھ لینے میں ید طولیٰ حاصل تھا

جسے انگریزی میں پبلک ریلشنگ کہتے ہیں اس میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور ذرا سا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ انہیں پروفیسر شمیم احمد کرم کتابی کہا کرتے تھے اور کتابوں میں سے بھی مطلب مطلب کہ جیسے آپ ہی آپ ان کی گانٹھ میں بندھ کر ہضم ہو جاتی تھی۔

مرزائیوں کو خارج از اسلام کرنے میں یوں تو بڑے بڑے لکھاڑیوں کا دعویٰ ہے لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ پکے مسلمانوں کی حیثیت سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اپنی نوعیت کا کارگر رول ادا کیا اور یہ ان کی ذہانت اور حافظہ اور مفصل مطالعہ کی سچی کرامات تھی۔ اس مبارک تاریخی سال میں پرانے اخباروں اور حافظہ کے محافظ خانہ کی بستیوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نبوت کے اس ہیڈ پوپ، انگریزی جبی کے متعلق ایسے ایسے بیش بہا خطوط تحریریں درخواستیں جو اس نے اپنے دور کے اکابر انگریز حکام کے نام لکھی تھیں، برآمد کیں کہ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کی روح بھی اپنے اس سپوت فرزند کے کارنامہ سے پھڑک اٹھی ہو گی اور لطف یہ کہ نہ معلوم کب سے جانے پڑے تھے۔ ایک مرتبہ بھٹو دور میں جب یہ تحریک چل رہی تھی تو میرے یہاں ایک نشست میں اظہارِ خیال کیا تھا لیکن وقت کے منتظر تھے۔ اور نشانہ پر صحیح وقت پر تیر مارا۔

ایسے گاہے گاہے آنا جانا اور لمبی نشستیں جیسا کہ بیان کیا ہمارا معمول تھا۔ لیکن ابھی

ادھر تین چار سال کے اندر اسلام آباد اہلِ قلم اجتماعات کے اندر مختار زمن نے ان کے ایک خاص رخ کی جانب نشاندہی کی۔ جب وہ اور ہم اسلام آباد ہوٹل میں مقیم رہے۔ یہاں میل ملاپ کا سماں ہوتا ہے۔ ہم سب مدعوئین اپنے اپنوں کے درمیان ٹھہرتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں، بچھڑتے ملتے ہیں۔ دکھ درد کی فضا ہوتی ہے۔ اور کبوتر با کبوتر باز بہ باز فطرت انسانی ہے مگر اندازہ ہوا کہ ایوب قادری قیام کے کمرے، کھانے، ناشتے کے میزوں اور کوریڈر کی نشستوں میں، اجلاس کی سیٹوں پر ہر موقع پر معروف، ذرا کم معروف اور غیر معروفوں کے درمیان نظر آتے۔ اور بالعموم اندرون ملک سے آئے ہوئے اہلِ قلم ہوتے۔ اور ہمیں اندازہ ہوا کہ مرحوم اس اجتماع کا صحیح صحیح حق ادا کرتے اور ان کی پبلک ریلشنگ طبیعت کا تقاضا تھا۔ اور بقول جمیل جالبی اسی میں علم الرجال کی مہارت کا راز تھا۔ ذہن اور حافظہ میں بے اندازہ مماثلت تھی۔ کسی کو بھولتے نہ تھے۔

ایک شام ذرا دیر سے میرے یہاں پہنچے۔ بڑے اچھے سوٹ میں ملبوس تھے۔ میں نے لباس کی شانِ نزول پر مزاحیہ تبصرہ کیا تو بتایا کہ کالج میں میٹنگ سے واپس آرہا ہوں دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا پھر یاد نہ رہا۔ ہاں ہاں تمہیں کسی سلسلہ میں تمغہ ملنا تھا۔ لاؤ دکھاؤ تو۔ میرے اصرار پر جیب سے تمغہ نکال کر دکھلایا اور تمغہ پوشی کا سلسلہ بتایا۔ میں نے تمغہ گلے میں ڈال دیا تو شرما سے گئے اور آداب کیا۔ لیکن ایک روز بہت ہشاش بشاش پہنچے ایک دن قبل ان کا تھیسیس منظور ہوا تھا اور بورڈ کے روبرو انٹرویو ہوا تھا۔ ابواللیث صدیقی شاید چیرمین تھے۔ ذرا تفصیل سے حال سنایا اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بورڈ میں مٹھائی کا ڈبہ لے کر آئے اور بہت خوش تھے۔ وہ مصنف، مولف، مترجم سبھی کچھ تھے۔ ٹھیک ٹھیک کتابی معنی پر اترتے ہوئے دانشور تھے۔

وہ بڑے ذہین اور صاف گو ناقد تھے۔ مجھے اور میرے خاندان کو لڑکپن سے

جانتے تھے۔ اور میرے خاندانی خطاب سے پکارنے والے پاکستان میں واحد آدمی تھے۔ ورنہ اور سب معاصرین صدیقی صاحب سے جانتے تھے۔ وہ چودھری صاحب پکارتے تو میں چونک پڑتا..... دوستوں کے دوست اور دشمن تو دشمن۔ مخالف اور شاکی بھی کسی ایک کے نہ تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور علم الرجال کے علاوہ علم مجلسی کے ماہر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ صحبت سوسائٹی میں بیٹھ کر بر کھ میں طاق تھے۔ ان کی موت بھی عجیب انداز میں ہوئی۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی نعمت اللہ قادری کی طرح کراچی کے ٹریفک کی ستم کاری اور حادثہ کی ستم ظریفی کہ سہ پہر کے وقت کسی دوست سے ملنے کے لیئے عصر کی نماز پڑھ کر نکلے اور کسی گاڑی کی زد میں سڑک پار کرتے ہوئے آگئے۔ جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں کل نفس ذائقۃ الموت

سوئم کے روز ان کے مکان پر پہنچا۔ سامنے کی سڑک کراچی بھر کے اساتذہ برادری، ان کے شاگردوں اور ان کے اعزا سے بھری ہوئی تھی۔ بالعموم اسی وقت ان کے یہاں اپنے گھر سے ٹہلتا ہوا پہنچا کرتا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ کلام اللہ یا تفسیر کی گردان کر کے اوپر سے اتر کر مجھے بہت خوش ہو کر اوپر لے جایا کرتے۔ تقریباً دوپہر تک نشست رہتی۔ موضوع منبر پر رکھی تفسیر سے شروع ہوتا اور پھر کسی ادبی گپ شپ پر ختم ہوتا۔ لیکن آج میں نے دروازہ کی گھنٹی نہ دبائی نہ وہ اترے۔ ہمارے ان کے درمیان زندگی کا باب بند ہو چکا تھا۔ خیر فاتحہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا واپس چلا آیا۔ اور خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، سبھی کو کہا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت ان میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اور یہ خسارہ شاید اردو زبان مشکل ہی سے پورا کر سکے گی۔ کیوں کہ بقول مرزا غالب ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

محمد محی الدین بدایونی

پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری کی یاد میں

قادری آہ انتقال نمود! اس مصرع سے عہد اکبری کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کا سنِ وفات نکلتا ہے۔ قادری ان کا تخلّص تھا۔ قطعۂ تاریخ حسین قلی خاں شیفتہ اصفہانی نے نظم کیا تھا۔ یہ مصرع اضطراری طور پر میری زبان پر آگیا جب ۲۶ر نومبر ۱۹۸۳ء کی صبح کے اخبار نظر سے گزرے۔ لیکن اس کا محرک ملا عبدالقادر کی ذات نہیں بلکہ میرے عزیز پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری تھے۔ اخباروں کے سرورق پر یہ جاں گداز خبر تھی کہ مشہور محقق اور دانشور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کل ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہوش گم ہوگئے، کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دل شکوہ سنج ہوا کہ الٰہی یہ بے ہنگام المیہ بھی ہمارے نصیبوں میں لکھا تھا۔

یہ تمہید مجھے ایوب قادری سے اپنی ایک ملاقات کی یاد دلاتی ہے۔ ۱۹۷۹ء کی گرمیوں کا کوئی دن تھا۔ باتوں باتوں میں ان سے میں نے پوچھا۔ کیا ملا عبدالقادر کی سوانح عمری بھی کسی نے مرتب کی ہے۔ اور اسے ترتیب دی جائے تو ضروری مواخذات کیا ہوں گے؟ انھوں نے برجستہ کہا کہ ملا کی سوانح حیات خود ان کی تصنیف "منتخب التواریخ" سے بخوبی اخذ کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات اور اپنے محاربات کا تذکرہ اس میں جگہ جگہ تفصیل سے کر گئے ہیں۔ پھر کتابوں کی الماری سے ایک رجسٹر نکال لائے۔ ایک دو جگہ سے اسے پڑھ کر سنایا۔ اس رجسٹر میں "منتخب التواریخ" سے ملا کی ذات سے متعلق اقتباسات تھے جو انھوں نے درج کر رکھے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ مسودہ کب مرتب کیا۔ بولے جب

وہ بدایوں میں قصبہ اوجھیانی میں مقیم تھے۔ میں نے کہا کہ وہ تو کم و بیش ان کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت یہ مشکل کام انھوں نے کیونکر انجام دیا۔ بولے، ہاں بس ہو گیا۔

دراصل علم ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور تصنیف و تالیف کا روگ انھیں بچپن ہی سے لگ گیا تھا۔ وہ بے شک پیدائشی عالم تھے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو جب ضلع بریلی کے تاریخی قصبہ آنولہ میں پیدا ہوئے، اس وقت وہاں کے عالم اور بزرگ مولوی حکیم عبدالغفور نے ان کے کان میں اذان دی۔ انھیں بزرگ نے ان کی تاریخ پیدائش "چراغِ علم" سے نکالی۔ افسوس یہ ستارہ ستاون سال روشن رہ کر دفعتاً گل ہو گیا۔

مرحوم کی شکل آنکھوں میں پھرتی ہے اور آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ گو عمر ۵۷ سال تھی لیکن چہرے مہرے اور چال ڈھال سے ۵۴ سے کچھ ہی اوپر معلوم ہوتے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ان میں کسی نمایاں تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت کی لگام کو انھوں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ درمیانہ قد کسی قدر درازی مائل، گندمی رنگ، متناسب ناک نقشہ، دہرا جثہ، لباس سادہ اور ستھرا، آواز میں کھنکار، گفتار میں زیرِ لب بغیر ارادی ہلکا سا تبسم، شرافت کا پیکر، چال تصنع سے پاک۔ مگر وہ اس وقار سے چلتے جیسے کشاں کشاں اپنے منزلِ مقصود کی طرف جا رہے ہوں۔ جو لفظ بولتے، جچا تلا ہوتا۔ ان کی ہر بات ان کی خود اعتمادی پر دلالت کرتی۔ وہ اپنے سامعین کے دل میں یک گونا اعتبار پیدا کرتے تھے۔ ہمیشہ چاق و چوبند، انتہائی مستعد اور محنتی۔ نہ دن دیکھتے نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش نہ آندھی۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے اور اپنی دھن میں مگن رہتے۔

ان کی قوتِ ارادی بے پناہ تھی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے، پورا کر دکھاتے چاہے کتنی دشواریاں راہ میں حائل ہوتیں۔ علمی کام کے تو وہ تہجد گزاروں میں تھے۔ دن تدریس، مطالعہ اور ملاقاتوں کے لیے وقف ہوتا۔ وہ بڑے سیلانی تھے۔ احباب سے ملاقات کے لئے ہمیشہ آتش زیر پا رہے۔ بقول غالب ؎

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اسی دھن میں کراچی کے لمبے لمبے ظالم فاصلے وہ خندہ پیشانی سے طے کرتے تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ نہ کبھی نہ ملنے کی شکایت کی نہ وقت کی تنگی کی۔

ان کی تقریریں تحقیقی اعتبار سے اپنی موضوع پر حاوی ہوتی تھیں۔ وہ جو کچھ کہتے مدلل کہتے، برملا کہتے، برجستہ کہتے، برمحل کہتے۔ ہر چند کہ ان میں جوشِ خطیبانہ نہیں تھا، بلکہ ان کا لفظ لفظ دل میں اتر جاتا تھا۔ اسی طرح جیسے کلاس روم میں کوئی لائق استاد لکچر دے رہا ہو۔ علمی اور تاریخی دیانت داری ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ اپنا مطلب وہ اتنے وثوق اور طمانیت سے بیان کرتے کہ سامعین حظ اٹھاتے۔ ان کی تحریر کی طرح ان کی تقریر میں بھی کہیں جھول نہیں ہوتا۔ انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کی متعدد اعلیٰ سطحی کانفرنسوں میں شرکت کی اور ہر موقع پر اپنی تحریر و تقریر کا لوہا منوایا۔ مشاہیر کے گروہ میں وہ ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھے گئے۔ اور ہمیشہ سربلند رہے۔

وہ سید الطاف علی بریلوی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ تہائی صدی سے اوپر ان کی رفاقت رہی۔ اس کا مختصر حال خود سید صاحب کی زبانی سنئے:

"پروفیسر قادری کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں دیکھا تھا جبکہ پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس آنولہ ضلع بریلی میں مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ایوب قادری اس وقت ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ انھوں نے جلسہ گاہ سے متصل اپنی کتابوں کی نمائش ایک دکان میں لگائی تھی اور مجھے بطور خاص دکھانے لے گئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آنے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ایوب قادری میں علمی جذبہ، لگن اور تجسس کا مادہ موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے میرے بتائے ہوئے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ اور ان کے تحقیقی مقالوں کی ملک میں دھوم مچ گئی۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ ذہین اور طباع نوجوانوں کو بڑھانے

کی کوشش کرتا ہوں۔ ایوب قادری کو قدرت نے ایک جوہر قابل بنایا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ اپنا میدان خود تلاش کرنے لگے۔ میری ناچیز گزارش پر ڈاکٹر معین الحق صاحب سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ایوب قادری صاحب کو اپنے اسٹاف میں بہ طور ریسرچ اسکالر شامل کر لیا یہاں ان کے مزید جوہر کھلنا شروع ہوئے۔"

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے مولوی رحمٰن علی کی فارسی کتاب "تذکرۂ علمائے ہند" کا اردو ترجمہ جب ایوب قادری کے نام سے شائع ہوا تو دانشوروں کی نگاہیں ان پر پڑیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ادبی اور علمی افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا۔ یہ ترجمہ مقبول ہوا اور اس نے سند کی صورت اختیار کر لی۔ ممتاز مصنفین اپنے مضامین میں اس اردو ترجمے کا حوالہ بڑے وثوق سے دیتے ہیں۔ پھر صمصام الدولہ، شاہ نواز خاں کی ضخیم اور مشہور عالم تصنیف "ماآثر الامراء" کا اردو ترجمہ مع حواشی کے انھوں نے مرکزی اردو بورڈ سے تین جلدوں میں شائع کرایا۔ اس ترجمہ نے دھوم مچا دی۔ اگر ایوب قادری اس کے علاوہ کوئی علمی کارنامہ نہ بھی انجام دیتے تو یہ قدیم فارسی سے جدید اردو میں ان کا ترجمہ تحقیق، تاریخ اور تصنیف کی دنیا میں انھیں شہرت دوام دینے کے لئے کافی تھا۔ اس سے پہلے اسی قبیل کی ایک تصنیف "وقائع عبدالقادر خانی" کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا۔ یہاں بھی ایوب قادری کے حواشی قابل ستائش ہیں۔ دراصل حاشیہ نگاری اور اشاریہ نویسی ان کا طرۂ امتیاز تھا جہاں قابل مصنف کچھ چھوڑ گیا یا اسے کوئی شک یا سہو ہوا، ایوب قادری حاشیہ میں اس کمی کو بہ طریق احسن پورا کر دیتے تھے۔

ایوب قادری نے تحقیق کے میدان میں بڑا دور رس ذہن پایا تھا۔ تاریخی واقعات اور رجال کو پرکھنے کا جیسا ملکہ انھیں تھا اب وہ کم دیکھنے میں آتا ہے۔ مستند حوالے وہ کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے اس کی داد دینا مشکل ہے۔

۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ پروفیسر ضیاء احمد مرحوم کے ایما پر انھوں نے "تذکرۂ شعرائے بدایوں" ترتیب دینا شروع کیا۔ ایک دن اس موضوع پر میں مولوی سبطین احمد مرحوم سے بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اتنا زمانہ بیت چکا، انقلاب آیا، ذاتی کتب خانے اور غیر مطبوعہ دیوان تیار ہو چکے۔ ان حالات میں یہ ناممکن سا کام نظر آتا ہے۔ سبطین صاحب نے بڑے وثوق سے کہا کہ ایوب قادری اسے کر لیں گے اور پھر وہ بولے "وہ بڑے کھوجو ہیں، "کھوجو" ایوب قادری کے جذبۂ تحقیق کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس تذکرہ کے سلسلہ میں وہ بدایوں بھی گئے اور بہت کچھ مالِ غنیمت ساتھ لائے۔ بالآخر تذکرہ انھوں نے مکمل کر ہی لیا۔ میں نے تو اُن کے تجسس اور جانفشانی پر عش عش کیا۔

معلومات کا وہ جیتا جاگتا کمپیوٹر تھے۔ اِدھر سوال کیجئے اُدھر جواب پایئے۔ چند مثالیں حاضر ہیں۔

(۱) ایک بار مجھے ملّا عبد القادر بدایونی کے سلام کی ضرورت پیش آئی اس سلام کا مصرعِ اوّل ہے ع

اے صبا! از من بگو اہلِ بد اون را سلام

اس میں بدایوں کے قدیم خاندانوں کا تذکرہ طنز و توصیف کے ساتھ ملّا نے فارسی میں بڑے دلچسپ پیرایہ میں نظم کیا ہے اور یہ سلام اب نایاب ہے۔ ایوب قادری سے بات کی۔ دوسرے ہی دن یہ طویل سلام انھوں نے ضروری حواشی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج دیا۔

(۲) ۱۹۲۰ء میں تقسیم ہند کا تصوّر مع جزئیات کے بدایوں کے اخبار ذو القرنین میں شائع ہوا تھا۔ شریف الدین پیرزادہ نے اپنی تصنیف EVOLUTION OF PAKISTAN میں یہ تاثر دیا ہے کہ یہ منصوبہ گمنام تھا۔ میرے علم میں تھا کہ اس کے مصنف عبد القدیر بلگرامی تھے۔ ایوب قادری

سے میں نے وضاحت چاہی۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ وہ اس مسئلہ پر ضروری تحقیق کر چکے ہیں۔ دراصل یہ منصوبہ قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی نے بنایا تھا۔ وہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اس لئے اپنے نام سے شائع نہیں کر سکتے تھے۔ عبدالقدیر بلگرامی ان کے بھائی تھے اور سرکاری بندش سے آزاد۔ یہ منصوبہ انھوں نے اپنا کر اپنے نام سے شائع کیا اور اصل مصنف گمنام ہی رہا۔ اسی وجہ سے پیرزادہ نے اسے گمنام تصور کیا ہے۔

(۳) ایک بار میں سید محفوظ علی مرحوم کے ایک مضمون کا ایک جائزہ لے رہا تھا۔ سید صاحب نے اس مضمون میں چند سیاسی اکابر اور مشہور زمانہ اخبارات کا تذکرہ ایک مخصوص چیستانی انداز میں کیا ہے۔ ان کی رمزیہ تحریر کا حل میں نے نکال لیا۔ بس ایک جگہ اٹک گیا۔ سید صاحب کی پہیلی تھی۔ "وہ سابق آنریبل و حال حاجی جانثار خاں مدیر، جو نام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلف ہیں اور جو مرغیوں کی سوانح عمری لکھتے ہیں اور وفاداری پر مضمون چھاپتے ہیں"۔ ایوب قادری نے چھان بین کر کے بتایا کہ یہاں مراد ہیں "حاجی نواب اسمٰعیل خاں شیروانی رئیس دتاولی، علی گڑھ تحریک کے حامی و مددگار، کچھ عرصے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مدیر رہے۔ معارف، افادہ اور العزیز پرچے نکالے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں تربیت الدجاج، خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس کی طرف اشارہ (مرغیوں کی سوانح عمری) کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں آگرہ میں انتقال ہوا۔"

تحقیق کے میدان میں انھیں قدرت نے بڑا اخاذ ذہن عطا کیا تھا۔ ایک بار بدایوں میں مولوی محمد سلیمان مرحوم کے ہاں محفل جمی تھی۔ بات یہ نکلی کہ جب کوئی شخص یا ملازم کسی کام میں جاتا ہے اور جلد واپس نہیں آتا تو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں "وہ اوجھ گیا"۔ سوال یہ تھا کہ یہ گھریلو محاورہ کی وجہ کیا ہے۔ ایوب قادری بولے کہ بدایوں کی طرح اوجھ

بھی بزرگانِ دین کا مرکز رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بدایوں کا آنا جانا اوچھ تھا اور جو وہاں جاتا وہ فاصلہ اور رسوماتِ زیارت کی طوالت کے باعث زیادہ دیر ہی میں واپس آتا تھا۔ اور جب واپس آتا تھا تو اگر کوئی پوچھتا کہ بڑے دنوں بعد نظر آئے تو معاً کہہ دیا جاتا "یہ اوچھ گئے تھے"۔ یہ دیری ضرب المثل بن گئی۔ بات ذہن نے قبول کی۔ میں نے عرض کیا کہ "مرملتان گئے" بھی اسی قبیل کا مقامی محاورہ معلوم ہوتا ہے۔

ایوب قادری صاحب نے اپنی زندگی کے آخری سال بڑے کرب میں گزارے پہلے ان کا جوان بیٹا زبیر ناگہانی طور پر اللہ کو پیارا ہوا۔ پھر ان کے حقیقی بھائی نعمت اللہ قادری حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ وہ کتنے دل گیر تھے اس کا اندازہ ان کی کتاب "کاروانِ رفتہ" کے سر آغاز سے ہوتا ہے۔ تحریر فرمایا۔

"اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر مجھے اپنے چھوٹے بھائی محمد نعمت اللہ قادری مرحوم کی یاد بے چین اور بے قرار کئے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ مرحوم اکو اپنی رحمت سے نوازے"۔

واقعات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جب یہ کتاب چھاپہ خانہ سے باہر آئی تو خود جاں بار محمد ایوب قادری "کاروانِ رفتہ" میں شامل ہو چکے تھے۔ انھوں نے بھائی کی سنت ادا کی اور ان کی طرح ٹریفک کے حادثہ ہی کا شکار ہوئے۔

ایوب قادری آخر دم تک فعال رہے۔ جب موت ان کے سر پر منڈلا رہی تھی اس دن انھوں نے غسل کیا، دھلے کپڑے پہنے، نماز جمعہ ادا کی کھانا کھایا، اور دوستوں سے ملاقات کو باہر نکلے۔ کہتے ہیں ایک سفید رنگ کی موٹر گاڑی نے انھیں ہلاک کیا اور وہ فرار ہو گئی۔ کوئی نمبر بھی نوٹ نہ کر سکا۔ بھلا موت کے فرشتے کا کوئی نمبر ہوتا ہے!

اپنی کتاب "غالب اور عصرِ غالب" مجھے اس تحریر کے ساتھ بھیجی۔

"۱۹ راگست ۸۳ء

محترمی   سلام علیکم

باوجود دلی خواہش اور ارادے کے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اپنی کتاب خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ رائے اور رسید سے مطلع فرمایئے

میں نے وحید احمد (شیخوپورہ) پر ایک مضمون لکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ

اشاعت سے پہلے آپ ایک بار پڑھ لیں۔ کیا صورت اختیار کی جائے۔

فقط والسلام

خاکسار

محمد ایوب قادری "

اس تحریر پر مناسب کارروائی ہوئی۔ متعلقہ مضمون "سہ ماہی اردو"

میں اشاعت پذیر ہوا۔ لیکن ہیہات ایک آخری ملاقات کی تمنا دل کی دل ہی میں رہی

اور ایوب قادری دفعتاً داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بیکراں نعمتوں

سے نوازے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

ایسے انسان اور ایسے ادیب روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی کتابیں علامہ

شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔

وہی تحقیق کی گہرائی، وہی تاریخ پر کامل عبور، وہی اسلوب بیان کا ستھرا پن اور وہی

موضوع پر گرفت۔

مشاہیر کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں وہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے اور اکثر

قطعہ تاریخ بھی نظم کر دیتے تھے۔ سال کے شروع میں گزشتہ سال کے گزرے ہوؤں کا

گوشوارہ وہ اخبار میں شائع کر دیتے تھے۔ لیکن وہ "سن ۸۳ء میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ"

شائع نہ کر سکے کیونکہ کچھ ہی دن پہلے خود وہ اس گوشوارہ کا حصہ بن چکے تھے۔

وفاقی اردو کالج سے ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ اس کالج کا مجلّہ "برگ گل" کی ترتیب و تدوین میں ان کا بڑا حصّہ تھا۔ بڑے جتن سے مضامین فراہم کرتے تھے! اس کا اندازہ مجلّے کے ان ضخیم شماروں سے ہوتا ہے جو مولانا محمد علی جوہر، قائداعظم محمد علی جناح، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں کالج سے شائع ہوئے

ان کی تالیفات، تصنیفات اور دیگر نگارشات کی فہرست طویل ہے۔ یہاں ان کے ساتھ انصاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس قدر عرض کرتا چلوں کہ وہ اپنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی نئی یا پرانی تخلیقی بات جو بالعموم آنکھوں سے اوجھل ہوتی، شامل کر دیتے تھے۔ مثلاً "مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ" میں ان کا تحقیقی مقالہ "قدم شریف" چونکا دینے والا ہے۔ یا پھر جیسے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں مولوی رضی الدین بدایونی کی نگارشات جو دہلی کے چشم دید واقعات پر مشتمل ہیں، شامل کر دیں۔ یہ ایک اہم دستاویز ہے۔

ایوب قادری مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی بحث تکرار سے پاک ہوتی اور وہ معاملات اور شخصیات کو محض مورّخ اور محقق کی نگاہ سے دیکھتے۔ اشتیاق اظہر نے ان کی اس خوبی کا تذکرہ بہت خوب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔ "انھیں جنوبی ایشیا کے تمام مکاتب فکر کے لوگوں تک رسائی ہی حاصل نہیں رہی بلکہ اس علاقے کے ہر مکتبۂ فکر کے افراد انھیں اپنے حلقے ہی کا ایک حصّہ سمجھتے رہے۔ وہ دیوبندیوں میں دیوبندی، بریلویوں میں بریلوی اور دانش گاہ ندوہ کے حوالے سے ندوی سمجھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ تحریکِ آزادی کے اکابر بھی انھیں عزیز رکھتے تھے۔ دراصل دل و دماغ کا کینوس اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہر حلقے کے نقش و نگار کی بہتات ملتی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مورّخ تھے اور مورّخ ہر شخص اور واقعہ کو تاریخ کی کسوٹی پر کستا ہے، عقائد کی بنیاد پر نہیں۔ وہ خود ایک سیدھے سچے مسلمان تھے۔ ضعیف الاعتقادی سے دور اور بدعتوں سے پاک۔

ایوب قادری کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ سخی حسن کے قبرستان میں وہ پیوند خاک ہوتے۔ یہ ان کی رہائش گاہ سے قریب ہی ہے۔ بہ قول قمر جلالوی ؎

حالانکہ گھر سے تربت کچھ دور تھی نہ ایسی
پہنچا مگر جنازہ کاندھے بدل بدل کر

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ جب ایوب قادری کے آخری دیدارِ میت پر شور ماتم اٹھا اس وقت ڈاکٹر صاحب کے آنسو اور صبر آزما آہیں شامل تھیں۔ انھوں نے انھیں کاندھا بھی دیا اور مٹی بھی۔ بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ، ادباء اور صحافی موجود تھے۔ فضا رحمت الہیٰ سے بوجھل بوجھل لگتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایوب قادری زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جو کام کرنا ہو جلد کرلو، بلکہ فوری کرلو کیونکہ پل کی خبر نہیں۔ جب انھیں قبر میں اتارا تو یہ رباعی یاد آرہی تھی ؎

گل صبح دم از باد بر آشفت و بریخت
با باد صبا حکایتے گفت و بریخت
بد عہدی عمر بیں کہ گل در دہ روز
سر بر زد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور رہتی دنیا تک ان کے کارناموں کو زندہ رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

جناب عامر حسین صدیقی

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم

ایک مخلص دوست

نظروں میں آ کے کون الٰہی چلا گیا،
کس کی تلاش میں میرے اشکِ رواں چلے

☆

اسلامیہ کالج بدایوں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد جب جولائی ۱۹۴۸ء میں دوبارہ کھُلا تو انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں داخلہ لینے والوں میں ایک بالکل منفرد چہرہ نظر آیا جو کالج کے ہنگامہ پرور اجنبی ماحول سے قطعاً غیر متاثر حلم و متانت کا پیکر بنا ہوا فرسٹ ایر فول کے روایتی مفروضہ کی عملی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ کالج کے شرارتی لڑکوں کے اس گروہ نے جو فرسٹ ایر کے نو وارد طلبار کو تختۂ مشق بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا اس نوجوان کو بڑی تند و تیز نظروں سے دیکھا اور اس کے گرد گھیرا ڈالنے کی متعدد بار کوششیں کیں لیکن ہر بار وہ ان کی گرفت سے صاف بچ نکلا۔ اس کے برعکس اُس نے آہستہ آہستہ طلبا میں وہ مقام پیدا کیا کہ چند ہی ماہ میں کالج میں نو وارد علم دوست طلبار کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہوگیا۔

میری اس نوجوان سے کلاس کے خاتمے کے بعد ہر روز عموماً دو یا تین مرتبہ کالج کے کاریڈور میں ملاقاتیں ہو جاتیں اور ہر مرتبہ اس کا سلام کرنے میں پیش قدمی اور متانت آمیز خاکساری لئے اپنائیت کا انداز مجھے متاثر کر جاتا لیکن نئے طلبار کو زیادہ لفٹ دینا کالج کی روایات کے خلاف تھا لہٰذا اس سے ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس کے قریب جانے سے گریزاں ہی رہا۔ وقت اپنی مسافت طے کرتا رہا۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گزرتے چلے گئے۔ اس دوران کالج کی سالانہ تقریبات کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس موقع پر کالج کا میگزین بھی شائع ہونا تھا۔ میں نے میگزین کے لئے ایک مضمون جو ملا عبدالقادر بدایونی کے حالات اور اُن کے کام کے بارے میں تھا، لکھ کر تقریب کے نگراں استاد کو دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب ایک پیریڈ کے خاتمے کے بعد میں ریڈنگ روم کی طرف جا رہا تھا تو برادرم نیاز بدایونی میرے پاس آئے اُن کے ہمراہ یہ نوجوان تھا۔ نیاز نے مجھ سے نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ محمد ایوب صاحب ہیں جو میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے تھے اس لئے میں لے آیا ہوں۔ نوجوان نے رسمی سلام و دعا اور ابتدائی کلمات کے بعد میری جانب میرا تحریر کردہ مضمون بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ نے یہ مضمون بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھا ہے لیکن ذرا طویل ہو گیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ اس کو مختصر کر دیں تو میگزین میں شائع کر دیا جائے میں نے بہت بہتر کہتے ہوئے مضمون واپس لے لیا لیکن دل میں سوچ لیا کہ اب اس کو واپس نہیں کروں گا کیونکہ مضمون کی اس طرح واپسی کو میں نے اپنی توہین سمجھا۔ اس طرح یہ ملاقات اس نوجوان سے میری قربت کی بجائے دوری کا سبب بن گئی۔ اس کے بعد میں اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ اگر کہیں راستے میں وہ مل جاتا تو میں راستہ کاٹ جاتا۔ چند ماہ اسی طرح

گزر گئے کہ ایک روز میرا کالج کی لائبریری میں جانا ہوا۔ مجھے کوئی کتاب درکار تھی اس وقت نام یاد نہیں آرہا ہے۔ کتاب مقررہ جگہ پر جب نہیں ملی تو میں نے لائبریری کلرک سے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ کتاب آج ہی محمد ایوب صاحب کے نام جاری کی گئی ہے۔ محمد ایوب صاحب اس وقت لائبریری میں بیٹھے ہوئے کسی چیز کا مطالعہ کر رہے تھے اور یہ تمام گفتگو سُن رہے تھے۔ وہ فوراً ہی اُٹھ کر کاؤنٹر پر آئے اور کتاب واپس کرتے ہوئے بولے کہ یہ کتاب واپس لیکر عامر صاحب کے نام جاری کردی جائے میں دوبارہ لے لوں گا۔ مجھے کتاب کی اس وقت سخت ضرورت تھی لہٰذا اس پیش کش کو میں نے فوراً قبول کرلیا۔ اس کے بعد سلسلۂ گفتگو آگے بڑھا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے لائبریری کے دارالمطالعہ میں بیٹھ گئے۔ دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ ایوب صاحب کا تعلق بدایوں سے بالکل قریب قصبہ آنولہ سے ہے جو اگرچہ انتظامی لحاظ سے ضلع بریلی کا حصّہ تھا لیکن بدایوں سے بالکل متصل ہونے کی وجہ سے بدایوں کا ہی حصّہ مانا جاتا تھا۔ یہ بڑا تاریخی قصبہ تھا۔ یو۔ پی کے شمالی اضلاع میں جب مغلوں کے زوال کے بعد روہیلہ حکومت قائم ہوئی تو روہیلوں نے آنولہ ہی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا یہاں پر روہیلوں کے لاتعداد تاریخی آثار پائے جاتے ہیں۔ آنولہ کا نام میرے لئے بالکل نامانوس نہیں تھا کیونکہ میری ایک خالہ مستقل طور پر آنولہ ہی میں قیام پذیر تھیں۔ میرے خالو وہاں پر وکالت کرتے تھے۔ میں متعدد بار آنولہ جا چکا تھا میں نے جب ایوب صاحب سے اپنے ان خالو کا تذکرہ کیا تو وہ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور میرے والد صاحب قبلہ کا نام لے کر کہنے لگے آپ اُن کے صاحبزادے ہیں۔ اس کے بعد میرے خاندان کے بزرگوں کا ذکر کرنے لگے۔ میں حیران رہ گیا کہ میرے خاندان کے متعلق اس قدر معلومات تو خاندان کا کوئی فرد ہی رکھ سکتا ہے

معلوم ہوا کہ ایوب صاحب کے خاندان سے میرے خالو کے قریبی مراسم ہی نہیں بلکہ عزیزوں جیسا معاملہ تھا۔ ان کا خاندان آنولہ کا معزز اور علم دوست گھرانا مانا جاتا تھا اس خاندان کے بیشتر افراد بدایوں میں بھی رہائش پذیر تھے۔ بعد میں ایوب صاحب کہنے لگے کہ آپ کے نام آپ کے مکان کے پتہ پر آپ کے خالو صاحب نے ایک پرچہ دیا تھا، وہ مجھ سے گم ہو گیا اور آپ کا نام بھی یاد نہیں رہا لیکن مجھے یقین تھا کہ آپ ہی ابوالقاسم صاحب کے بھانجے ہیں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی کہ آپ سے اس سلسلے میں پوچھا جائے اس ملاقات کے بعد ہم دونوں کے تعلقات میں تبدیلی لازمی تھی۔ اب ہم کالج میں ایک دوسرے کے قریب ترین دوست بن چکے تھے۔ ایوب صاحب کی اسلامیہ کالج بدایوں میں آمد نے وہاں کے لیل ونہار تبدیل کر دیئے تھے جہاں کی سرگرمیاں صرف ہاکی، کرکٹ، فٹبال میچوں یا پھر ڈراموں اور فینسی ڈریس شو تک ہی محدود تھیں۔ اب وہاں پر علمی اور ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں ادبی تنظیمیں اور ڈبیٹنگ سوسائٹیاں قائم ہونے لگیں۔ یہ تنظیمیں صرف کالج تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ ان کی صدائے بازگشت اندرونِ شہر تک جانے لگی۔

ایوب صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانے سے تحقیقی کام کا شوق تھا۔ وہ بدایوں کے اہلِ علم سے اپنے خاص تحقیقی انداز سے گفتگو کرتے رہتے تھے اور کافی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے قدیم کتب اور قلمی نسخوں کا ایک وافر ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ یہ قلمی نسخے ان کو بدایوں میں بآسانی دستیاب ہو گئے۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی تباہی اور پاکستان ہجرت کے نتیجے میں وہاں کے بڑے بڑے کتب خانے ردّی میں فروخت ہو گئے تھے۔ ایوب صاحب کالج سے واپسی پر ردّی فروخت کرنے والوں کی دکانوں پر چلے جاتے اور وہاں پر گھنٹوں اپنے مطلب کی کتب چھانٹتے رہتے اس طرح

انہوں نے اپنے پاس بڑی نایاب کتب کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اس زمانے میں کتب جمع کرنا ایوب قادری کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ اگر اُن کو پتہ لگتا کہ کوئی اہم کتاب کسی صاحب کے پاس ہے تو وہ اس کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور عموماً اس میں کامیاب ہی ہوتے تھے کیونکہ ان کو گفتگو کرنے کا اللہ نے ایک خاص سلیقہ عطا کیا تھا جس کی وجہ سے مخاطب ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ ایوب قادری کا کتب جمع کرنے کا شوق ایک تو اُن کے علمی ذوق کی تسکین تھی، دوسرے وہ اس خیال سے کتب کی تلاش میں رہتے تھے کہ کہیں کوئی اسلامی کتاب غلط ہاتھوں میں نہ پہونچ جائے۔ ایک مرتبہ تو اس کوشش میں ایوب قادری مرتے مرتے بچے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ وہ میرے ساتھ بدایوں کے منڈھی دروازے پر حلوائی چوک سے گزر رہے تھے کہ ایک ہندو حلوائی کی دکان پر نظر پڑی۔ وہ قدیم کتب میں سے ورق پھاڑ پھاڑ کر ان میں مٹھائی لپیٹ کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ ہم دونوں فوراً حلوائی کی دکان میں گھس گئے وہاں جاکر جو منظر دیکھا تو ہماری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہاں نایاب فارسی کتب کے علاوہ زمین پر کلام الٰہی کے قلمی نسخے پڑے ہوئے تھے۔ ایوب قادری نے ان نسخوں کو جھپٹ کر ہاتھ میں اٹھایا اور بوسہ دینے لگے۔ ہندو بنئے سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ وہ فوراً ہی اٹھا اور نسخے ہم سے چھین کر ایک طرف کو پھینک کر ہمیں دھکے دیتا ہوا نیچے اتارنے لگا۔ اس کے چند ملازمین بھی اس کی مدد کو آ گئے۔ ہم بھی ان لوگوں سے گتھ گئے۔ وہ علاقہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا لیکن مسلمانوں کا محلہ قریب میں ہی تھا لہٰذا خبر آن کی آن میں قرب و جوار میں پہونچ گئی۔ لوگ اپنے گھروں سے بھاگ کر آ گئے۔ اندیشہ ہو گیا کہ سخت ہندو مسلم فساد ہو گا۔ واضح رہے کہ اس دور کے ہندو مسلم فسادات میں جھگڑے کے وقت تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہتا تھا لیکن

بعد کو پولیس اور راشٹریا سیوک سنگھ کے غنڈوں سے مسلمانوں کا قتل عام کرایا جاتا تھا جس کے آگے مسلمان بے بس ہو جاتے۔ لیکن اس وقت اللہ نے یہ گھڑی ٹال دی۔ اس کو میں تو قرآن کا معجزہ ہی کہوں گا۔ ہوا یہ کہ جس وقت بنیا ہم لوگوں سے گتھا ہوا تھا تو اس کا ایک بارہ سالہ لڑکا بھی قریب ہی موجود تھا۔ دیگر ملازمین کے ساتھ وہ بھی ہم لوگوں کے پاس دوڑا آرہا تھا کہ راستے میں شبرے سے بھرے ہوئے گڑھاؤ میں گر گیا۔ یہ سب کچھ اچانک اور ڈرامائی انداز میں ہوا سب لوگ ہمیں چھوڑ کر اس کو نکالنے میں لگ گئے۔ بنیا بھی وہاں پہنچ گیا۔ لڑکے کو بڑی مشکل سے گڑھاؤ سے نکالا گیا۔ اتفاق سے گڑھاؤ میں شیرہ ٹھنڈا تھا اس لئے لڑکے کو نقصان نہیں پہنچ سکا۔ البتہ وہ بھوت ضرور بن گیا۔ بنیے پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ فوراً واپس آیا اور جو ہندو مسلمان وہاں جمع تھے۔ ان کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر واپس کیا۔ اس کے بعد کلام الٰہی کے یہ نسخے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ کہ لو اب ٹلو یہاں سے تم مُسلّوں نے تو بالک کو مار ہی ڈالا تھا۔

ایوب قادری اپنے مختصر قیام بدایوں کے دوران مکمل طور پر بدایونی بن چکے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے بڑی محنت کی تھی۔ انہوں نے قدیم تاریخ بدایوں پر فکر انگیز تحقیق کی تھی۔ اور اس کے نہایت اہم گوشے سامنے لاتے تھے، انہوں نے بدایونی تہذیب، ثقافت رسوم حتیٰ کہ وہاں کے خاندانوں کے شجروں تک سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہ واقفیت حیرت انگیز تھی۔ ان کو بدایوں کی سرزمین سے عشق تھا۔ بعض اوقات بڑی حسرت سے کہتے تھے کہ کاش میں آنولہ کی بجائے بدایوں میں پیدا ہوا ہوتا، تاکہ اپنے نام کے ساتھ بدایونی لکھ سکتا۔

بدایوں کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے قتل عام کی وجہ سے جس کو فسادات کا نام دیا جاتا تھا۔ لوگ بڑی کسمپرسی کے عالم میں پاکستان بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ایوب قادری بھی ۱۹۵۰ء کے آخر میں ایک دن خاموشی سے پاکستان آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے محکمہ رسد ذخیرۂ دیات میں بحیثیت کلرک ملازمت کرلی۔ ایک سال بعد جب میں پاکستان آیا تو میں بھی اسی دفتر میں ملازم ہوا۔ اس طرح میرا ان کا ساتھ اس دفتر میں تقریباً آٹھ سال تک رہا۔ یہاں رہ کر انہوں نے سب سے بڑا کام جو کیا وہ اپنی نامکمل تعلیم کی تکمیل تھی۔ انہوں نے اردو کالج میں داخلہ لے کر ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے پڑھائی شروع کردی اور اس کو تکمیل تک پہنچایا۔

اردو کالج میں جاکر ایوب قادری کی صلاحیتوں کے خوب جوہر کھلے، ایک تو اس دور کے اساتذہ کی تربیت، دوسرے انجمن ترقی اردو کی لائبریری ایوب قادری نے اپنے تعلقات کی بنا پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ذاتی کتب خانے تک رسائی حاصل کرلی، پھر برگ گل نے انہیں گل سرسبد بنا دیا۔ اسی زمانے میں الطاف علی بریلوی نے "العلم" نکالا، ایوب قادری نے اس میں لکھنا شروع کیا اور بڑے تحقیقی اور معیاری مقالے اس میں لکھے۔ غرض یہ کہ اس دور میں وہ ایوب قادری جنہوں نے اپنے علم کے سمندر کو اپنے شیشے کے کوزے میں سمیٹ کر منہ بند کر لیا تھا۔ اس کوزے کے منہ کو کھول دیا۔

ایوب قادری نے اردو کالج میں بڑی محنت کر کے علم حاصل کیا۔ وہ اپنے اساتذہ کا نہایت احترام کرتے تھے اور اساتذہ بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہاں اساتذہ کے احترام کے تعلق کا صرف ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔

محمد علی بوگرہ کے زمانے میں جب پاکستان کی واحد قومی زبان اردو کے

ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو ہم نوجوانوں نے تحفظ اردو کے لئے ایک تحریک کا آغاز کر دیا۔ ایوب قادری بھی اس تحریک میں شریک تھے تنظیم کی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ تنظیم کے زیر اہتمام اردو کی حمایت میں ایک جلسہ عام کیا جائے اس کی صدارت بابائے اردو مولوی عبدالحق سے کرائی جائے۔ تنظیم کے اس کام کے لئے بحیثیت صدر میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ بابائے اردو سے بات کر کے تقریب کے لئے وقت مقرر کرا لیا جائے۔ میں نے اردو کالج سے ایوب قادری کو اپنے ساتھ لیا اور بابائے اردو سے ملاقات کرنے کالج سے ملحقہ انجمن ترقی اردو کے دفتر پہنچ گیا۔ اور اطلاع کرائی کہ چند نوجوان تحریک اردو کے سلسلے میں بابائے اردو سے ملنا چاہتے ہیں اتفاق سے اس وقت انجمن ترقی اردو کی نہایت اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔ بابائے اردو اس کی صدارت کر رہے تھے۔ اردو کالج کے پرنسپل میجر آفتاب حسن بھی اس میں شریک تھے۔ ہم لوگوں کو اس کی بالکل خبر نہیں تھی ہم کو فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔ وہاں تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔ میں ذرا جھجکا تو بابائے اردو خود اٹھ کر میری طرف آ گئے۔ کہا آیئے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ ایوب قادری جو میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے، میں نے جب مڑ کر اُن کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ بابائے اردو میری کیفیت بھانپ گئے کہنے لگے آپ کے ساتھی کہیں چلے گئے ہیں۔ لیکن میں نے بہانا بنایا کہ ضروری کام سے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ میری بابائے اردو سے کافی دیر گفتگو رہی۔ ان سے جلسہ کی صدارت کا نہ صرف وقت لے لیا بلکہ اپنی تنظیم کی مستقل سرپرستی کے لئے بھی ان کو آمادہ کر لیا۔ جب میں نیچے اترا تو ایوب قادری کو اپنا منتظر پایا۔ میرا تو خون کھول گیا جو کچھ منہ میں آیا ان کو سنا ڈالا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو کہنے لگے کہ بھائی پرنسپل صاحب کو دیکھ کر میرے

قدم آگے ہی نہیں بڑھے کہ وہ کہیں گے کہ یہ شخص اب تعلیم میں دلچسپی لینے کے بجائے ہنگامہ آرائیوں میں پڑ گیا ہے۔ میرے قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ لہٰذا فوراً ہی واپس آگیا۔ ایوب قادری نے یہ الفاظ کچھ ایسی معصومیت سے کہے کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ دراصل ایوب قادری نام ونمود کے خواہاں نہ تھے وہ ایک خاموش کارکن تھے اور کام کے دھنی تھے وہ بڑے سے بڑا علمی کام نہایت خاموشی سے کرجاتے تھے۔ آجکل لوگوں کا وطیرہ بن چکا ہے کہ اگر چھوٹا سا کوئی کتابچہ بھی لکھ دیں تو اس کے لئے ایک ہنگامہ کر دیں گے۔ افتتاحی تقریب تو ہوتی ہی ہے۔ بعد میں مہینوں تک چھوٹے چھوٹے اجتماعات اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن ایوب قادری نے نہایت دقیع کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور کیا مجال کہ کسی سے مبارک سلامت کی آوازیں لگوائی ہوں۔

ایوب قادری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا اسلام سے عشق تھا۔ وہ اگرچہ اردو سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن اس کو اسلام کے اقدار کا امین بنا کر ہی زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایسے نام نہاد ترقی پسند ادب کے سخت ترین مخالف تھے جو لامذہبیت کی طرف لے جاتا ہو۔ وہ ادب میں صرف اس مقصدیت کے حامی تھے جو انسان کو اخلاقی بلندیوں کی جانب لے جاتی ہو۔ ایوب قادری کی اسلام سے شیفتگی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے جو مقالہ منتخب کیا، وہ بھی مذہبی تھا۔ وہ اردو کے بہت بڑے محقق تھے اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے لیکن اُن کی مذہبی غیرت نے یہ بات قطعاً گوارا نہیں کی کہ جس راہ میں انہوں نے اپنی ساری عمر کھپا دی۔ اب تعلیم کی آخری ڈگری میں اس سے الگ کوئی اور راہ اختیار کی جائے۔

ایوب قادری علمائے اسلام کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ خواہ وہ اسلام

کے کسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ کہتے تھے یہ لوگ کتنے ہی بے عمل کیوں نہ ہوں لیکن ان کا مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ دورِ طاغوت سے اسلامی تعلیمات کو بچا کر ہم تک لے آئے اگر انگریز کے دور میں جگہ جگہ دینی مدارس قائم نہ ہوتے تو آج پاک و ہند میں اسلام کا کوئی نام لینے والا نہ ہوتا۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے اگرچہ بریلوی مسلک پر عامل تھے لیکن تعصب سے کوسوں دُور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلقات بریلوی، دیوبندی اور اہلِ حدیث علماء سے یکساں درجہ کے تھے۔ ان کے جنازے میں لوگوں نے اس کا بچشمِ خود مشاہدہ کر لیا۔

پروفیسر فرخ جلالی

علیگڑھ یونیورسٹی (انڈیا)

صبر ایوب

علم و تحقیق کو زندگی کا مقصد اور مطلوب بنانا مشکل کام ہے۔ بعض طبیعتیں مشکل کاموں میں آسانی محسوس کرتی ہیں۔

ایوب قادری کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا جو ہر مشکل کو آسان سمجھتے ہیں۔

مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب ہم اور ایوب قادری بدایوں کی علمی دنیا میں ایک کونے میں صغریٰ کبریٰ بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنے مختصر سے ذخیرۂ کتب کے ساتھ بدایوں میں وارد ہوئے اور روہیل کھنڈ کی تاریخ سے ان کا رومانی تعلق پیدا ہو گیا۔

ہائے ایوب قادری نے اپنی اس روح پرور داستان کا ایک حصہ لکھا ہے بدایوں کے دورانِ قیام کی بابت ایوب قادری نے لکھا ہے:

میرے عزیز دوست فرخ علی جلالی کے توسط سے بریلوی صاحب کا مشہور علمی رسالہ "مصنّف" علیگڑھ دیکھنے کو ملنے لگا۔ اس طرح بریلوی صاحب (سیّد الطاف علی بریلوی سیکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس) کے بہت قریب آئے۔ خوش قسمتی سے اس رسالہ مصنف علیگڑھ کے ابتدائی شمارے ابھی تک محفوظ ہیں۔

سید الطاف علی بریلوی حیات و خدمات۔

مؤلف: محمد ایوب قادری ۱۹۸۲ء صفحہ ۶

اس رسالہ میں ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے:

"خاکسار کا ننہالی وطن بدایوں ہے۔ جہاں میں بسلسلہ تعلیم ۱۹۴۷ء

تا ۱۹۵۰ء مقیم رہا۔"

ایوب قادری تعلیم میں مجھ سے کافی آگے تھے مگر یہاں علماء اور آزاد خیال مفکرین اور شعرا سے ربط وضبط میں زیادہ وقت گزرتا تھا۔ اپنی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی بھی موضوع کے تمام اصولوں پر سیر حاصل معلومات فراہم کی جائیں اور ایوب قادری کے مزاج میں یہ تھا کہ جو کچھ معلوم ہو لکھ کر شائع کر دیا جائے۔ پہلے والے طریقے میں ذوق ونظر کی دل چسپی کا سامان، لیکن آخری طریقہ علمی دنیا کے لئے بے حد مستحسن ہے اور اسی طرح علمی دنیا کے سرمایہ میں اضافہ ممکن ہے۔

ایوب قادری کو کچھ رسائل اور کتب پیش کر دئے گئے ہیں اور فوراً نقل اور نوٹس کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ اور ایسا تو متعدد بار ہوا کہ میں نے ان کو کمرے میں بٹھایا۔ خود کسی کام سے یا کتاب کی تلاش میں گھر سے نکل گیا۔ مالکِ کتاب کے یہاں کتاب پڑھی۔ اور اس کے دروازے پر بیٹھ کر کتاب پڑھ کر واپس کر دی۔ کون کتاب گھر پر لائے اور نہ کسی کی کتاب ادھار رہی نہ کتاب دابی۔ کچھ اس طرح کا عقیدہ رہا کہ یہ کتاب کے ساتھ بے ادبی ہے۔

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور آگے بڑھ گئے۔ ہم کئی گھنٹے بعد گھر پر لوٹے تو ایوب قادری محوِ مطالعہ ہیں۔

ارے بھائی گھر نہیں گئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہے ہم بھول گئے۔ کبھی کچھ کھا لیا ورنہ سادگی اور خودداری سے گھبرایا نہ تھا

اب سب قضیہ چھوڑ کر یہ طے کیا جا رہا ہے، نواب بلسی کی کوٹھی کے قریب جس میں کلکٹر رہتا ہے، قاسم خاں بنگش اور روہیلوں کی جو لڑائی ہوئی تھی اس کا سروے کیا جائے۔ اتوار کی صبح کو اس ویرانے میں سروے کیا جا رہا ہے۔

ٹوٹے ہوئے مٹی چونے کے برتن اور گھوڑے کے نعل تلاش کی جارہی ہیں دمدمے کی اونچائی دیکھی جارہی ہے، میدان جنگ کے کونے کھنگالے جارہے ہیں۔ بھلا ایسے دیوانے پن کا ساتھ کون دیتا اور کیوں دیتا۔

بدایوں کی علمی اور ادبی تصانیف میں اس معرکہ کے اشارے کنائے تلاش کئے گئے کچھ نہیں ملا معلوم ہوتا ہے مصنفین بدایوں افغانوں کے آویزش سے بے تعلق سے تھے۔

اگلے اتوار کو ہم آزاد نظم لکھنے والوں پر مضمون پڑھ رہے ہیں۔ اور ایوب قادری جلسہ سے غائب ہیں۔ دوسرے دن ہم نے پوچھا کہ بھائی کل تم کہاں تھے۔ نہایت سادگی سے بولے۔

"بھائی کچھ علماء بدایوں کے سوانح کے سلسلہ میں مولوی محلہ گیا۔ اس کے بعد مولانا محمد ابراہیم فریدی کے پاس چلا گیا"۔

میں نے کہا کہ بھائی! نوادہ سے اطلاع آئی ہے کہ ابوالحسن بصیر کے یہاں کچھ کاغذات نکلے ہیں۔ دیوان محبت کے کچھ اوراق بھی ہیں۔

ہماری ابوالحسن بصیر سے شناسائی ہے۔ اُن کے بیٹے ابوالفضل سے دوستی ہے اور ان کے پوتے آصف کلاس فیلو ہیں۔

دوسرے دن نوادہ پہنچے، وہاں کتابیں دیکھنے کو ملیں۔ ابوالحسن بصیر سے علیگڑھ کی داستان زیادہ سننے کو ملی۔ داستان دل چسپ بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔

عارف پور نوادہ سے لوٹے۔ راہ میں حضرت سید احمد صاحب کا مزار ہے حضرت سید احمد حضرت نظام الدین محمد محبوب الٰہی کے والد ماجد ہیں۔

اب گفتگو بدایوں کی قدیم تاریخ پر ہو رہی ہے۔ ایوب قادری نے بتایا کہ غوریوں سے قبل بدایوں میں مسلم آبادی تھی۔ اور شاید وہ علاقہ یہی تھا۔

ان کے قول میں آثار صداقت تھے۔ بدایوں کے علماء تاریخ اور تذکرہ کوثانوی

علم سمجھتے۔ صرف مکرمی سبطین صاحب اس کے حافظ اور قدرداں تھے اور چند حضرات صرف معترف تھے۔

آخر جدائی کی گھڑی آ پہنچی اور وہ کراچی چلے گئے۔ میں نے بڑی تلاش کے بعد افضال شیروانی اور رشید حسن خاں تلاش کئے۔ رشید حسن خاں شاہجہان پور رہتے تھے اس لئے خطوط پر اکتفا کرنا پڑا!

افضال شیروانی میں علمی دیوانگی اور شعری فرزانگی کے تمام جوہر موجود تھے۔

ایوب قادری کراچی پہنچے۔ وہاں اہل نظر تازہ بستیاں آباد کر رہے تھے۔

ہماری یونیورسٹیاں دراصل بڑے کالج ہیں انگریزی سامراج نے اپنے نئے مملکوں کے انتظام و انصرام کے لئے کچھ یونیورسٹی نما کالج شروع کر دئے۔ آزادی سے یونیورسٹی میں تحقیق اور نئی ترکیب کی فضا شروع ہوئی۔ ایوب قادری پہلے تو اسی قسم کے اداروں میں سرمہ مفت نظر بنے رہے۔ وہ اپنے لئے برابر لکھتے رہے اور دوسروں کو مفت یا برائے نام معاوضہ پر قلمی مواد فراہم کرتے رہے۔ کراچی میں سرکاری اور کارخانہ داری زندگی کہ وہاں ترقی یافتہ ممالک جیسی عمارتیں بنی تو ہیں لیکن برطانیہ اور المانیہ (جرمنی) کی فضا مفقود ہے۔

ایسے عالم میں تحقیق کا پایہ بلند رکھنا اور مشکل کام ہے۔ کراچی کے صاحب حیثیت لوگوں میں حکیم محمد سعید کے یہاں تو علم کی ضرورت کی فضا ملتی ہے آگے اللہ کا نام ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے عمرانی علوم اور ادبی زبانوں میں تحقیق کا یہ عالم ہے کہ جیسے ابھی پاکستان آزاد نہیں ہوا۔ اس کا اصل سبب ارباب سیاست کی ظاہری مغرب پرستی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اور بھی اسباب ہوں۔ ایسے بے توجہی اور کسمپرسی کے عالم میں ایوب قادری نے کراچی میں تحقیق کا علم گاڑ دیا۔ تحقیق بنیادیں بھرنے کا کام ہے۔ بغیر کتابوں کے کام انجام نہیں ہو سکتا۔

اب ایوب قادری جو کماتے وہ کتابیں جمع کرنے میں صرف ہو جاتے۔ کراچی میں پبلک لائبریری لندن کے کسی گاؤں COUNTY کی لائبریری کی طرح ہے۔

ایوب قادری کا لافانی کارنامہ رحمان علی کے تذکرہ علمائے ہند کا اردو ترجمہ اس کے بے مثل حواشی ہیں، اعلام اور اماکن کے اشاریہ سونے پر سہاگہ ہے۔ کتابوں کے صحیح نام لکھنا اور حالات میں اضافہ کرنا برسہا برس کا کام تھا جس کو ایوب قادری نے چند مہینوں میں مکمل کر دیا۔ اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں وہ ہندوستان آئے۔ اب پھر بدایوں میں ان کے لئے راقم کا کتب خانہ اپنے آغوش وا کئے تھا اور میری اجازت سے وہ چند نایاب کتابیں ساتھ لے گئے۔ جس کا اعتراف تذکرہ علمائے ہند میں کیا ہے۔ ہندوستان کی علمی تاریخ میں اندازہ مولانا رحمان علی کا اپنی کتاب میں سمو دی تھی۔ ایوب قادری نے اس پھول کی خوشبو کو سارے عالم میں پھیلا دیا۔ ایوب قادری کے مزاج کی سادگی اور طبیعت کی نفاست پر متموّل افراد کو حیرت ہوتی تھی۔ مگر انھوں نے اپنے انداز کو ہمیشہ قائم رکھا۔ کراچی کی مصنوعی زندگی میں ایسے حیات بسر کرنا مشکل کام ہے مگر جناب سید الطاف علی اور ایوب قادری نے سادگی میں حسن کے جوہر چمکانے کی فضا قائم رکھی۔

اللہ سے دعا ہے کہ سیّد الطاف علی تادیر زندہ رہیں اور علم کی خدمت کرتے رہیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک صاحب مرزا عبدالقادر حیف گزرے ہیں۔ وہ عالم نہ تھے لیکن علم وادب سے ان کی واقفیت ٹھوس اور بے پایاں تھی۔ غالب جیسے شاعر نے ان کی پسند اور ناپسند کا خیال کیا ہے۔ انھوں نے کچھ یادداشتیں قلم بند کی تھیں۔ سارا ہندوستان گھومے تھے۔ انگریزان کے سامنے جڑ پکڑ رہے تھے۔ ایوب قادری نے ان کی کتاب کے ترجموں پر بے مثل حاشیے لکھے اور معلومات کا اضافہ کیا۔ اور اس کو خاصے کی چیز بنا دیا۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

فاضلِ گرامی ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ نہایت حلیم الطبع، اعتدال پسند، نیک اطوار، پاکیزہ مزاج خدا ترس اور حقیقت شناس تھے۔ غیبت، حسد، بغض وغیرہ رذائل سے بہت دور اور حقوق العباد کے لئے بہت قریب تھے۔ جب میں اردو کالج کراچی میں تھا تو وہ بی۔اے کے طالب علم تھے۔ وہاں کے میگزین "برگِ گل" کے لئے وہ ایک مضمون لکھ کر لائے تو پہلی نظر میں میرے دل میں کچھ بدگمانی پیدا ہوئی کہ بی۔اے کا طالب علم ایسا فاضلانہ مضمون کس طرح لکھ سکتا ہے۔ لیکن جب ان کو قریب سے دیکھا تو اسی زمانے سے اُن کی قابلیت اور صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔ بی۔اے کے بعد انہوں نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے ایم۔اے کچھ دیر میں کیا لیکن میرے اصرار پر انہوں نے امتحان میں شرکت کی اور بہت اعلیٰ نمبروں کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا۔ پھر وہ کالج میں استاد مقرر ہوئے اور اپنے علمی مشاغل میں

مصروف ہوئے کئی بڑی بڑی کتابوں کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور ان پر حواشی اور تعلیقات اس قدر محققانہ لکھے کہ وہ مدت تک فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ کئی کتابیں صحیح متون کے ساتھ مرتب کیں اور دو کتابیں اس عاجز کے نام بھی معنون کیں جو محض ان کی محبت اور خلوص کی شاہد ہیں۔ اِن مصروفیات کی وجہ سے پی۔ایچ۔ ڈی کرنے میں اُن سے تاخیر ہوتی گئی۔ میں بار باران کو لکھتا رہا کہ یہ نمائشی ڈگری بھی لے لینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ ان پر ناراض بھی ہوا۔ آخر وہ اس کے لئے آمادہ ہوئے اور ایسا مقالہ لکھا کہ جس پر یونیورسٹی بھی فخر کر سکتی ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ اُن کے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی دونوں کے امتحانوں میں ایک ممتحن میں بھی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے ہی کئی کتابیں پی۔ایچ ڈی کے معیار کی شائع کر چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کو ڈی لٹ کرنے کے لئے بھی کہا تھا لیکن افسوس کہ اس کے لئے موقع نہ مل سکا۔

ان کی آخری کتاب "کاروانِ رفتہ" جس میں انہوں نے چھبیس[۲۶] ایسے حضرات کے حالات لکھے ہیں جن کو دیکھا ہو یا جن کے متعلق سنا ہے۔ لیکن اَن دیکھے لوگوں کے حالات بھی ایسے سلیقے سے مرتب کئے ہیں کہ وہ دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مرحوم اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اب وہ خود اس کتاب کا عنوان بنیں گے۔ یعنی:۔

ع افسانہ کہتے کہتے افسانہ بن گئے ہیں

افسوس کہ بوڑھے زندہ ہیں اور ایسے جوان جن سے بوڑھوں کو

سہارا نفاد نیا سے رخصت ہو گئے۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ بہر حال کُلّ من علیہا فان۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلہ" کے لئے میں نے ایک مضمون ان کو بھیجا تھا کہ وہ دیکھ لیں اور محترم ہلال احمد زبیری صاحب کو پہنچا دیں۔ مرحوم نے انتقال سے صرف دو دن پہلے یعنی ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو یہ خط مجھے بھیجا (جو ان کے انتقال کے بعد مجھے ملا)۔

۲۳ نومبر ۸۳ء

۷۸۶

حضرت مخدومی قبلہ ڈاکٹر صاحب دام ظلکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا مضمون اور گرامی نامہ ملا۔ مضمون میں نے پڑھا بہت خوب ہے۔ کل میں نے وہ مضمون ہلال احمد زبیری صاحب کو پہنچا دیا ہے۔ وہ نہایت شکر گزاری کا اظہار فرما رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم خوردوں پر ہمیشہ قائم رکھے اور آپ صحت و عافیت سے رہیں آمین۔ اگر کسی وقت صحت اجازت دے تو کاروانِ رفتہ پر چند سطور لکھ دیجئے۔ دوسرے حصے میں کام آئیں گی فقط والسلام۔

خادم و خاکسار

محمد ایوب قادری

اتفاق سے مرحوم کے انتقال کے بعد مجھے کراچی جانا پڑا۔ شکر ہے کہ آخری دیدار اور نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

ایوب قادری مرحوم

ایوب قادری مرحوم میرے ہم وطن بھی تھے اور عزیز شاگرد بھی پی ایچ ڈی کے لئے انہوں نے موضوع میرے مشورہ سے اختیار کیا اور میری نگرانی میں مقالہ کی تکمیل کر کے ڈگری حاصل کی، تاریخ بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ، اس کے علماء، صوفیا اور بزرگان دین کی سیرت و سوانح ان کا خاص موضوع تھا اور بلاشبہ کم لوگوں کو اسماء الرجال پر اتنی قدرت ہو گی جتنی مرحوم کو تھی اور خود میں نے ان کے بعض حوالوں سے استفادہ کیا ہے۔

مرحوم اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اپنا مقام پیدا کیا تھا۔ علمی تحقیق و تلاش ان کے لئے عبادت کا درجہ رکھتی تھی اور شب و روز وہ اسی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے سامنے علمی تحقیق کے بہت سے منصوبے تھے جو ان کی ناگہانی موت نے خاک میں ملا دیئے۔ ہم ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی میں تو درکنار مرنے کے بعد بھی اعتراف کمال میں بخل کرتے ہیں۔ لوگ ہمیں مردہ پرست کہتے ہیں لیکن ہم نہ

زندہ پرست ہیں نہ مردہ پرست، صرف جاہ و منصب پرست ہیں اور چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔

ایوب قادری مرحوم سے بہت کم درجہ کی علمی صلاحیت رکھنے والے محض جتھے بندی کی بناء پر عالموں اور ادیبوں کے سردار بنائے گئے ہیں، لیکن علمی حقیقت اُن کی جو ہے وہ بھی لکھی جانے والی تاریخ سے ہی معلوم ہوگی، اس وقت ایوب قادری کی تحریروں سے اندازہ ہوگا کہ مرحوم کو ان کی لیاقت، صلاحیت اور محنت کا ہم نے کیا صلہ دیا۔

جو قوم علم اور اپنے اہل علم کی قدر نہیں کرتی وہ علمی دنیا میں ذلیل و رسوا ہوتی ہے۔ قومی ترقی کا پیمانہ صرف آسمان بوس عمارتیں، فیکٹریاں اور کارخانے نہیں ہوتے، اس کے علماء اور اہلِ فکر و فن کا قد و قامت ہوتا ہے۔ خدا کرے ہمارے "سرپرستوں" کو کبھی 'بونا' ہونے کے باوجود سر اٹھا کر دیو قامت انسانوں کی طرف نظر ڈالنے کی ہمت بھی ہو۔

———— ☆ ————

ایک مخلص دوست

پروفیسر محمد ایوب قادری

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمتوں میں جگہ دے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم میرے قدیم اور مخلص دوستوں میں ایک بہت ہی اچھے دوست تھے۔ ایک مدت سے ہمارے خوشگوار تعلقات قائم تھے۔ وہ اس قدر پابندی کے ساتھ مجھ سے ملتے تھے کہ مجھے اپنی کم آمیزی پر شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ وہ مجھ سے بعض علمی مسائل پر بڑی صفائی کے ساتھ اختلاف بھی کرتے تھے اور دیر دیر تک ہمارے مابین گفتگو ہوتی رہتی لیکن ہمارے ذاتی تعلقات اور مخلصانہ دوستی پر ہمارے خالص علمی و تحقیقی اختلافات کا کبھی کوئی اثر نہیں پڑتا تھا وہ میرے کراچی میں مقیم ہونے کی مدت میں بارہا بلکہ ہر ہفتہ آکر مجھ سے ملتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ بہت سے سوالات لکھ کر لے آتے تھے اور مجھ سے ان کے جوابات لیتے تھے۔ ہندوستان کے اہل علم کا تذکرہ ان کا خاص موضوع تھا۔ اور شاید اسی ذوق نے ان کو ایک اعلیٰ درجہ کا محقق اور مشہور مصنف بنا دیا تھا۔ انھوں نے

دو مشہور تذکروں کے ترجمے فارسی سے کئے جو شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

اپنی طبیعت سے وہ دین دار مسلمان اور صاحبِ دل آدمی تھے، ان کے تمام دوستوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ منافقت سے بہت دور تھے انداز گفتگو دلکش تھا وہ مخالفت کے باوجود آواز یا الفاظ میں ناخوشگوار صورت کبھی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے وہ اکثر مرحوم ماہر القادری کے ساتھ میرے گھر آتے تھے اور ان دونوں کے یکجا بیٹھنے سے محفل میں بڑی رونق آجاتی تھی، ماہر القادری کے مطائبات اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا دل پذیر انداز گفتگو مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

ڈاکٹر قادری مرحوم کا مطالعہ اچھا اور خاصا وسیع تھا، تعلیم مطالعہ اور تراجم و تصانیف میں جو بلند مقام انہوں نے حاصل کر لیا تھا وہ تمام تر ان کے ذوقِ سلیم اور مسلسل محنت کا حاصل تھا۔ انہیں ترقی کرنے اور ایک بلند پایہ مقام حاصل کرنے میں کسی نے ان کی کوئی قابلِ ذکر امداد نہیں کی تھی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد جو کچھ پڑھا، اپنے شوق سے پڑھا، وہ نوکری کر کے گزر کرنے اور تعلیم حاصل کرتے رہے حتیٰ کہ وہ ایم اے اور پی ایچ ڈی ہو گئے۔ وہ اردو کالج کے قابلِ فخر اور ممتاز پروفیسر تھے۔

وہ ایک بے خانماں مہاجر تھے، انہوں نے مختلف علمی اور تعلیمی اداروں میں ملازمت کر کے اپنے لئے کراچی میں اپنا مکان بنوا لیا تھا اور ایک خوشحال آدمی بن گئے تھے۔

ان کے تراجم اور تصنیفات میں یہ خوبی ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ حواشی پر جو کچھ لکھتے ہیں اس سے اصل کتاب میں گراں قدر اضافہ کر دیتے ہیں اور اس کے لئے وہ جو کوئی کام کرتے، بڑی محنت اور جانفشانی سے کرتے تھے، اور یہی ان کی ترقی کا راز تھا۔ مرحوم رحمٰن علی کے تذکرۂ علماء ہند کا انہوں نے فارسی سے ترجمہ کیا اور حاشیہ پر اتنے علماء کے تذکرے لکھے کہ اصل کتاب سے کم معلومات ان کے حاشیہ سے نہیں حاصل ہوتی ہیں۔

یہی حال ان کے دیگر تراجم و تالیفات کا ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں تالیف کیں اور کتابوں کے ترجمے کئے اور ہر ترجمہ یا تالیف میں انہوں نے یہ کیا کہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر کے ذیلی حواشی لکھے اور اس کی کوشش کی جس قدر ممکن ہو متعلقہ معلومات ناظرین کے لئے مہیا کر دیں۔ جزاہم اللہ خیرا۔

میری اور ان کی دوستی تقریباً ۲۵ سال تک مسلسل چلتی رہی اور بہت اچھی چلتی رہی۔ ہم ایک دوسرے سے اختلاف تو کئی بار کرتے لیکن ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوتے تھے افسوس ہے اتنا اچھا دوست اپنی شہرت اور مقبولیت کے بام عروج پر پہنچا ہی تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک تیز رفتار کار نے ٹکر ماری اور وہیں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس دنیائے ناپائدار کا یہی حال ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

ز باغِ دہر چہ امید داری ⁂ دریں گل جز نہالِ غم نہ گیرد
بہ پیری میرسد خارِ بیاباں ⁂ ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

سید الطاف علی بریلوی (علیگ)

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم!

بعض واقعات کچھ اس طرح یکایک ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کے واسطے دل و دماغ کسی طرح تیار نہیں ہوتا لیکن قدرتِ کاملہ کا جو نظام ہے اس کے تحت ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے چنانچہ موت کا بھی ایک وقت معین ہے، اس میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں ہوتی۔ اسی قدرتی ضابطہ کے تحت اچھے خاصے چلتے پھرتے، ہنستے بولتے ہمارے ایوب قادری اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کا انتقال ٹریفک کے حادثہ کے نتیجہ میں پیش آیا۔ عجب اتفاق ہے کہ ان کے حقیقی چھوٹے بھائی بھی کراچی کے ٹریفک کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ اس سے قبل پروفیسر ایوب قادری کا ایک جواں سال لڑکا انتقال کر گیا تھا۔ اس طرح وہ پیہم حادثات اور اتفاقاتِ قضا و قدر کے گرداب میں گھرے ہوئے دل گرفتہ انسان تھے لیکن ان کی خوبی یہ تھی کہ نہ اپنا غم دوسروں کے سامنے بار بار بیان کرتے اور نہ اپنی دنیوی کامیابیوں اور فتوحات کا ذکر کرتے تھے۔ وہ اس کثرت

سے لوگوں سے ملتے جلتے اور ملک کے دور دراز علاقوں میں سفر کرتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ انہوں نے جو بھی ترقی کی وہ اپنی محنت اور قلم کے زور سے کی۔ کراچی کی ایک کچی آبادی سے اٹھ کر وہ ایک شاندار سہ منزلہ مکان، ایک اعلیٰ درجہ کی لائبریری اور پرسکون علمی ماحول بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کی علمی قابلیت کا زبانی اور کلامی دونوں حیثیتوں سے اعتراف کیا جاتا تھا۔ کراچی یونیورسٹی نے ان کو شعبۂ اردو میں لیکچر دینے کی عزت بخشی تھی۔ اردو آرٹس کالج کے شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ اردو زبان سے ان کی محبت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ۱۹۷۱ء میں لسانی ہنگاموں کے دوران جناب سید حسین امام، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی و دیگر اکابرِ ملت کے ساتھ پروفیسر ایوب قادری بھی مشہور تاریخ ساز ریگل اسٹاپ کے مظاہرہ میں شریک تھے۔

پروفیسر قادری کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں دیکھا تھا جب کہ پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس آنولہ ضلع بریلی میں مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ محمد ایوب قادری اس وقت ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ انہوں نے جلسہ گاہ سے متصل اپنی کتابوں کی نمائش ایک دکان میں لگائی تھی اور مجھے بطور خاص دکھانے گئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آنے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ایوب قادری میں علمی جذبہ، لگن اور تجسس کا مادہ موجود ہے چنانچہ انہوں نے میرے بتلائے ہوئے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ اور ان کے تحقیقی مقالوں کی ملک میں دھوم مچ گئی۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ ذہین اور طباع نوجوانوں کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایوب قادری کو قدرت نے ایک جوہر قابل بنایا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ اپنا میدان خود تلاش کرنے لگے۔ میری ناچیز گذارش پر ڈاکٹر معین الحق صاحب، سیکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ایوب قادری صاحب کو اپنے اسٹاف میں بطور ریسرچ اسکالر شامل کرلیا۔ یہاں ان کے مزید جوہر کھلنے شروع ہوئے

ہندوستان سے چلتے وقت جو مختصر سا سرمایۂ علمی میرے ساتھ آیا تھا، اس میں مولوی عبدالقادر برلاس مراد آبادی کا روزنامچہ مترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی، تاریخ بنگش از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں اکبرآبادی کے مسودات بھی تھے۔ میں نے ان کتابوں پر حواشی لکھنے کا کام قادری صاحب کے سپرد کیا۔ جس کو انہوں نے اسقدر محنت و کاوش سے مکمل کیا کہ دل خوش ہوگیا۔ اس کامیاب تجربہ کے بعد میں مسلسل کانفرنس کے تصنیفی کام میں ان کا تعاون حاصل کرتا رہا اور وہ ہر مرتبہ میری توقعات پر پورے اُترتے رہے۔

ایوب قادری صاحب کی خاص خوبی یہ تھی کہ میں ان کے مسودات میں کوئی تبدیلی چاہتا تو بے حد خوش دلی اور احترام کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

مجھے ان سے مثل حقیقی بھائیوں کے محبت تھی وہ بھی مجھ سے حد درجہ احترام اور محبت سے ملتے تھے۔ معمول تھا کہ ہر حالت میں ہفتہ میں کم از کم ایک دفعہ ضرور آتے تھے۔ ہماری کانفرنس اور احباب بریلی کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ناسازیٔ طبع کی بنا پر میں ان سے اسٹیج سکریٹری کا بھی کام لیتا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں میرے داماد سید وسیم الدین بلخی کا انتقال ہوا۔ اوائل ۱۹۸۳ء میں میرے جوان العمر لڑکے سید خالد علی کا

انتقال ہوا۔ ان دو حادثات نے مجھ کو کسی کام کا نہ رکھا۔ پروفیسر ایوب قادری کے انتقال سے مجھ کو مزید قلبی تکلیف پہنچی، لیکن ان معاملات میں سوائے صبر و شکر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ پروفیسر ایوب قادری کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی علمی و تعلیمی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین!

آخر میں یہ اور عرض کرتا چلوں کہ بوجہ ناسازئ طبع صبح کے وقت میں ان کی میت میں شریک نہ ہو سکا تھا تاہم معلوم ہوا کہ سوگواروں کا مجمع عظیم تھا اور کثیر التعداد کاریں وغیرہ تھیں۔ لیکن پانچ چھ گھنٹے بعد شام کو ان کے مکان پر تعزیت کر کے جب میں قبرستان ان کی تربت پر فاتحہ پڑھنے پہنچا تو وہاں مکمل سناٹا تھا اور ہمارے پیارے ایوب قادری اکیلے لیٹے ہوئے تھے۔ ہائے! استاد قمر جلالوی مرحوم نے شاید اسی کیفیت کے لئے لکھا تھا کہ ؎

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

⁂

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

"جو برابر یاد آتے رہیں گے۔"

مرنا تو سب ہی کو ہے مگر وہ موت بڑی روح فرسا ہوتی ہے جو قطعی غیر متوقع ہو، ایسی دردناک اموات میں قادری صاحب کا حادثہ جانکاہ ہے، وہ بروز جمعہ (۲۵ نومبر ۸۳ء) کو گھر سے چلے تھے اپنے ایک مخلص دوست سے ملنے کے لئے اور جا ملے اپنے معبود حقیقی سے، واقعہ یہ ہوا کہ راہ میں ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار کر ان کی علم پرور زندگی کا چراغ گل کر دیا یہ حسنِ اتفاق کہ اسی دن صبح کو یکایک ان سے ملنے کو میرا اتنا جی چاہا کہ اپنی ناسازیٔ طبع کے باوجود ان کے گھر چلا گیا، میری آمد کی اطلاع پاتے ہی اندر سے نکل آئے اور بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ تھاما اور ڈرائنگ روم میں لے گئے، دیر تک باتیں کرتے رہے، دورانِ گفتگو کہا کہ میں آپ کے چوتھے دادا حکیم عنایت حسین مرحوم کی فارسی تصنیف "آثارِ احمدی" کا اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ اُن سے میری

آخری ملاقات ہے آج شام کو وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب ان کی رحلت کی خبر سنی تو میں ششدر رہ گیا یقین ہی نہیں آیا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ان کے مرجانے کا کوئی اندیشہ ہی نہ تھا وہ بڑے صحت مند تھے، عمر بھی زیادہ نہ تھی، علمی دنیا کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، کئی تصانیف ان کے زیرِ قلم تھیں اور متعدد کتابیں لکھنے کے بڑے حوصلے تھے، یہ سب قدرت کے بے نیاز ہاتھوں نے خاک میں ملا دیئے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قادری صاحب کے دردناک سانحہ کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ قادری مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی اور وہ ۱۹۸۱ء میں بس کے حادثہ میں داغِ مفارقت دے گئے تھے، مرحوم دیندار ملنسار اور علم دوست انسان تھے کتابوں کی تجارت کرتے تھے ان کی قابلِ تقلید خوبی یہ تھی کہ تجارتی معاملات میں دیانت و صداقت کو مشعلِ راہ بنائے رکھا مجھے اُن کے خوش اخلاق اور ایماندار تاجر ہونے کا علم ان دنوں ہوا جب میں نیشنل کالج میں بحیثیت لائبریرین ان سے کتابیں خریدا کرتا تھا یاد رہے کہ ایماندار تاجر کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ اسے آخرت میں اعلیٰ مدارج عطا کئے جائیں گے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی بوڑھی ماں کو اپنے دونوں جوان بیٹوں کی انتہائی دردناک اموات کے صدمات برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

ان علم دوست بھائیوں کا وطن بھارت کے ضلع بریلی قصبہ آنولہ روہیلوں کا پہلا دارالحکومت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ریاست رام پور کے

سے پہلے روہیلوں کا تہذیبی مرکز آنولہ اور اس کے مضافات میں ٹانڈا تھا اس عہد کے شمالی ہند کے ادبار اور شعرار کی ایک اچھی تعداد یہاں جمع ہوگئی تھی اردو کے مشہور شعرار میں سوز، قائم اور مصحفی یہاں موجود تھے سودا آتے آتے رہ گئے پھر یہ بزم رامپور کی مستقل ریاست بننے کے بعد اُدھر منتقل ہوگئی۔

قادری صاحب (ابن مولوی مشیت اللہ قادری مرحوم) ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو بمقام آنولہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد نامساعد حالات کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد اپنی ذہانت و محنت کی بدولت نہ صرف ایم۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا بلکہ کراچی یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی، موصوف ۱۹۶۳ء سے رحلت (۱۹۸۳ء) تک فیڈرل گورنمنٹ اردو کالج، کراچی میں اردو کے ممتاز استاد رہے اسی زمانے میں ریسرچ کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی متعدد تحقیقی کتابیں اور مختلف موضوعات پر نہایت وقیع مضامین لکھے ان علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی بنا پر ان کا شمار پاک و ہند کے ممتاز مصنفین اور محققین میں ہوتا تھا ان کی تصانیف میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، انہیں ترجمہ کرنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی، مآثر الامرار کی تین ضخیم جلدوں اور شیخ جمالیؒ کی سیر العارفینؒ کے فارسی سے اردو میں ترجمے کئے ان کے علاوہ وقائع عبدالقادر خانی کو علم و عمل کے نام سے مرتب کرکے اس پر قیمتی حواشی تحریر کئے۔

قادری صاحب میں قدرت نے بہت سے محاسن یکجا کر دیئے تھے وہ بڑے خلیق، ملنسار، دوست نواز اور حقیقت پسند انسان تھے مختلف علوم پر قیمتی سے قیمتی معلومات نوکِ زبان رہتی تھیں، واقعی وہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے، ان کی یہ امتیازی خصوصیات بھی قابلِ ذکر ہیں کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے، درس و تدریس کے فرائض ادا کرنے کے دوران تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے اور اپنے کتب خانے کے لئے کتابیں جمع کرنے کے ذوق و شوق کی تکمیل کرتے رہتے تھے، ان کے قیمتی کتب خانے کے بارے میں پاکستان کے مشہور و معروف مصنف اور محقق جناب ثناء الحق تحریر فرماتے ہیں:-

"قادری صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا شوق بھارت کے قیام ہی میں کافی ہو گیا تھا چنانچہ وہاں بھی انہوں نے مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا کچھ کتابیں انہیں خاندانی ورثے میں بھی ملی تھیں پاکستان آنے کے بعد اس شوق میں بے انتہا ترقی ہوئی چنانچہ نامساعد حالات میں رہ کر اور مالی مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے شوق کو جس طرح پورا کیا اس کا تذکرہ ہر شخص کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

قادری صاحب نے اس شوق کے پیچھے بسا اوقات اپنی بنیادی ضروریات کو تج دیا اور جس طرح ممکن ہوا کتابوں کی فراہمی کر کے وہ اپنے دماغ کو معلومات سے اور کتب خانہ کو ہر قسم کی مطبوعات اور مخطوطات سے پُر کرتے رہے کچھ کتابیں بھارت سے منتقل کیں لیکن بیشتر پاکستان ہی میں جمع کی گئیں۔ یہ اسی شوق

بے پایاں اور جہد مسلسل کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ان کے معدنِ علمی کو گہر ہائے آبدار اور جواہر بے بہا سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں ایک ایسے آدمی کے لئے جس کے ذرائع و وسائل محدود ہوں اتنا بڑا نجی کتب خانہ اتنی کم مدت میں بنا لینا یقیناً حیرت خیز ہے لیکن دیکھا جائے تو انسان کی لگن اور کوشش سے اس سے بھی زیادہ محیر العقول کام انجام پا جاتے ہیں"۔

کتابوں سے مرحوم کی شیفتگی و وابستگی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی تلاش و جستجو میں سفر بھی کیا کرتے تھے جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے، پرانے خاندان کے افراد سے مل کر ان کے ذخائر کتب کا غائر نظر سے جائزہ لیتے اور نایاب کتابوں کی نقول حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اس سلسلے میں انہیں جو شدید مشکلات و تکالیف اٹھانی پڑتی تھیں ان کا اندازہ موصوف کے سفر اوچ سے ہو جائے گا وہ لکھتے ہیں کہ:

جب وہاں جہانیاں جہاں گشت کی خانقاہ کے مجاور خلیفہ غلام محمد سے ملاقات ہوئی اور عرض مطلب کیا تو انہوں نے ایک کتاب "مناقب الاصفیاء" (قلمی) فوراً پیش کر دی، مگر جیسے ہی ہم نے اخذ و اقتباس کا آغاز کیا تو فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور نقل سے مانع ہوئے بمشکل اس کتاب سے بعض اقتباسات لئے جا سکے"۔ اوچ میں جہانیاں جہاں گشت کے موروثی سجادہ نشین نوبہار شاہ سے اپنی ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے "سنہ ۱۹۶۲ء میں ان کے یہاں سے ناکام واپس آیا تھا، اب کی مرتبہ پھر کوشش کی گئی اس دفعہ کی حاضری کے بعد سجادہ نشین اور ان کے صاحبزادوں نے خاندانی اسناد و فرامین وغیرہ دکھائے مگر جب اصل ملفوظات کی بات آئی تو حسب عادت ٹال مٹول کرنے لگے بہت مشکل سے خزانۂ جلالی۔

جواہر جلالی مظہر جلالی اور جامع العلوم کے نسخے دکھائے۔ یہ کتابیں
حضرت مخدوم کے حالات کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں"۔

مرحوم کتابوں کی خاطر بھارت بھی گئے اور علی گڑھ، رام پور، کلکتہ وغیرہ کے کتب خانوں سے ملفوظات حاصل کئے۔ علمی سفر ہی کی بدولت ان سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس برس پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہاں کے نادر مخطوطات سے استفادہ کرنے اس زمانے میں علی گڑھ گئے تھے۔ جب میں اس لائبریری سے منسلک تھا میرے کراچی منتقل ہونے کے بعد ان سے مراسم رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ عیدین پر ان کا میرے یہاں آنا کبھی ناغہ نہیں ہوا وہ میری بوڑھی عمر کا یہ الاؤنس بھی دیتے تھے کہ اپنی مصروف زندگی میں سے میری ملاقات کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے ان کا یہ بڑا کرم تھا کہ انہوں نے اپنی قیمتی لائبریری سے استفادہ کی سہولتیں مجھے فراہم کر دی تھیں اور جب ان کی نئی تصنیف شائع ہوتی تو میرے مانگے بغیر مجھے مل جاتی اور کبھی کبھی اس ضمن میں وہ میرے یہاں آیا کرتے اس طرح کتاب کے ساتھ اس کے لائق و فائق مصنف سے بھی نیاز حاصل ہو جاتا تھا۔ یہ خلوص و محبت سے بھری ہوئی صحبتیں بالخصوص ان سے میری آخری ملاقات کی یاد میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

قارئین کرام! میرے قادری صاحب کو مردہ مت کہیئے وہ اپنی ماں، بیوی بچوں، اپنے دوستوں شاگردوں اور اپنی تصانیف کے قارئین کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

مشفق خواجہ

دبستانِ شبلی کا ایک نمائندہ

دبستانِ شبلی سے مراد اگر ایک مخصوص حلقے کے اہلِ قلم نہ ہوں اور اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کیا جائے تو وہ تمام اہلِ قلم جو ادب اور تاریخ سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو دبستانِ شبلی کے وابستگان میں شمار کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو بھی دبستانِ شبلی کا نمائندہ سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تاریخی سوانح و ادبی موضوعات پر یکساں طور پر دادِ تحقیق دی ہے۔ قادری صاحب نے اپنی تقریباً دو درجن تصنیفات و تالیفات اور مرتبات کے ذریعے تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے جس کی مثالیں موجودہ زمانے میں بہت کم ملتی ہیں۔

قادری صاحب کے ادبی و علمی کاموں کو اگر چند لفظوں میں بیان کیا جائے تو بات کچھ اس طرح ہوگی کہ انھوں نے اردو میں حوالہ جاتی ادب پر بےحد اہم کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان میں سب سے زیادہ کمی اسی نوعیت کے کام کی ہے حالانکہ یہی کام ہر طرح کی تحقیق کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے محقق جب کسی موضوع پر کام کرتے ہیں تو ان کا زیادہ وقت اسی تلاش میں صرف ہوتا ہے کہ ان کے موضوع سے متعلق مواد کہاں ملے گا۔ قادری صاحب نے اہلِ تحقیق کی اسی مشکل کو آسان کیا ہے۔

قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آتے ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسائشوں سے بےنیاز رہ کر خدمتِ علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا۔ قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً ۲۶ برسوں سے ہیں۔ میں نے اس دوران میں انھیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی کام کی لگن میں سرشار ملے۔ کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے تو کبھی کسی مخطوطے کا، کبھی کسی گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے تو کبھی کسی معروف مصنف کے کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے کہ ان سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ ان دیوانوں سے ابھی خالی نہیں ہوا جو ہمیشہ

"بیکارِ علم" ہشیار رہتے۔

قادری صاحب کی زیرِ نظر کتاب ان سوانحی مضمون کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ یہ مضامین جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مرحومین کے بارے میں ہیں۔ اُن میں سے بیشتر ایسے ہیں جو متعلقہ افراد کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے اور بعض مضامین ایسے افراد کے متعلق ہیں جن کا انتقال ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۴ء تک کے دوران ہوا۔ اس دور کے جن افراد پر لکھا گیا ہے ان کے بارے میں بعض نئی معلومات کی فراہمی کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بعد کے دور کے اشخاص پر لکھے ہوئے ان کے مکمل حالاتِ زندگی قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ قادری صاحب نے ان اشخاص سے اپنے ذاتی تعلقات کی روداد بھی بیان کر دی ہے اس اعتبار سے یہ مضامین شخصی خاکے بھی ہیں اور مختصر سوانح عمریاں بھی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ قادری صاحب نے بیک وقت خاکہ نگار اور سوانح نویس کا فریضہ انجام دے کر خاکہ نگاری اور سوانح نویسی کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان مضامین کی دلچسپی اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

ان مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کچھ افراد کے بارے میں قادری صاحب نے ایسی معلومات پیش کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قادری صاحب نے ان افراد کی زندگی ہی میں اُن سے اُن کے متعلق بنیادی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ مثلاً ابن انشاء کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ خود ابن انشاء کے فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان معلومات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

قادری صاحب کے شخصی سوانحی مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ ایک مجموعے میں نہیں سما سکتے۔ جو مضامین زیرِ نظر مجموعے میں شامل نہ ہو سکے انھیں دوسری جلد میں شامل کیا جائے گا۔ اور جب تک یہ جلد شائع ہوگی اس وقت تک مزید مضامین لکھے جا چکے ہوں گے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں، اگر "کاروانِ رفتہ" بھی مالک رام صاحب کی گراں قدر تصنیف "تذکرۂ معاصرین" کی طرح ایک سلسلہ وار کتاب بن جائے۔

(دیباچہ کاروانِ رفتہ)

مُخلص معلّم اور جاں نِثار مُتعلّم

(ڈاکٹر محمد ایوب قادری)

معلّمی کی عظمت ایام دیرینہ سے مسلّم ہے۔ یہ وہ روحانی واسطہ ہے جو ہمیشہ محترم و معزز گردانا گیا ہے۔ البتہ معلمین کو اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرنی لازمی ہیں جو اس بزرگی کی اساس بنتی ہیں۔ تحصیلِ علم کے ساتھ مہارتِ تدریس و تربیت اس فریضے کے اہم شعبے ہیں۔ یہ تینوں شعبے اپنے عمل سے بیّن اور اپنے نتائج سے مسلّم ہوتے ہیں ان تمہیدی الفاظ کے پس منظر میں میرے ذہن میں اس وقت اِن صفات کی متحمل اس شخصیت کی یادیں موجزن ہیں جو عرفِ عام میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے نام سے موسوم تھی۔ ان کی جدائی کو ایک برس سے زیادہ ہو رہا ہے۔ وہ حسبِ عادت مطالعہ کرتے ہوئے ایک ہنگامہ خیز اور قیامت انگیز مصروف شاہراہ پر شوقِ علم اور ذوقِ ملاقات میں پا پیادہ راہ گیر بنے چلے جا رہے تھے کہ کسی بے اصول، بد رفتار کرشمۂ ایجاد کی زد میں آ گئے۔ راہِ ذوق کو چھوڑ سوئے آخرت عازمِ سفر ہو گئے مانا کہ انسانی زندگی بھی سفر ہے۔ نہ آنے کی سمت معلوم نہ جانے کی منزل کی پہچان۔ یقیناً ہم سب پابندِ سفر ہیں

مگر جب اس غیر معین سفر کا اختتام عام مشین کے دم تیز سے رونما ہو تو معاشرے
کی بے بسی اور انتظامیہ کی بے حسی کا افسوسناک پہلو آشکار ا ہوتا ہے۔
فطرت ہم پر ہنستی ہے کہ انسان اللہ کی مخلوق اور اس کی جانی دشمن خود
اللہ کی تخلیق۔ یہ انسان کی رفتارِ فرار ہے جو اس کی حماقت کی رازدار ہے۔
گرنا اور بکھرنا کی ہوش افزا و ہوش ربا مثال ہے۔ مگر جب عرصۂ حیات
تنگ ہو چکا اور شمارِ یوم و شب اختتام کو پہنچا تو بس

مرضی مولا از ہمہ اولیٰ

انسان مجبورِ محض ہے۔ قادری صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے
ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے میری یاد اللہ گزشتہ دس سال سے تھی۔
میں نے جب انجمن میں ملازمت اختیار کی تو ان سے رسمی صاحب سلامت
کا آغاز ہوا۔ ہماری اجنبیت اپنائیت میں بدلتی گئی۔ مرحوم انجمن کے اردو
کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ وہ عموماً شام کی جماعتوں کو پڑھاتے اور
درس سے قبل انجمن کے دفتر میں آکر ملاقات کرتے اکثر مختصر مگر کبھی طویل
اور مفصل۔ ہفتے میں کم از کم تین دن ضرور ملتے۔ کبھی سلام دعا ہی ملاقات
ٹھہرتی اور کبھی بحث و مباحثہ کی نشست ہو جاتی وہ وقت کے قدردان
اور گفتگو میں نرم رو ہوتے۔ ہماری ملاقیں اردو کے لسانی مسائل اور نازیبی
معاملات پر مبنی ہوتیں۔ ہم اپنے تجربات کا تبادلہ کرتے۔ وہ میری عمر اور
تجربے کا احترام کرتے۔ میں ان کے علمی ذوق کا پرستار تھا اس طرح
انجمن میں علمی سطح پر ہمارا لین دین مساویانہ ہوتا تھا۔ ان کی علمی جہات
مختلف تھیں۔ تحقیق، تنقید، تاریخ، ترجمہ اور خاکہ نویسی وغیرہ۔ ان کا
تذکرہ مجھ سے کم ہوتا تھا مگر میں ان کی رفتار سے اُن کی فکر کا اندازہ لگا لیتا

انہوں نے سیاست، مذہب اور انتظامیہ کے متعلق مجھ سے کبھی کوئی خاص بات نہیں کی۔ وہ اساتذہ کے مداح اور شاگردوں کے بہی خواہ تھے، ہماری گفتگو کا رخ بیشتر اردو زبان کے ارتقا اور اس کے پھیلاؤ سے متعلق ہوتا ہم شمالی ہند اور وادیٔ سندھ میں اردو کی تاریخ پر غور کرتے۔ شمالی ہند کے علاقے روہیلکھنڈ کی لسانی و ادبی خدمات موضوع بحث ہوتیں۔ میں اس علاقے کو براعظم روہیل کھنڈ کہہ کر ان کی ہمدردی کو اکساتا۔ وہ ہنستے اور میری تائید میں اس علاقے کی قدیم سرکار کا کوئی ادبی واقعہ سناتے۔ ان کا تعلق آنولہ اور بدایوں سے تھا اور میں خاص سنبھل میں پیدا ہوا اس علاقے کی تاریخ ایک، اور لسانی خصائص بھی ایک ہم دونوں اردو کے رامپور اسکول کو اور دبستانِ سرکارِ سنبھل کو سراہتے اور تحقیقِ زبان کے پہلو متعین کرتے۔ ہم سوچتے کہ شمالی پاک و ہند میں اردو قدیم کا ایسا مخطوطہ کیوں دریافت نہیں ہوتا جو چودھویں صدی سے قبل کا ہو۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی میرے مطالعے میں رہتی میں اس کی زبان کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرتا۔ وہ سنتے اور کہتے کہ شمالی پاک و ہند کا اس سے قدیم تر اردو مخطوطہ ملے تو پھر مثنوی نظامی کے تقابل سے کچھ بات بن سکتی ہے ورنہ باقی سب قیاس آرائیاں ہیں۔ وہ قدیم ادب کی تلاش میں رہتے اور پاک و ہند میں اپنے ادبی دوستوں سے اعانت کے طالب ہوتے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اس بحث و مباحثہ کے علاوہ مرحوم کے علمی و ادبی اشغال مختلف نوعیتوں کے تھے جن کی برآمدی اور تکمیل یا نہ ہونا میرے ساتھ گفتگو کے دائرے سے باہر تھی۔ کبھی کبھار ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

کی موجودگی میں مختصر گفتگو ہوتی جس کا روئے سخن بیشتر ابوسلمان صاحب کی طرف ہوتا۔ میں نے چند بار ان سے ان کے طرز تحریر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا انہوں نے میری باتیں غور اور شوق سے سنیں۔ مرحوم علم کے رسیا تھے۔ وہ وقت کو ضایع کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ ان کی گفتگو اکثر بول چال کی زبان میں ہوتی۔ دوران گفتگو وہ اپنی علمی قابلیت سے سامعین کو متاثر کردیتے۔ اختلاف جتاتے اتفاق سراہتے اور بحث کے علمی نکات کو اپنی گرہ میں باندھ لیتے۔ وہ ہر جگہ سے سیکھ اور سکھا کر اٹھتے تھے۔ مطالعۂ کتب ان کا وظیفہ حیات تھا۔ کتاب ان کی نفسِ ناطقہ تھی وہ ہمہ وقتی طالب علم گویا متحرک مجسمۂ علم تھے۔ علم ان کا ذریعۂ معاش تھا مگر معاش کے حصول میں معیارِ مقررہ سے نیچے نہیں اترتے تھے۔

مرحوم کا خانوادہ خوش حال اور علمی روایت کا حامل تھا۔ مگر ان کی اعلیٰ تعلیم اور تصانیف کی اشاعت ان کی ذاتی محنت و ایثار کا نتیجہ تھی۔ وہ مادی افادے سے زیادہ علمی قابلیت کے طالب تھے۔ ان کی تدریس، تقریر اور تحریر میں سلاست اور علمیت ہوتی تھی۔ وہ تاریخ کے نئے نکات حوالوں سے قاریوں کو متحیر اور مصنفین کو بھونچکا کردیتے تھے وہ علم کی دنیا میں آگے بڑھنے کے خواہاں تھے۔ وہ طلبِ علم میں مسافرت کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ تعطیلوں میں عموماً گھر سے باہر رہتے۔ غرض کہ سفر و حضر دونوں میں وہ علم کے جویا تھے۔

انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص سے انہیں محبت تھی۔ انھوں نے اس سے استفادہ کیا تھا اور اب بھی حوالوں کی تلاش میں کتب بینی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد

جناب جمیل الدین عالیؔ کو اس امر پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اردو کے فارسی تذکروں کا اردو میں ترجمہ کریں گے اور انجمن شائع کرے گی۔ مگر کسی کتاب کا آغاز نہ کر سکے۔ قدیم اردو کی ایک مثنوی موسومہ مشکلن کسی مخطوطے سے تیار کر کے اشاعت کے لئے دی گئی مگر اس کا مقدمہ نہ لکھ سکے۔ وہ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ وہ مخطوطوں کی خواندگی میں بھی معاون ہوتے تھے۔ دراصل وہ علمی لگن کے انسان تھے۔ ان جیسے لوگ خال خال ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور ہندی سے بخوبی واقف تھے اور ان زبانوں کے ادب کو زیر مطالعہ رکھتے تھے۔

مرحوم اپنے محسنوں کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔ پیر حسام الدین راشدی مرحوم، ممتاز حسن مرحوم، سید الطاف علی بریلوی اور مشفق خواجہ صاحب وغیرہ کا تذکرہ زیادہ کرتے تھے۔ لاہور کے بعض اداروں اور ان کے منتظمین کی تعریف میں بھی رطب اللسان رہتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ وہ سب سے ملتے اور تقاریب میں شریک ہوتے۔ ان کا یہ اقدام کراچی جیسے شہر میں مستحسن ہی نہیں بلکہ بے مثال ہے۔ اسلام آباد کی ادبی تقاریب میں وہ اکثر میرے ساتھ قیام پذیر ہوتے اور میری مجبوریوں کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے۔ آغازِ سفر سے واپسی تک وہ میرے رہنما اور نگہبان بنے رہتے۔ وہ مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ یہ چند بے ربط سطریں مرحوم کو بطورِ ادنیٰ خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ قادری صاحب اپنے معلمانہ، اور ادیبانہ انداز میں دورِ حاضر کے اساتذہ کے لئے نمونۂ اتباع ہیں۔ ان میں بشری کمزوریاں تھیں جو ہماری لازمۂ فطرت ہیں۔ جب وہ متوازن ہوں تو قابلِ تعریف رہتی ہیں۔ مرحوم ایک مخلص معلم، جاں نثار متعلم اور معاملہ فہم انسان تھے۔ وہ اپنی راہ میں علم کے شہید ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ (آمین)

جناب ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کے تصوّر کے ساتھ ہی علمائے سلف کا تصور بھی میرے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ اُن علماء کے بارے میں پڑھا اور سُنا ہے کہ ہر قسم کے نام و نمود سے بے پروا۔ زندگی کی نام نہاد آسائشوں سے متنفر اپنے اپنے گوشوں میں بیٹھے ساری زندگی علم کی خدمت کرتے رہے اور علم کی لگن سے سرشار رہے۔ علم اُن کا اوڑھنا بچھونا۔ کھانا پینا نہیں مقصدِ حیات تھا اور اسی مقصد کی جستجو میں ان لوگوں نے اپنی زندگیاں گزار دیں۔ ہمارے دَور میں ایوب قادری ایک ایسے ہی عالم تھے جنہیں دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

قادری صاحب سے میری بڑی پرانی یاد اللہ تھی۔ جس زمانہ میں وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے وابستہ تھے تو اُن سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ قادری صاحب کی وضع اُس زمانے میں بھی وہی تھی جو آخری زمانے میں تھی۔ معمولی پاجامہ شیروانی۔ گرمیوں میں کبھی کبھی بش شرٹ

اور پتلون۔ لباس میں نہ کوئی اہتمام نہ تکلف بس پہن لیا۔ دراصل ان کی زندگی میں ان تکلفات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ متوسط قد مضبوط جسم گول چہرہ۔ آنکھوں میں عزم اور حوصلہ مندی کی جھلک۔ چہرے پر مستقل مزاجی اور محنت کے آثار۔ غیر معمولی محنتی انسان تھے۔ ساری زندگی محنت کرتے رہے۔ ملازمت ہی کے دوران بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ساری ڈگریاں ملازمت ہی کے زمانے میں حاصل کیں۔ فرائض منصبی بھی تندہی سے انجام دیتے رہے اور علمی کاموں میں مشغول رہے۔

میرے پاس مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کی تاریخ فرخ آباد کا ایک قلمی نسخہ ہے جو خاندانی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کا اردو ترجمہ شایع کیا ہے۔ ایک شام قادری صاحب حکیم محمود میاں کے ساتھ میرے یہاں آئے محمود میاں نے کہا کہ قادری صاحب تاریخ فرخ آباد کا نسخہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ غالباً کانفرنس والے ترجمے کا دیباچہ لکھنا مقصود تھا۔ میں نے مخطوطہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ قادری صاحب بڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ میں نے کہا کیا سوچ رہے ہیں مخطوطہ لے جائیے۔ اطمینان سے کام کر لیجیے پھر مجھے واپس کر دیجیے گا۔ بڑے خوش ہوتے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آپ سے اتنے عرصے سے تعلقات ہیں پھر بھی آپ محمود میاں کو ساتھ لائے۔ کیا ویسے میں کتاب آپ کو نہ دکھاتا۔ کہنے لگے ہاں آپ صحیح کہتے ہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔ قادری صاحب کتاب لے گئے اور مجھے بحفاظت تمام واپس بھی دے گئے۔ کسی پرانی کتاب یا نایاب نسخے کو دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک عجیب چمک پیدا ہو جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان پر وجد کی کیفیت طاری ہے۔ دیکھتے تھے خوش ہوتے تھے۔

دوسرے نسخوں کا حوالہ دیتے تھے۔ ان کا علم بڑا حاضر اور یادداشت غضب کی تھی۔ قومی تاریخ کے مختلف گوشوں پر محرمانہ نظر رکھتے تھے۔ قیامت کے ذکر سے کسی کی جوانی تک تو بات نہیں پہنچاتے تھے لیکن ایک حوالے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیتے تھے جس سے موضوع متعلقہ کا تمام دستیاب مواد سامنے آجاتا تھا۔ ہم سب ان کی اس صفت سے بھرپور استفادہ کرتے رہتے تھے اور بسا اوقات کتب خانوں کی فہرستیں دیکھنے کے بجائے ان کی ذاتی یادداشت سے فائدہ اٹھاتے۔

قادری صاحب کو کتابوں سے عشق تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ان کے اس عشق لازوال کی زندہ یادگار ہے۔ انھوں نے بڑی محنت سے کتابیں جمع کی تھیں۔ خدا معلوم کہاں کہاں مارے پھرے۔ اس چکر میں دورے کرتے رہتے تھے۔ شہروں میں تو سب جاتے ہیں وہ دیہاتوں میں بھی جاتے تھے۔ مدرسے، خانقاہیں۔ کتب خانے ذاتی ذخیرے سب کھنگال چکے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کونسی کتاب کس کے پاس ہے۔ کس سے مل سکتی ہے اور کس حالت میں ہے علمی معلومات فراہم کرنے میں وہ بڑے فراخ دل تھے۔ دوست احباب۔ شاگرد سب ان سے معلومات حاصل کرتے تھے اور وہ نہایت خندہ پیشانی سے سب کی مدد کرتے تھے۔ میں نے بعض تحقیق کے طلبہ کو ان کے پاس بھیجا۔ قادری صاحب نے بڑی محبت سے ان کی گفتگو سنی اور ماخذ کے سلسلے میں ان کی مدد کی پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا! میں اکثر لوگوں کو ان کے پاس بھیجتا تھا اور وہ ان سب کو

معلومات فراہم کرتے تھے۔

قادری صاحب کے جوہر اردو کالج میں اور زیادہ چمکے۔ وہ ایک شفیق اور لائق استاد تھے۔ اصول اور ضابطے کے پابند تھے۔ ان کی وفات سے چند برس پہلے اردو کالج میں ایم۔ اے کی کلاسوں کا سلسلہ شروع ہوا اردو کے سلسلے میں یونیورسٹی کے بعض اساتذہ بھی کلاس لینے کالج آتے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ قادری صاحب صدر شعبہ کی حیثیت سے ہمارے لئے تمام سہولتیں فراہم کرتے تھے۔ کلاسیں شروع ہونے سے پہلے فون کر کے ٹائم ٹیبل بتا دیتے تھے۔ تدریس کی تفصیل سے آگاہ کر دیتے۔ رجسٹر تیار کروا دیتے۔ غرض یہ کہ کل کام کر رکھتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ میں عموماً تین بجے پہنچتا اور پہلے انجمن میں کاظمی صاحب کے پاس جاتا یہاں بالعموم قادری صاحب بیٹھے ہوتے ملتے۔ کالج سے ذرا بھی فرصت ملتی تو وہ کاظمی صاحب کے پاس آجاتے تھے اور دونوں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ یہاں چائے کا ایک دور چلتا۔ کچھ دیر باتیں ہوتیں پھر ہم دونوں کالج چلے جاتے اور پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔ بعض اوقات کاظمی صاحب موجود نہ ہوتے تو قادری صاحب اسٹاف روم میں ملتے۔ صورت دیکھتے ہی چاء منگواتے اور بتا دیتے کہ کاظمی صاحب کیوں نہیں ہیں۔

مرحوم کے مزاج میں سادگی اور کسی قدر شدت پسندی تھی۔ وہ جس چیز کو اچھا سمجھتے تھے اسے برملا اچھا کہتے جو بات ناپسند ہوتی اسے کبھی اچھا نہ کہتے۔ ان میں جرأت کردار ہی نہیں جرأت گفتار بھی تھی لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔ ان کی شخصیت سادہ اور واضح تھی۔

اسی وجہ سے ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ لاہور۔ پنڈی اور پشاور میں ہونے والی بعض کانفرنسوں میں، میں نے دیکھا ہے کہ کانفرنس کی کارروائی کے بعد قادری صاحب ایک بہت بڑے حلقے میں گھرے ہوئے ہیں اور لوگ انہیں لئے لئے پھر رہے ہیں وہ بھی خوش خوش کتابیں دیکھنے کے شوق میں بے چون وچرا ان لوگوں کے ساتھ دوڑتے پھر رہے ہیں۔

قادری صاحب کی موت بڑی دردناک تھی۔ اچھے بھلے تھے وفات سے ایک دن پہلے فون پر بڑی دیر تک گفتگو ہوئی۔ خبر سنی تو بہت دیر تک یقین نہ آیا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال آتا رہا کہ ٹریفک کے یہ جان لیوا حادثے کیوں ہوتے ہیں کیا انسانوں کے اس جنگل میں صرف جنگل ہی کا قانون چلے گا۔ انسان کا کوئی احترام نہیں کیا جائے گا۔ ایوب قادری جیسا محقق روز روز نہیں پیدا ہوتا۔ اب اتنا ریاض اور اتنی محنت کون کرے گا۔ پوری زندگی علمی تحقیق کے لئے کون وقف کرے گا۔ زندگی کی آسائشوں کو تج کر بارگاہِ علم و ادب میں کون معتکف رہے گا۔ خدا کی رحمتیں ہوں ایوب قادری پر۔ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ذوق تحقیق کا ایک باب ختم ہو گیا۔

محمد بشارت علی

پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری

پروفیسر موصوف سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ وہ ڈاکٹر معین الحق کے ادارے میں کام کر رہے تھے۔ جو رسالہ ڈاکٹر صاحب کے زیر سرپرستی تاریخ کے موضوع پر شائع ہوتا رہا ہے اس میں ڈاکٹر صاحب تاریخی موضوعات پر جامع اور بسیط مقالے لکھا کرتے تھے۔ مقالہ نگاری کے علاوہ وہ رسالہ کو بھی مدون کرتے تھے۔ ان کے مقالے نہایت ہی محققانہ ہوتے تھے۔ اور ان کی تحریریں ادبی شان ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اردو ادب کے مایۂ ناز سپوت تھے جنہوں نے اردو ادب کی خدمت میں اپنی عمر صرف کر دی۔ ان کی طرز تحریر ان کی باطنی روحانیت کی غماز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی تحریروں میں روحانیت اور مذہبیت کا غلبہ ہے۔ وہ اسلام کے شیدائی تھے اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے ادب کے ذریعہ مذہبی کیفیات کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اسلوبِ بیان کا جہاں تک تعلق ہے اس میں ایک خاص قسم کی شان پائی جاتی ہے۔ اسی شان کے اظہار سے ان کی شخصیت ایک خاص انفرادیت

اور کم و کیفیات کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اسلوب تحریر میں عربی فارسی کا غلبہ ہے اور اس سے ان کی زبان اور طرز تحریر میں ایک گونہ دقت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر یہ دقت قاری کے لئے الجھاؤ اور پریشانی کا موجب نہیں بنتی۔ بڑی آسانی کے ساتھ مدعا کے سمجھنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ طرز تحریر میں عربی کے اثر سے اُن کا اسلامی مزاج ابھر کر ان کی ثقافتی ذہنیت کے سمجھنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا بعض مصنفین کا خیال ہے کہ سلاست اور آسانی پیدا کرنے کے لئے عربی الفاظ اور طرزِ ادا سے گریز کیا جائے تو بہتر ہے۔ سہولت کی خاطر مزاج عقلی اور ثقافتی ذہنیت کو مسمار نہیں کیا جا سکتا۔ سلاست اگر شخصیت کے پائمال کرنے کا موجب ہو تو ادب اپنی شان کو کھو دیتا ہے۔ ادب کی عظمت کا راز ادیب کی شخصیت کا اظہار ہے۔ یہ شخصیت اور بھی زیادہ پُرشکوہ ہو جاتی ہے، جب ادیب کی تحریر اس کی ثقافت، ثقافتی ذہنیت، مقومات اور نظام اخلاق کی ترجمان بن جائے۔ سہولت سے بلا شبہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے لیکن اس سہل انگاری سے دوسرا عیب یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی علمی عظمت پائمال ہو جاتی ہے۔ جس قدر دقت کے ساتھ مدعا و منتہیٰ کے سمجھنے میں کاوش کی جائے اسی قدر قاری میں علم آگاہی تجسس و تحقیق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ایوب ہمہ العمادی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مورخ بھی تھے، ادیب، نقاد، نثار اور ناظم بھی تھے۔ ادب کے رموز سمجھنے کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ شعر کو خوب سمجھتے تھے۔ شعر کے سمجھنے اور سمجھانے میں انہیں بڑی مہارت تھی۔ آج کا شاعر آئین شعری سے واقف نہیں۔ عروض و قوافی بحور اور اوزان کا شاید ہی بہت کم شعرا کو کوئی علم ہو۔ شعر کے لکھنے میں آج کل زیادہ تر موسیقی اور لحن داؤدی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ادب میں یک گونہ

بے راہ روی پیدا ہوگئی ہے۔ شعراء معاشرے اور ادب کے تعلق سے بہت کم واقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہمارے ثقافتی موثرات کے حوالے سے اور معاشرے کی سطح سے ابھرتا ہے۔ لیکن ہمارے ادبا یہ نہیں جانتے کہ معاشرہ کیا ہے ثقافتی ذہنیت کیا ہے اور معاشرے کے افراد اور شخصیات سے کیا تعلق ہے۔ معاشرہ بظاہر کوئی مرئی حقیقت نہیں لیکن اس کے باوصف معاشرے کے بغیر ہمارا جینا محالات سے ہے۔ ادب کو معاشرے پر اثرانداز ہونا چاہیے اور یوں ادب اور معاشرے کا عمل اور ردِ عمل ادب اور معاشرے کے لئے بقاء قوت کا موجب بن جائے۔

ایوب قادری صاحب نے اس تصور کے تحت ادب کی دنیا میں قدم رکھا اور اسی استحالۂ قوت کے تحت وہ مرتے دم تک لکھتے رہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ لاشعوری طور پر عمرانیات ادب کی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔ آج کی دنیا میں حقیقت یہ ہے کہ ادب اصنافِ ادب، شاعری نقد و محاکمے اسی وقت بااعتنا ہو سکتے ہیں اگر ادبا عمرانیات اور نفسیات حرکیات کا تصور بہ نغمہ بظاہر جدید فکری اور ادبی تحریک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے لیکن تھوڑے سے غور سے اس معاملے کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ عمرانیات اور نفسیات حرکیت، شاعری اور ادب کے ہر تہہ اور مقتضیات میں داخل ہے۔ ڈاکٹر منظفر شریف نے جو کتاب "نفسیات کے اظہاریں" (Ego/Involvement) پر لکھی ہے اس کے ایک باب جس کا تعلق ادب سے ہے لکھتے ہیں کہ ادب کی ہر صنف میں جب تک ہیں کا اظہار بہ تعلق معاشرتی اور ثقافتی موثرات نہیں ہوتا اس وقت تک ادب میں وقت اور طنطنہ نوازی کے کیفیات پیدا نہیں ہوتے یہ ہی وہ

تاثرات جو میں نے ایوب قادری کی تحریروں سے استقرائی انداز میں حاصل کئے ہیں۔ قادری صاحب ہمیشہ مجھ سے مسکراتے ہوئے لیکن اپنی شخصیت کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ملتے رہے ہیں۔ ان سے میری آخری ملاقات اردو کالج کے اساتذہ کے کمرے میں ہوئی اور بڑی شگفتہ مزاجی کے ساتھ انھوں نے مجھے دعوت دی کہ ایک مذہبی محفل میں عمرانیات قرآن پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ابھی یہ بات پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ قادری صاحب حادثہ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

اُن کی یاد محفوظ رہ سکتی ہے اگر وہ تعلیمی ادارہ جہاں وہ ادبی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کی معاونت میں ان کے اقربار اور اولاد کا فریضہ ہے کہ ان کے تمام کاموں کو مدون کر کے شائع کریں اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انکی ادبی تحریک نوجوان ادبا کے لئے شمع راہ کا موجب بن جائے گی۔ میں نے یہ چند سطور اس یادداشت پر لکھی ہیں کہ جو انکی تحریروں کو بہت عرصہ پہلے پڑھ چکا تھا بالخصوص ان مقالات کے نقوش میرے قلب و دماغ میں تازہ تھے جو معین الحق صاحب کے تاریخی میگزین میں شائع ہوئے تھے اگر ان کی تحریریں کتب اور مقالے بہم دست ہوتے تو میں ایک مستند مقالہ لکھ سکتا۔ یہ بات بہرحال وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دور جدید کے ادب میں ایوب قادری اور ان کی تحریریں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ خدا کرے کہ انکی تحریریں ہمارے ادب کی بے راہ روی کے اتلاف کا موجب ہوں اور ہمارا موجودہ ادب ہماری معاشرت اور ثقافت اور ثقافتی ذہنیت، نظام اخلاق، مزاج عقلی، اسلامی روحانیت باطنی انفرادیت، جمعیت اور جامعیت کا آئینہ دار اور ترجمان بن جائے۔

❊

جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

ایوب قادری صاحب

یہ واقعہ ۱۹۷۲ء کا ہے۔ میں ایک روز ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے دولت کدہ "زیبا منظر" میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کہ ضعیف العمر ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی ایک ضرورت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ میرے ایک جد اعلیٰ امیر تیمور کے اتالیق تھے۔ اب میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ ان کا نام کیا تھا۔" مُستفسر نے یہ سوال ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے اس لئے دریافت کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے لاعلمی ظاہر کی۔ وجہ ظاہر تھی۔ تاریخ میں ہزاروں شخصیتوں کا تذکرہ آتا ہے کوئی مورخ تمام شخصیتوں کو اپنے حافظہ میں کس طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ

" وہ اردو کالج جائیں وہاں ایوب قادری صاحب

سے ملیں اور ان سے دریافت کریں شاید وہ بتا سکیں۔"

ایوب قادری صاحب کی علمی عظمت کا پہلی بار مجھے اندازہ اسی دن ہوا۔ حالانکہ ان سے میرے ذاتی اور قریبی تعلقات ۱۹۶۲ء سے تھے مگر چونکہ میرا مضمون سائنس اور اُن کا اُردو تھا اس لئے میں اُن کے علمی مقام اور مرتبہ سے بے خبر تھا۔

چند ماہ بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی مایۂ ناز علمی تصنیف (Ulema in Politics) چھپی تو اس میں بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے قادری صاحب کی علمی عظمت کا تذکرہ کیا ہے اس کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب میں بھی جس کا نام مجھے یاد نہیں، ڈاکٹر صاحب نے قادری صاحب کی علمیت کی تعریف کی ہے۔ اُن کا یہ جملہ میرے لوح حافظہ پر اچھی طرح مرتسم ہے کہ:

"برصغیر کے صوفیاء اور تحریک آزادی میں حصہ لینے والے علماء کے بارے میں ایوب قادری صاحب کا علم استناد کا درجہ رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب جیسے عظیم مورخ کی زبان اور قلم سے ایوب قادری صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی نہیں تین بار ایسے پُرمعنی تعریفی جملے قادری صاحب کی علمی عظمت کے بارے میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے آج بھی جب کبھی قادری صاحب کی علمی خدمت کا تذکرہ چھڑتا ہے تو میں اُن کے بارے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی رائے بیان کر دیتا ہوں

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب قادری صاحب کے واحد مداح نہ تھے بعد میں اندازہ ہو گیا کہ بڑے بڑے علماء اور فضلاء ان کی علمیت

کے مداح و معترف ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ نے قادری صاحب کی کتاب پر مولانا احسن نانوتویؒ کا تعارف تحریر فرمایا۔ اس میں مفتی صاحب قادری صاحب کی علمی صلاحیتوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"ہمارے محترم دوست محمد ایوب قادری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تحقیق و تفتیش کا اچھا سلیقہ اور سلیس انداز میں لکھنے کا اچھا ملکہ عطا فرمایا ہے۔" (صفحہ نمبر۱۰)

کتاب لغات القرآن کے مصنف اور ممتاز عالم دین مولانا عبدالرشید نعمانی نے کتاب مذکور کے پیش لفظ میں قادری صاحب کی علمیت کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ :۔

قادری صاحب ریسرچ اور تحقیق میں یورپ کے بہترین اسکالروں کے ہم پایہ ہیں (صفحہ نمبر۱۰)

اسی پیش لفظ میں مولانا النعمانی مزید فرماتے ہیں کہ

میں نے جب ان سے کوئی بات پوچھی ہمیشہ اُن کو حاضر العلم پایا جس سے ان کے ذوق طلب اور تفحص و تحقیق کا نقش دل پر قائم ہو گیا (صفحہ نمبر۱۲)

قادری صاحب استاد اردو زبان و ادب کے تھے مگر ان کا مطالعہ اردو زبان و ادب کے علاوہ اور موضوعات پر بھی تھا۔ وہ دو موضوعات (برصغیر کے صوفیائے کرام اور (۲) برصغیر کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے علمائے کرام تھے۔ ان دونوں موضوعات پر ان کی وسعت معلومات کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا تھا جو ان موضوعات پر اُن سے کبھی کوئی سوال پوچھتا یا کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

برصغیر کے تمام نامور صوفیہ کے حالات و واقعات ان کے لوحِ ذہن پر ہر وقت ترو تازہ رہتے تھے۔ یہی کیفیت جنگ آزادی میں حصہ لینے والے علمائے کرام کے بارے میں ان کی معلومات کی تھی۔ ان کی پی۔ ایچ ڈی مؤخر الذکر موضوع پر ہے اور اس کا عنوان "۱۸۵۷ء تک شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقاء میں علمائے کرام کا حصہ" ہے۔ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تکمیل نامور محقق اور انشا پرداز استاذی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کی زیر نگرانی کی اور ان کے ممتحن ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں اور ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے۔

اس کے علاوہ فارسی زبان پر انہیں مکمل عبور تھا۔ فارسی سے اردو میں انہوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان میں سے مآثر الامراء کا ترجمہ ان کا بہت گراں قدر کارنامہ ہے۔ یہ ضخیم کتاب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی تصنیف ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے مرکزی اردو بورڈ لاہور جیسے وقیع علمی ادارے نے شائع کیا ہے۔

قادری صاحب کی تصانیف و تراجم کی مکمل تعداد کا مجھے علم نہیں۔ جتنی کا مجھے علم ہے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ مآثر الامراء (ترجمہ)
۲۔ سیر العارفین (ترجمہ)
۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی (تصنیف)
۴۔ تذکرہ علمائے ہند (ترجمہ و ترتیب)
۵۔ فرحت الناظرین (ترجمہ)
۶۔ غالب اور آثر غالب (تصنیف)

۷۔ کاروانِ رفتہ (تصنیف)

۸۔ سید الطاف علی بریلوی (علمی خدمات اور کارنامے) تصنیف

۹ پی۔ ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ

اتنی بڑی تعداد میں علمی شاہکار پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوا کرتا۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جب تصنیف و تالیف مصنف کا ذریعہ معاش نہ ہو بلکہ اس کا جزوقتی مشغلہ ہو۔ بات یہ تھی کہ انہیں خدا نے حافظہ بہت قوی اور ذہن تیز دیا تھا۔ انہوں نے اپنی دونوں صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ تدریس کے بعد پورا کا پورا وقت تصنیف و تالیف اور دیگر علمی مشاغل کو دیا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ انہیں کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کے پاس اعلیٰ معیاری کتابوں کا بہت عمدہ اور کافی بڑا کتب خانہ تھا جو اب بھی موجود ہے اس میں کئی ہزار کتابیں ہیں۔ نادر قلمی نسخے بھی ہیں کتابوں اور قلمی نسخوں کی تعداد ان کے بیٹے عزیزم سعید حسن قادری کے مطابق کل ملا کر تین ہزار ہے۔

کوئی چاہے تو تنہا ان کے کتب خانہ کی مدد سے پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر سکتا ہے۔ کئی برس ہوئے بہاولپور سے نکلنے والے ایک علمی مجلے "الزبیر" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ "کراچی کے دو نادر کتب خانے" اس میں قادری صاحب کے کتب خانے کا جائزہ بھی شامل تھا۔

یہ مضمون علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق طالب علم نثار الحق صدیقی صاحب نے تحریر کیا تھا۔

علمی مشاغل کی خاطر قادری صاحب کثرت سے بیرونِ کراچی کے

دورے بھی کیا کرتے تھے اور ملک کے شاید کسی بھی علمی مرکز کو انہوں نے چھوڑا نہ ہو۔ ۱۹۸۴ء میں ایک سائنس کانفرنس میں بہاول پور گیا دورانِ قیام وہاں کی عظیم الشان سنٹرل لائبریری کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ قادری صاحب کثرت سے یہاں آتے اور کام کرتے رہے ہیں۔ لائبریری میں ایک رسالے میں قادری صاحب کا ایک مضمون بھی دیکھنے کو ملا جس میں انہوں نے سنٹرل لائبریری کی کتابوں کا جائزہ پیش کیا تھا اور مختلف زبانوں میں کتابوں کی تعداد بیان کی تھی جو کچھ یوں تھی کہ اردو میں ۳۵ ہزار، انگریزی میں ۲۴ ہزار، فارسی میں ۶ ہزار، عربی میں ۱۹ ہزار کل ملا کر ۸۴ ہزار۔

بیرون کراچی کے علاوہ ہندوستان کے علمی مراکز مثلاً دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور ندوۃ المصنفین اعظم گڑھ سے جو علمی شخصیتیں پاکستان آتیں وہ قادری صاحب سے ملاقات کو بھی اپنے پروگرام میں شامل رکھا کرتی تھیں۔

مختصر یہ کہ اپنے شعبہ ہائے تخصص FIELD OF specialisation میں ان کی شخصیت منفرد تھی مگر حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اتنی بلندی حاصل کر لینے کے باوجود ان میں تکبر نام کو نہ تھا طبیعت میں حد درجہ سادگی تھی لباس بہت سادہ تھا۔ آمد و رفت بسوں میں کیا کرتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خود بھی لے آیا کرتے تھے۔ ایسے سادہ طرزِ زندگی کی وجہ سے ان کی عظمت کو پہچاننے میں بہت وقت لگتا تھا۔

اپنے محلے والوں کی نگاہ میں قادری صاحب ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کی رات تک صرف ایک کالج ٹیچر تھے۔ انہیں قادری صاحب کی عظمت

کا اندازہ ۲۶ ر نومبر کو اس وقت ہوا جب ٹریفک کے حادثے میں ان کی وفات کی خبر صبح کے اخبارات میں دو کالمی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور ان کے جنازے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر، کالجوں کے پرنسپل نامور پروفیسران علمائے دین اور مشاہیر نے شرکت کی۔

بہرکیف کسی صاحبِ علم شخصیت کی موت کے بعد سب سے بڑا المیہ اس کے علمی سرمایہ کی حفاظت کا ہوتا ہے اگر اہل وارث میسر نہ ہوں تو وہ تلف ہوجاتا ہے بڑی امید افزا بات یہ ہے کہ قادری صاحب کے بڑے اور جوان سال صاحبزادے عزیزم سید حسن قادری کو بھی خدا تعالیٰ نے قادری صاحب جیسا ہی علمی میلان دیا ہے۔ مضمون اُن کا بھی اردو ہے امید کہ وہ اُن کے علمی ورثوں کی حفاظت بھی کریں گے اور ان کے صحیح علمی وارث بھی بنیں گے۔

قادری صاحب کی موت کے بعد اکثر مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ ۵۵۔ ۵۶ سال کی عمر میں بے حساب لوگ پاتے ہیں اور اس وقت بھی ہمارے ملک میں اتنی عمر کے کم سے کم پانچ لاکھ آدمی تو ہوں گے مگر دولتِ علم کے اکتساب کی طرف میلان اور اس کی صلاحیت کی بات ہوتی ہے کہ لاکھوں آدمیوں کو اتنی عمر میں معمولی نوشت وخواند بھی نہیں آتی، مگر اتنی ہی عمر میں قادری صاحب ایک قابلِ رشک علمی شخصیت بن گئے۔

اکتسابِ علم کی طرف میلان اور صلاحیت کی توفیق اللہ تعالیٰ ہر شخص کو دے۔ ہم سب کو خدا سے یہ دعا کرنی چاہئے کیونکہ علم ہم مسلمانوں کی میراث ہے۔

القاضی المفتی سید شجاعت علی قادری

علامہ محمد ایوب قادری

مرحوم و مغفور حضرت علامہ محمد ایوب القادری البدایونی سے میری علمی ملاقات تو اُن کی محققانہ تصانیف کے تعلق سے بہت پہلے ہو چکی تھی، لیکن اُن کی زیارت کا شرف اب سے تقریباً پندرہ سال قبل محب مکرم حضرت مولانا جمیل احمد نعیمی زید مجدہٗ کی معرفت ہوا، ان کی ملاقات سے قبل اپنے ذہن میں ان کے علم و فضل کا جو بھاری بھر کم پیکر تیار کیا ہوا تھا ملاقات پر ان کو عربی کی اس کہاوت کا مصداق پایا کہ، اَن تسمعَ بالمُعَیدی خیرٌ من ان تراہ، ان کی تواضع منکسر المزاجی اور سادگی، کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص پاک و ہند کا جلیل القدر محقق مؤرخ ہے، مگر جب سلسلۂ کلام شروع ہوا تو انہوں نے بڑا عجیب موضوع چھیڑ دیا، چونکہ میرا مسقط الراس (پیدائش کا مقام) مدرسہ قادریہ بدایوں کے قرب وجوار میں ہے اور علامہ کا تعلق بھی بدایوں سے تھا، لہٰذا انہوں نے پہلے تو بدایوں کے جغرافیہ اور تاریخ پر گفتگو کی پھر وہاں کے اہل علم کا ذکر کیا، میرے والد مرحوم کا تذکرہ تاریخ کے حوالہ سے اس طرح

کیا جس سے میں درحقیقت ناواقف تھا، پھر مجھے بتایا کہ آپ کے آباواجداد نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، یہ بات مجھے صدری روایات سے معلوم تھی مگر علامہ نے تاریخ کے حوالوں سے اس کی مزید توثیق کی، خاص طور پر میرے دادا سید حافظ علی کے پھوپھا مجاہد آزادی مولوی قدرت اللہ کے علم وفضل نیز ان کے مجاہدانہ کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، پھر جیبب گنج، اترولی، دادوں، بھیکن پور وغیرہ میں میری جو رشتہ داریاں تھیں اور ننھیال کے رشتہ سے بریلی اور رام پور میں جو میری قرابتیں تھیں وہ بیان کیں، یہ سب سُن کر میں نے اُن سے یہی کہا کہ جناب بلاشبہ آپ میرے بارے میں مجھ سے زائد علم رکھتے ہیں، رجال الہند پر جو دسترس انکو حاصل تھی، شاید ہی اب کسی کو حاصل ہو، ایک مرتبہ کسی کتاب کے سلسلہ میں مجھے مآخذ کی فہرست تیار کرنی تھی، میں ان کے مکان پر موجود تھا، گرمی کا موسم ایک کھری چارپائی پر وہ بیٹھے تھے اور ایک پر میں، وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اگر آپ چاہیں تو کچھ کتابوں کے نام میں لکھوا دوں، یہ کتابیں اُردو زبان کی تھیں جو تراجم علماء پر لکھی گئی تھیں، میرا زیادہ مطالعہ عربی کتب کا ہے لہٰذا میں اردو کتب کے سلسلے میں ان کی معاونت کا محتاج تھا، میرے لئے یہ امر باعث حیرت تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بیسیوں کتب مع ذکر سنِ طباعت مع نام مطبع اور مع نام مصنف لکھوا دیں، یہ اُن کی قوتِ حافظہ کا بڑا ثبوت ہے، وذالکَ فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ڈاکٹر صاحب راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان تھے، ان کے گھر میں جو معمولات تھے وہ سلف صالحین کے طریق کے مطابق تھے، تبلیغ دین کے فریضہ سے بھی غافل نہ تھے، اپنے محلہ میں ایک جماعت بنائی تھی، معلوم

نہیں اب بھی موجود ہے یا نہیں، اس کا کام گھر گھر جاکر درسِ قرآن مجید کا اہتمام کرنا تھا، اس فقیر کو بھی کئی مرتبہ درسِ قرآن کے لئے ساتھ لے گئے تھے، وہ جب بھی میرے پاس تشریف لاتے گھنٹوں محفل جمتی علمی نکات کے علاوہ لطائف و ظرائف کا تبادلہ ہوتا تھا۔

جب مجھے وفاقی شرعی عدالت کے جج کے منصب پر فائز کیا گیا تو بہت مسرور ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اس منصب کو قبول کر لوں، اور جب اسلام آباد سے واپس کراچی آیا تو ڈاکٹر صاحب محب مکرم علامہ شمس بریلوی کی معیت میں ملاقات کے لئے آئے اور اس عہدہ پر تقرر کی مناسبت سے چند اشعار لکھ کر لائے، مجھے سنائے جب میں نے کہا کہ لائیے اب یہ کاغذ میرے حوالے کیجیے تاکہ بطور تبرک رکھ لوں، فرمانے لگے اس طرح تھوڑی دوں گا، ابھی آپ کا استقبالیہ ہوگا، اہلِ علم جمع ہوں گے، محفل جمے گی، مٹھائی کھائی جائے گی میں نے کہا جیسی جناب کی مرضی، میری دوبارہ آمد پر استقبالیہ طے ہوا، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، مجھے کراچی آمد پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شہید ہو گئے ہیں اور کل ان کی نمازِ جنازہ ہے، ان کی یہ بات درست نکلی کہ اہلِ علم جمع ہوں گے، بلا شبہ شہر اور بیرونِ شہر کے اصحابِ علم و دانش جمع ہوئے، مگر استقبالیہ پر نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے ابدی الوداعیہ پر جمع ہوئے، بہر حال نمازِ جنازہ میں شرکت کا موقع نصیب ہو گیا، جو محض اتفاقی تھا ورنہ اسلام آباد خبر پہنچنا اور میرا بر وقت پہنچنا مشکل تھا، مجھے اس موقع پر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

ذھب الناس و مات الکمال ⁂ صاح صرف الدھر این الرجال

جناب محمد اطہر نعیمی صاحب

بڑی مشکل سے ہوتا ہے........

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مذکورہ بالا شعر اُردو ادب میں بڑی شہرت رکھتا ہے لیکن اس کے مصداق کتنے ہیں وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب اسلامی مملکتِ پاکستان وجود میں آئی تو اس کے منقسم ہونے سے بہت سی اقدار بھی تقسیم ہوئیں اور معاشرہ ایک نئی نہج پر نشوونما پانے لگا لیکن اس تغیر پذیر معاشرہ میں ایسے افراد موجود رہے جنہوں نے تغیرات کے تھپیڑوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔ محبت، خلوص، عقیدت و ایثار کے ایسے انمٹ نقوش معاشرتی زندگی پر ثبت کئے جو تاریخ کے اوراق کا درخشندہ باب بنے اور ان نقوش نے تاریخ انسانیت کا نیا عنوان بھی عطا کیا۔ جب تک وہ عالم ظاہر میں رہے خلوص محبت کا منارۂ نور بنے رہے اور جب اِس دارِ فانی سے عازم ملک جاودانی ہوئے تو رہتی دنیا کے لئے انہوں نے ایسا جادۂ مستقیم چھوڑا جس کی وجہ سے ان کی یاد دلوں میں رچ بس گئی۔ امتدادِ زمانہ نے اِس یاد کو دلوں سے محو نہیں کیا بلکہ

ان نقوش کو اور گہرا کر دیا۔

انہیں افراد میں ایک شخصیت پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری مرحوم و مغفور کی ہے۔ موصوفؒ سے راقم الحروف کی ملاقات تھی اور یہ سلسلہ اس وقت سے تھا جب کہ موصوف والد محترم تاج العلماء مفتی محمد عمر صاحب نعیمی قدس سرہٗ سے ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے اور گھنٹوں والد صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے اس دوران اکابر علماء و مشائخ کے تذکرے رہتے۔

قادری صاحب مرحوم کا تعلق آنولہ ضلع بریلی سے تھا لیکن سرزمین بدایوں سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا، اکابر علماء بدایوں سے اُن کے خصوصی تعلقات رہے اور مولانا سید عبد الحامد بدایونی مرحوم و مغفور کے پاس تو بھی آمد و رفت تھی میری اُن دنوں قادری صاحب سے رسمی ملاقات تھی لیکن مارچ ۱۹۶۶ء میں والد محترم کے انتقال کے بعد قادری صاحب مرحوم سے جب بے تکلفی بڑھی تو قادری صاحب مرحوم کی خوبیاں اور خلوص کھل کر سامنے آیا اور یہ اندازہ ہوا کہ موصوف کیسے مخلص اور وضعدار شخصیت کے حامل ہیں آپ جس طرح والد صاحب کی حیات میں تشریف لاتے تھے ان کے وصال کے بعد بھی تشریف لاتے رہے اور یہ معمول ۱۹۶۶ء سے آخر وقت تک جاری رہا۔

قادری صاحب کو محقق کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا بھرپور صلہ نہیں۔ ان میں بعض خصوصیات ایسی تھیں جن کے بارے میں ان کے بہت سے احباب کو پتہ نہیں چلتا تھا موصوف باقاعدہ بلاناغہ اوراد پڑھتے تھے اور کس وقت پڑھتے تھے اس کے بارے میں نہ تو موصوف نے کبھی کھل کر بتایا نہ دیکھنے والوں نے انہیں باقاعدہ وظیفہ پڑھتے دیکھا ایک مرتبہ اسی سلسلہ میں دار العلوم کے دار المطالعہ میں گفتگو

ہونے لگی تو بہت سے اوراد قادری صاحب نے سنانے شروع کئے جب میں نے اُن سے معلوم کیا تو موصوف نے ہنستے ہوئے فرمایا مولانا! جس کی رضا کے لئے پڑھے جاتے ہیں وہ پڑھنے کے لئے وقت بھی مہیا فرما دیتا ہے۔ اسی طرح فنِ تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ تاریخی نام یا مادہ تاریخ باتوں باتوں میں حساب لگا کر بتا دیتے تھے۔ خلوص اور نکتہ سنجی کا جو عالم تھا اس کے بارے میں ایک واقعہ یہ پیش آیا ایک مرتبہ فجر کے بعد مجھے ٹیلیفون کیا جب میں نے ٹیلیفون اٹھایا تو معلوم کرنے لگے کیا سو رہے تھے میں نے جواب دیا ارادہ کر رہا تھا۔ کہنے لگے آپ فوراً تشریف لائیں ایک ضروری کام ہے، میں نے جواب دیا ابھی آتا ہوں چنانچہ جب قادری صاحب کے دولت خانہ پر پہنچا تو تعجب سے معلوم کیا اتنی جلدی سواری مل گئی میں نے کہا آپ کے خلوص نے سواری مہیا کر دی۔ اس دن موصوف نے مکان کا زیریں حصہ کرایہ دار سے واگذار ہونے پر قرآن خوانی کرائی تھی۔ احباب اور گھر کے افراد ختم قرآن سے فارغ ہو کر منتظر تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگے نعیمی صاحب آگئے اب یہ دعا کریں گے۔ ان کے بعد پُرتکلف ناشتہ کا انتظام تھا۔ مجھ سے بصد اصرار ناشتہ کے لئے کہا تو میں نے کہا جناب آپ کا ٹیلیفون آیا تھا تو میں ناشتہ کر رہا تھا۔ یہ سُن کر مسکراتے ہوئے چند مخلصانہ کلمات کہے وہ ان کے خلوص و محبت کے آئینہ دار تھے ان کو نقل کرنے میں اپنی تعریف بقلم خود نہیں کرنا چاہتا۔

انتقال سے چند ماہ پیشتر غریب خانہ پر تشریف لائے اور دورانِ گفتگو کہنے لگے مولانا نہ تو خود آپ کچھ کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ کچھ کریں مجھے اس اندازِ تخاطب پر تعجب ہوا کہ خلافِ معمول یہ کیسا انداز ہے تو فرمانے لگے آپ نے اپنے والد محترم کے بارے میں نہ تو خود کچھ لکھا

اور نہ کسی سے کچھ لکھوایا میں نے خاموشی اختیار کی تو کہنے لگے کہ آپ کے پاس ماہنامہ السواد اعظم کے جو فائل موجود ہیں وہ مجھے دے دیں میں ان میں سے وہ تمام مضامین جمع کر کے اس پر مقدمہ لکھوں گا اور یہ بتاؤں گا کہ تحریک آزادی میں مفتی محمد عمر نعیمی صاحب کی خدمات کیا تھیں اور آزادی کے بعد وہ لوگ تو ہیرو بن رہے ہیں جنہوں نے حصول آزادی میں کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن جن حضرات نے عملی اور قلمی جہاد کیا تھا وہ خاموشی کے ساتھ راہی ملک بقا ہو گئے یا ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ان کی خدمات سے تعارف کرانا ضروری ہے اس کے علاوہ یہ تعارف تاریخ کا جزو بنے گا اور ان کے کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ چنانچہ میں نے وہ تمام شمارے جو میرے پاس محفوظ تھے قادری صاحب کو دیدیئے۔ لیکن موصوف اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کا مطالعہ نہ کر سکے صرف چند جلدوں میں ان کی نشانیاں رکھی ہوئی ملیں اور دوسروں کے کارنامے تاریخ کا جزو بنانے کے جذبہ میں خود ہی تاریخ کو ایک جعلی عنوان دے گئے۔

میں یہاں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نہ تو انشا پرداز ہوں نہ صاحب طرز ادیب نہ مورخ جو قادری صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈال سکوں لیکن اس کے باوجود لکھنا پڑھنا اگر نہیں آتا تو بزرگوں کے طفیل کچھ سلیقہ آتا ہے اور اس بنا پر میں نے قادری صاحب مرحوم کے صاحبزادہ کے فرمانے پر یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھوں گا لیکن جب لکھنا شروع کیا تو جذبات نے ایسا وارفتہ کیا کہ ذہن نے قلم کا ساتھ نہ دیا اور یہ چند بے ربط سطور لکھ سکا۔ البتہ مجھے عربی کا یہ شعر برابر آتا رہتا ہے :۔

یلوح الخط فی القرطاس دهرا ﴿ و کاتبه رمیم فی التراب

کا غذ پر لکھا ہوا ابد الاباد تک چمکتا دمکتا رہتا ہے حالانکہ لکھنے والا مر کر مٹی میں مل جاتا ہے۔

قادری صاحب کو تو شہادت کی موت نصیب ہوئی ہے لیکن ان کے علمی کارنامے رہتی دنیا تک ان کی یاد باقی رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین!

محمود احمد برکاتی

ایوب صاحب زندہ ہیں

غالباً ۱۹۵۸ء میں پہلی بار، ایوب صاحب مرحوم کا نام سنا اور انہیں دیکھا، وہ مولانا عبدالرشید نعمانی کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائے تھے، پہلی ملاقات میں مجھ کم نظر کو انہوں نے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا اس لئے ابتداً ہمارے روابط سست رفتاری سے آگے بڑھے مگر جلد ہی اتفاق و اتحاد کے پہلو روشن ہوتے چلے گئے اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور فاصلے سمٹنے لگے۔ اب اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں، ان ملاقاتوں میں علمی موضوعات پر گفتگو کے علاوہ نجی معاملات پر مشورے ہوتے اور وہ مجھ سے اور میں ان سے بہت سی رازکی اور گھریلو باتیں بیان کر دیا کرتے تھے جو دوسروں سے نہیں کہا کرتے تھے، حال آنکہ یہ تاثر عام ہے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے کھلتے ہی نہیں تھے۔

اس تقریباً ۲۵ سال کے قرب و اخلاص میں ان کی سیرت کے جو محاسن میرے علم اور مشاہدے میں آئے ان میں سے چند خصوصاً

قابلِ ذکر ہیں :۔

سب سے نمایاں اور اہم رُخ ، جسے میں اُن کا عنوانِ حیات کہہ سکتا ہوں یہ تھا کہ وہ ایک طالب علم SCHOLAR تھے طالب علم ہونا ایک قابلِ افتخار نعمت و دولت ہے جو کمیاب بھی ہے میلوں سفر کرنے کے بعد کہیں کوئی طالب علم ملتا ہے۔ لیکچرر ، پروفیسر ڈاکٹر اور صدر شعبہ قدم قدم پر ملتے ہیں مگر طالب علم بہت کم ملتے ہیں تو ایوب صاحب طالبعلم تھے ، طالب سند نہیں تھے ، طالب سند حصولِ سند کے بعد ، کتاب سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے اور مطالعے کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے اور پھر علم اس سے گریز کرتا ہے اور وہ علم سے ، طالب علم کا رشتہ علم سے ہمیشہ استوار رہتا ہے بلکہ اور محکم ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے طلب علم کا سفر کسی ایک منزل پر پہنچ کر منتہی نہیں ہوتا بلکہ ہر منزل پر پہنچ کر اس کو دوسری کئی منزلوں کے راستے نظر آنے لگتے ہیں ، وہ جب تک زندہ رہتا ہے طالبِ علم رہتا ہے جب تک اس کی بینائی ساتھ دیتی ہے ، مطالعے سے باز نہیں آتا ، ربِّ زدنی علما کی دعا سے اس کے لب کبھی غفلت نہیں کرتے ۔ ایوب صاحب نے اسناد بھی حاصل کیں مگر حصولِ اسناد کے بعد کتاب کو طاق پر نہیں رکھ دیا وہ ہمیشہ ان کی بغل میں ہی رہی وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ پڑھنے اور لکھنے میں گزارتے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع زیادہ تر علمی مسائل ہوتے تھے ۔ دوسرے موضوع سے ان کی دلچسپی برائے نام ہی تھی ۔ جب بھی ملاقات ہوتی اور کسی دوسرے موضوع پر گفتگو ضروری ہوتی تو اس سے شتابی سے فارغ ہو لیتے اور "کام" کی بات شروع

کر دیتے، فلاں کتاب پڑھی ہے؟" "اس رسالے میں وہ مضمون نکلا ہے" "فلاں کی تاریخ وفات نہیں مل رہی۔"

ان کی سیرت کا دوسرا قابل تقلید پہلو یہ تھا کہ انہوں نے ایک میدان منتخب کر لیا تھا اور اسی کے ہو کر رہ گئے تھے، تاریخ کا ذوق ان کو ودیعت ہوا تھا اور انہوں نے ایک علاقہ اور ایک دور مخصوص کر لیا تھا کہ اس میں تخصیص حاصل کریں گے اور بالآخر یہ تخصیص حاصل کر لی تھی۔

"یک فن گیر تا یکتا شوی" ایک تجربہ کارانہ مقولہ ہے اور اس کو نظر انداز کر کے تخصص سے محروم رہ جانے والوں کی قابل رحم حالت کچھ یوں ہوتی ہے۔ "پیش طبیب مُلّا و پیش مُلّا طبیب و پیش ہیچ ہر دو، و پیش ہر دو ہیچ۔"

تیسری بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ نہ صرف خود کسی نہ کسی موضوع پر تحقیق و تلاش میں مصروف رہتے بلکہ احباب کو بھی مسلسل متوجہ کرتے رہتے تھے، اور انہیں نہ صرف موضوع منتخب کر کے دیتے بلکہ لوازمے کی بھی نشان دہی کرتے اور اس کے حصول میں بھی اعانت کرتے بارہا اپنے سے کم کوش احباب کو انہوں نے کسی موضوع پر خامہ فرسائی کے لئے آمادہ کیا اور پھر بار بار یاد دلاتے رہے اور مہینوں حیلے اور عذر سنتے رہنے کے باوجود مایوس نہیں ہوئے اور مضمون لکھوا کر رہے۔ میری تالیف سیرت فریدیہ اور مضمون سلطنت خداداد کا کتب خانہ" مرحوم کی اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہیں۔

ایوب صاحب زندگی لکھوا کر نہیں لائے تھے ورنہ وہ ایک علمی خانوادے کی بنا ڈال رہے تھے اور ان تمام لوازم سے مسلح تھے جو ایک بانی خاندان

میں ہونے چاہئیں۔ مشکلات سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ، موانع کو خاطر میں نہ لانے کی ہمت، خطرات کا سامنا کرنے کے تیور، پیہم سفر کا ولولہ، طویل المیعاد منصوبہ سازی، جفاکشی، معیاری صحت، غرض وہ ہر طرح ایک بانی خاندان ہونے کی اہلیت اور استحقاق لے کر پیدا ہوئے تھے اور اس حیثیت سے بھی وہ میرے زیر مطالعہ تھے کیونکہ ابتدائے عمر سے مجھے اس موضوع سے دلچسپی رہی ہے اور خاندانی عروج و زوال کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی توجہ سے کرتا رہا ہوں، ایسے بہت سے حضرات میرے پیش نظر تھے اور ہیں جو کسی اہلِ علم یا صاحبِ ثروت یا مقتدر خاندان کے خاتم تھے یا ہیں اور اب بڑے خشوع و خضوع سے اس خاندان کو زوال و انجام تک پہنچانے کے لئے سرگرم ہیں، یہ لوگ بالعموم نازک طبع، کم ہمت، رخ بہ ماضی، پشت بہ مستقبل اور تھکے تھکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح چند بانیان خاندان بھی نظر میں رہے ہیں۔ ایوب صاحب بھی اسی گروہ میں سے تھے۔ وہ تقسیم کے وقت بیس سال کے تھے اور صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکے تھے تقسیم کے بعد بھی وہ مزید تین سال بھارت میں رہے اور بدایوں سے انٹرمیڈیٹ کر کے ۱۹۵۰ء میں وطن سے ہجرت کی اور ہجرت کے بعد نامساعد حالات میں ایک طویل اور صبر طلب سفر کا آغاز کیا۔ حصول تعلیم کی طرف توجہ کی تو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ملازمت کا آغاز ایک سرکاری محکمے میں کلرک کی حیثیت سے کیا اور کالج کے شعبے کی صدارت تک پہنچے، ایک خستہ سے مکان سے نکل کر ایک ذاتی اور وسیع و آراستہ مکان میں منتقل ہوئے پہلی کتاب (مولانا فیض احمد بدایونی) تقریباً ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی

تھی اور ۱۹۸۳ء ان کے تراجم تالیفات اور تصانیف کی تعداد دو درجن تک پہونچ گئی جن میں مآثر الامرا جیسی کئی ہزار صفحات کی کتاب بھی ہے، کئی کتابیں زیر قلم تھیں، مقالات ان کے علاوہ ہیں، پچیس سال میں یہ ذخیرہ وہی جمع کر سکتا ہے جسے سانس پھولنے کا عارضہ نہ ہو۔ جو ہانپ نہ جاتا ہو، جو پچھلی نسلوں کے اندوختے پر قانع و نازاں ہونے کے بجائے اگلی نسلوں کے لئے سامانِ افتخار چھوڑ کر جانا چاہتا ہو۔

انہیں ہم سے جدا ہوئے ایک سال ہونے کو آیا، مگر وہ مرے نہیں ہیں وہ ہم جیسے "مرتے ہی وفات پا جانے" والوں میں سے نہیں تھے، ایک خاتون ضرور بیوہ ہوگئیں، چند بچے ضرور یتیم ہوگئے مگر محمد ایوب قادری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

ایک نوحۂ قلب

قضاء قدر نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ڈاکٹر محمد ایوب قادری دوسرے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دنیا میں ہر وقوعہ کا ایک سبب ہوتا ہے مرحوم کے سفر کا باعث بھی ایک حادثہ بن گیا۔ یہ ایک اندوہناک حادثہ بے رحمی اور قساوت کی شرمناک مثال تھا۔

دنیا میں اور خاص ہمارے گرد و پیش کی دنیا میں بہت سے واقعات پیش آتے ہیں جو ہماری توقعات کے خلاف ہوتے ہیں ہمارا قلب انہیں لبیک نہیں کرتا لیکن چار و ناچار انہیں تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے، لیکن سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر ایوب قادری کی وفات کے حادثے میں ایسی کیا بات ہے کہ قلب اسے تسلیم کرنے پر اب تک آمادہ نہیں میری آنکھیں گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے مرحوم کو ابدی نیند سوتے دیکھا ہے میرا وجود شاہد ہے کہ ان کی زندگی کی آخری منزل کا سفر پیش آچکا ہے، میرے ہاتھ گناہ گار ہیں کہ مرحوم کی تدفین میں ان کا بھی حصہ ہے اور ان کی تربت پر

چند مٹھی مٹی ان سے ڈالی گئی ہے پھر دل کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ مرحوم کے حادثۂ انتقال کی ایک بدیہی حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔

میں دل سے پوچھتا ہوں کیا تو نے میرے والدین کے انتقال کا یقین نہیں کیا تھا؟ کیا تو نے میرے استاد غلام رسول مہرؔ کے انتقال کو تسلیم نہیں کر لیا تھا کیا تو ہی وہ نہ تھا جس نے بھائی جیسے دوست اور مخلص شورش کاشمیری کے سانحۂ ارتحال پر صبر کیا تھا۔ اے میرے دل کیا تو وہ نہیں جو اپنے محسن و مربی خواجہ عبدالوحید کے انتقال پُر ملال کے بعد مطمئن ہو گیا تھا۔ کیا پیر حسام الدین راشدی کے انتقال کے بعد تیرا اضطراب سکون سے نہ بدل گیا تھا، کیا ڈاکٹر ایوب قادری تجھے بہت زیادہ عزیز تھے لیکن بہت سے عزیزوں کو بھی تو رو کر چپ ہو چکا ہے پھر اب کیوں چپ نہیں ہو جاتا کیا تو اس لئے افسردہ ہے کہ وہ ایک بلند پایہ مصنف اور بے مثال محقق تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا شوقِ علم بے انتہا تھا اُن کا حافظہ عجائبِ روزگار تھا لیکن اگر ایسا ہو تو بھی گزشتہ بیس برس میں جو تیرے علم و مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے ذوق و آشنائی کا زمانہ ہے، تو کتنے ہی مصنفوں محققوں کو رو کر بھول چکا ہے اگر ایسا ہی ہے اور واقعی ایسا ہی ہے تو پھر ڈاکٹر محمد ایوب کی وفات کو بھی بھول کیوں نہیں جاتا۔

آخر تو سمجھتا کیوں نہیں۔ یہ حقیقت کیوں نہیں مان لیتا کہ ایوب قادری وفات پا گئے۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ اس دنیا میں لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟

کہیں یہ خیال تو نہیں کہ تیرے علمی کاموں کا معاون، منصوبوں کا

مشیر، تحقیق میں رہنما، خوشیوں میں خوش ہونے والا اور زندگی کے رنج و غم کا شریک تجھ سے بچھڑ گیا اور تیرا ماتم دراصل مرحوم کا ماتم نہیں، اپنی محرومی کا ماتم ہے۔ ایسی محرومی جو دائمی ہے، بلاشبہ گزشتہ بیس سال سے اپنے علمی کاموں میں مجھے ان کا بہترین تعاون حاصل رہا ہے مرحوم نے جس محبت، اخلاص اور شفقت کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی اور مجھے اپنے بہترین مشوروں سے نوازا اس کا احسانمند ہوں اور ان کے تعاون، مشورے اور رہنمائی سے محرومی کا بہت غم ہے لیکن دل کے ساز سے کچھ اور ہی صدا آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ دل کی بے چینی کا سبب کچھ اور ہے کہیں یہ سبب تو نہیں کہ مرحوم ایک خاندان کے کفیل اور سربراہ تھے وہ ایک کنبہ پرور شخص تھے اور ان کے سانحۂ ارتحال سے ایک خاندان کی سرپرستی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی اور نگہداشت کی محرومی اور ایک خاندان اور ایک کنبے کے لئے معاشی اور معاشرتی بے شمار مسائل پیدا ہو جانے اور ان کا حل سامنے نہ ہونے کے تصور سے دل بے چین ہے۔ کہیں نوے سالہ ضعیف والدہ کی صبر آمیز صداؤں اور ایک سہاگن کی چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز نے تو دل کے چین کو تہہ و بالا نہیں کر دیا۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے۔ پھر کیا پاکستان کا کوئی ادارہ، اردو کالج جس کی تاریخ تعلیم بنانے میں ان کی بھرپور جوانی کے تقریباً پندرہ سال گزارے تھے اور جس کی آرائش و تزئین میں مرحوم نے اپنی بہترین دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کو صرف کیا تھا یا اکادمی ادبیات جس کے وہ ایک معزز رکن تھے اور یہ اعزاز انہیں کسی کی نظرِ عنایت و تعلق سے میسر نہ آیا تھا بلکہ ان کی عظیم الشان علمی و ادبی خدمات نے انہیں اس کا مستحق بنایا تھا۔ ان کے خاندان کے لئے پیدا ہو جانے والے مسائل کو

کو حل کرنے کی کوشش کرے گا کیا حکومت کے کسی چھوٹے یا بڑے سے یہ توقع کی جائے کہ وہ سیاست و اقتدار کے اہم ترین مسائل سے نظر ہٹا کر علم و انسانیت کے ماتم میں ہمارا شریک ہوگا۔

آخر یہ دل کیا سوچنے لگا۔ کن خیالوں میں کھوگیا۔ یہ کس سے کیا توقع باندھ رہا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ روشنی عدل و انصاف کی نہیں بجلی کی ہے عہدِ تاریک کے روشن شہر کا یہ واقعہ ہے ایک معمولی واقعہ، ایسے ہزاروں واقعات سے ایک واقعہ جو روز اس شہر کی سڑکوں پر پیش آتے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔ کیا اسی شہر کی ایک سڑک پر اقبال اکیڈمی کے ایک ڈائریکٹر کا خون نہیں بہا تھا۔ کیا اس کی اعلیٰ دماغی کا کوئی جواب تھا۔ پھر کیا ارباب عدل و انصاف کے دماغ پر جوں رینگی تھی۔ کیا اسی شہر میں اس مرحوم و مظلوم کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ قادری کے قتل کا واقعہ بالکل اسی طرح پیش نہیں آیا تھا۔ ہاں میں نے نعمت اللہ قادری کے ایکسیڈنٹ کو قتل کہا ہے۔ ہاں میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے سانحے کو بھی قتل کا واقعہ کہتا ہوں یہ کوئی علمی اور فلسفے کا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ مجھ سے اس واقعے کو قتل کہنے کا ثبوت مانگیں، یہ میرا عقیدہ ہے ایسا ہی عقیدہ جیسے خدا پر ہے۔ آپ یہ کیوں مجھ سے قبلوانا چاہتے ہیں کہ یہ ایک اتفاق ہے، حادثہ ہے، سانحہ ہے، ایکسیڈنٹ ہے۔ یہ قتل ہے ایسا ہی قتل جیسے کوئی بے رحم کسی معصوم کو گولی یا چھرے سے قتل کردے۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی کا حادثہ بھی حادثہ قتل تھا۔ یہ قتل ہے اور ایسے شخص کا جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو دکھ نہ پہنچا تھا۔ جس کی زبان کبھی دشنام سے آشنا نہ ہوئی تھی، جس نے کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا، جو ایک مجلسی انسان تھا، جو ایک تہذیبی شخص تھا

جو ملنسار تھا جو دوست سب کا تھا، دشمن کسی کا نہ تھا جس کی وضع داری اور حُسنِ خلق کی داستانیں خاندان کنبے پڑوس اور محلے سے لے کر مرحوم کی واقفیت اور تعارف کی آخری حدوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

مجھے معلوم ہے کہ مرحوم ایک علمی شخصیت تھے، محقق تھے بلند پایہ مصنف تھے، ان کا حافظہ بے مثال تھا۔ قوتِ استحضار حیرت انگیز تھی ان کے یہ فضائل و محاسن میرا موضوع کہاں۔ صاحبِ علم کے مقام سے تو اہلِ علم و نظر ہی آشنا ہو سکتے ہیں۔ مرحوم کے ان کمالات پر اصحابِ نقد و بصیرت ہی قلم اٹھائیں گے۔ میں کہ ان کے تلمذ کا بھی اہل نہیں ان کا نیاز مند اور خوشہ چین ہوں۔ میں کہ اپنے تئیں ان کا دوست نہیں سمجھتا، لیکن ہاں میرے قلب نے مرحوم سے محبت کرنے میں کمی نہیں کی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں مرحوم کی محبت و شفقت کے لائق نہ تھا لیکن اس کو کیا کروں کہ مرحوم کی محبت و شفقت سے محرومی نے کبھی آزردہ نہ ہونے دیا بلکہ ان کی بے پایاں عنایت نے میرے لئے ہمیشہ فخر و انبساط کا موقع فراہم کیا۔ اس لئے ایک ناآشنائے علم و فن اس کے فضل و کمال کا ماتم گسار ہو گیا ہیں ان کی محبت ان کی شرافت، ان کی نیک نفسی، پاک بازی، رواداری، حُسنِ وضع، کمالِ اخلاق اور محاسن سیرت کا معترف اور کراچی کی ایک آباد سڑک پر انسانیت کے قتل کا نوحہ خواں ہوں۔

آپ میرے دل کے سوز و فغاں سے رنجیدہ نہ ہوں شہر کے کوتوال اور قاضی کی پیشانی پر شکن نہ پڑے۔ میں ملکۂ شہر کے خوابِ شیریں میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا مجھے اپنی آہ و فغاں کا اثر معلوم، یہ نہ غفلت کا توڑ ہے۔ نہ سِتم بے حسی کا تریاق نہ نیند کے ماتوں کے لئے آوازِ درا۔ پھر کوئی کیوں رنجیدہ ہو اور کیوں کسی کی پیشانی شکن آلود ہو۔ میرا تلب مسلمان ہے۔ وہ مشیتِ الٰہی پر صبر کرنے والا ہے۔ لیکن

حاکم کہاں ہے وہ آئے اور اتنا تو کہے کہ اب کسی مظلوم کے خون سے شہر کی کوئی سڑک رنگین نہ ہوگی۔ یہ شرافت اور نیکی کے خون کا آخری قطرہ تھا جو کسی سڑک پر گرا۔ اب ایسا کبھی نہ ہوگا۔ کوتوال آئے اور کہے کہ اس کے عہد کا یہ آخری قتل ہے اب نہ کسی بیوہ کا سہاگ اُجڑے گا، نہ کسی کے بچے یتیم اور بے سہارا ہوں گے۔ یہ ایک خاتون کی ٹوٹنے والی سہاگ کی آخری چوڑیاں تھیں۔ اب کسی کی ایسی مظلومانہ موت سے نہ کسی سہاگن کا سہاگ اجڑے گا نہ کسی کی چوڑیاں ٹوٹیں گی اور میں اپنے دل ہی کو نہیں اس ضعیفہ کو بھی سمجھا لوں گا کہ جس کے دو بیٹے تھے اور دونوں زندگی اور روشنی سے معمور اس شہر کی سڑکوں پر قتل کر دئے گئے ہیں۔ میں اس سے کہوں گا کہ ماں! بیشک تو بے سہارا ہوگئی لیکن تیرے عظیم شریف اور بے گناہ بیٹے کی شہادت نے قوم اور شہر کی ہزاروں ضعیفوں کو بے سہارا ہونے سے بچا لیا۔ تیرے بہادر بیٹے کا خون رائیگاں نہیں گیا تو اپنے غم کو چھپا لے اور قوم کی بوڑھیوں کی قسمت پر فخر کر اُن کے سہارے ٹوٹنے سے بچ گئے۔ اے قاضی تو کہاں ہے۔ سامنے آ اور اس شہر کے باقیوں کو بتا کہ انصاف کیا جائے گا۔ ایسا انصاف جو مثال بنے گا۔

اے میرے دل تو بے چین نہ ہو مایوس نہ ہو مشیتِ الٰہی میں اپنی مرضی کو شامل کر دے، راضی بہ رضا ہو جا۔ اگر انتظام نہ ہوگا، اگر انصاف نہ ہوگا تو اللہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے وہی اس مظلوم خاندان کا اور کل جہان کا پروردگار اور نگہبان ہے۔ اللہ کا ذکر کر تا کہ تجھے قرار آئے۔

پروفیسر محمد اسلم

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

یادیں اور تاثرات

میرا اور قادری صاحب کا سولہ برس تک تعلق رہا ہے۔ میں برطانیہ میں ایک طویل عرصہ گزار کر فروری ۱۹۶۷ء میں پاکستان آیا۔ اسی سال میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے منسلک ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں نے علمی موضوعات پر مقالے لکھنے شروع کیے جو ماہنامہ المعارف لاہور اور ماہنامہ برہان دہلی میں چھپنا شروع ہوئے۔ یہی مقالات میرے اور قادری صاحب کے درمیان تعارف کا ذریعہ بنے۔ لاہور میں ایک ہمارے مشترکہ دوست حکیم محمد موسیٰ امرتسری رہتے ہیں۔ قادری صاحب کے ساتھ میری پہلی بالمشافہ ملاقات انہی کے مطب پر ہوئی اور اسی ملاقات سے ہماری باقاعدہ دوستی کا آغاز ہوا۔

میرا کئی سالوں سے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ میں سال میں تین بار یعنی موسمِ بہار، موسمِ گرما اور موسمِ سرما کی تعطیلات میں چند روز کے لئے کراچی چلا جاتا ہوں۔ اس سفر کا مقصد دوست واحباب سے ملاقات اور قبرستانوں کا سروے ہوا کرتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو مشاہیر کی قبروں کے کتبے جمع کرنے کی طرف قادری صاحب نے ہی توجہ دلائی تھی اور اس کا آغاز انہی کے مشورے سے نیاز فتح پوری کی قبر کے کتبے سے کیا تھا۔ میں کراچی پہنچ کر اپنی اولین فرصت میں پروفیسر ایوب قادری سے ملنے اردو کالج جایا کرتا تھا۔ مرحوم اپنے کمرے میں بڑے تپاک سے ملتے، چائے اور بسکٹ سے تواضع کرتے اور دیر تک

علمی موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مرحوم میرے ساتھ وقت طے کر کے صبح کے وقت انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تشریف لے آتے اور جناب شبیر علی کاظمی کے کمرے میں ہماری ملاقات ہوتی۔ اس روز کاظمی صاحب بھی شریکِ گفتگو ہو جاتے۔ قادری صاحب کے توسط سے ہی پروفیسر یامین محمدی، پروفیسر خلیل اللہ خان صاحب اور پروفیسر محمود صاحب سے میرا تعارف ہوا۔

کئی بار قادری صاحب نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا اور اپنی تصانیف مجھے عنایت کیں۔ ایک بار میں بزمی انصاری صاحب سے ملنے گیا۔ قادری صاحب کا مکان ان کی قیام گاہ سے قریب ہی تھا۔ قادری صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں انصاری صاحب سے کہوں کہ وہ فون کر کے مجھے بلا لیں۔ چنانچہ جونہی انصاری صاحب نے انھیں اطلاع دی، وہ فوراً وہاں پہنچ گئے اور تا دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔

قادری صاحب لاہور تشریف لاتے تو شاد باغ میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ہاں قیام فرماتے۔ وہ صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر پنجاب یونیورسٹی لائبریری پہنچ جاتے اور وہاں مخطوطات اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کرتے۔ لائبریری سے فرصت نکال کر موصوف لاہور کے علمی و تحقیقی اداروں مثلاً ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، مجلسِ ترقیٔ ادب، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب پبلک لائبریری اور دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ضرور جاتے۔ اُن اداروں کے سربراہ انھیں کتابیں پیش کرتے اور مرحوم شام کے وقت کتابوں سے لدے پھندے اپنی قیام گاہ پر لوٹتے۔

قادری صاحب لاہور میں قیام کے دوران ایک بار میرے غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے۔ ان کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اگر ان کے پاس وقت نپا تلا ہوتا تو بھی چند منٹوں کے لئے ضرور حاضری لگوانے چلے آتے۔ کئی بار میں نے ان کی لاہور تشریف آوری کے موقع پر اپنے ہاں چند دوستوں کو مدعو کیا اور جو دال چٹنی میسر آئی۔ اُن کے

سامنے لاکر رکھ دی۔ ایسی علمی محفلوں میں ان کے اصلی جوہر کھلتے تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ کونسا مخطوطہ کس کتاب خانے میں محفوظ ہے اور کون سی کتاب کہاں سے چھپ گئی ہے۔ کتابوں کے بارے میں اتنی معلومات شاید ہی کسی لائبریرین کو ہوں۔

ایک بار قادری صاحب عشرۂ محرم میں لاہور تشریف لائے۔ عاشورہ کے دن عام تعطیل تھی اس لئے ان کی دلچسپی کے ادارے اور کتاب خانے بند تھے۔ میرے ہاں کئی سالوں سے یومِ عاشورہ کو محفل فضائل صحابہ منعقد کرنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ قادری صاحب کو اس کا پتہ چلا تو میرے ہاں تشریف لائے۔ ان کی آمد کے وقت میری تقریر قریب الاختتام تھی۔ میری تقریر کے بعد آغا غیاث الرحمٰن انجم نے تقریر شروع کی تو میں قادری صاحب کو لے کر اپنے اسٹڈی روم میں آگیا۔ موصوف مجھ سے کہنے لگے کہ انھوں نے مجھے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لئے وہ بالالتزام میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر رکنے اور کھانا تناول کرنے کی درخواست کی تو فرمانے لگے کہ انھیں اس وقت کھانے کی حاجت نہیں ہے۔ میرے اصرار پر انھوں نے چائے نوش فرمائی اور تشریف لے گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی اسی روز بعد دوپہر کراچی روانگی تھی اس لئے وہ میرے ہاں زیادہ دیر نہ رکے۔

قادری صاحب میں ایک صفت میں نے یہ بھی دیکھی کہ وہ دوسروں کے کام کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ مرحوم جب بھی کسی دینی یا علمی رسالے میں میرا کوئی مضمون پڑھتے تو اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتے اور مجھے فوراً خط لکھتے۔

اللہ بخش یوسفی مرحوم کراچی سے ایک مجلہ سرحد کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں ماہنامہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ کچھ عرصہ تک تو یوسفی صاحب یہ مجلہ باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ بعدازاں اس کی اشاعت میں بے قاعدگی آگئی اور بالآخر یوسفی صاحب ڈمی نکال کر ڈیکلریشن بچانے پر مجبور ہوگئے۔ قادری صاحب نے

کسی طرح سے یہ مجلہ اُن سے لے لیا اور اسے خالص علمی رسالہ بنا دیا۔ انھوں نے اس کے دو تین شمارے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کئے اور ان میں الحاج محمد زبیر کا ایک مضمون "علی گڑھ میں میرے بیالیس سال" قسط وار چھپنے لگا۔ قادری صاحب نے مجھے بھی مضمون لکھنے کی دعوت دی لیکن میں ان کی فرمائش پوری نہ کر سکا اور ادھر تین چار ماہ بعد وسائل کی کمی اور علمی و تحقیقی مجلّوں کی ناقدری کی بنا پر سرحد بند ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قادری صاحب جیسے علم دوست انسان کے لئے اس سے بڑا اور کیا صدمہ ہو سکتا تھا۔

قادری صاحب نے بڑی سادگی کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ وہ نام و نمود سے سخت متنفر تھے۔ اُن کا لباس اور رہن سہن متوسط طبقے کے ایک فرد جیسا تھا۔ اگر کوئی انجان آدمی انھیں دیکھتا تو وہ اُن کا لباس اور شکل اور وضع قطع دیکھ کر یہ کبھی باور نہ کرتا کہ وہ اتنے عظیم انسان اور اتنے بلند پایہ اسکالر ہیں۔ وہ جب بھی ٹرین میں سفر کرتے تو سیکنڈ کلاس میں اپنی برتھ ریزرو کرواتے۔ میرا یہ خیال ہے کہ دورانِ سفر ان کے کسی ساتھی مسافر کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں گزرتا ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک عظیم محقق اور اسکالر سفر کر رہا ہے۔ موصوف سال میں دو تین بار لاہور آتے اور اپنے ہی جیسے سادہ مزاج میزبان حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ہاں ٹھہرتے۔ حکیم صاحب بھی تکلّفات سے بری ہیں۔ اُن کے گھر میں قادری صاحب کو اپنے ہی گھر جیسا ہی ماحول اور سکون ملتا تھا۔

لاہور میں قیام کے دوران موصوف ایک ایک ذی علم کے ہاں جاتے اور اپنے ذوق کی کتابیں ڈھونڈتے۔ انھیں غریب سے غریب شخص کے ہاں جانے میں بھی کوئی عار نہ تھی میں نے انھیں چٹائی پر بیٹھ کر پرانی کتابیں اور رسالے تلاش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کھانے کا وقت آتا تو جو ملتا کھا لیتے۔ کھانے میں کسی قسم کا تکلّف نہ تھا۔ ایک بار میں نے مدعو کیا تو فرمانے لگے کہ فرشی نشست ہونی چاہیئے اور کھانا بھی میز کی بجائے دسترخوان پر کھلایئے گا۔ میں نے اس نشست کے لئے ان جیسے ہی تکلّفات سے بری اصحاب کو مدعو کیا۔ اس شب

کی نشست بھی یادگار نشست تھی۔ اس میں سید نفیس رقم صاحب، پروفیسر افضل حق قریشی، علامہ شبیر بخاری اور قاری عبدالرشید جیسے مخلص احباب شریک تھے۔

قادری صاحب کا تعلق روہیل کھنڈ کے مردم خیز خطے سے تھا اور انھوں نے اس علاقے کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ "احباب بریلی" کے نام سے کراچی کے چند علم دوست حضرات نے ایک بزم قائم کی تھی، قادری صاحب اس بزم کے رکن رکین تھے۔ یہ بزم کبھی کبھی کوئی مجلہ بھی شائع کر دیتی تھی جس سے اس کی علمی اور سماجی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ قادری صاحب یہ مجلہ مجھے بھی بھیجا کرتے تھے۔

ان کا آبائی وطن روہیل کھنڈ کا تاریخی قصبہ آنولہ تھا۔ اسی قصبے میں ریاست رام پور کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ بعد ازاں نوابانِ رام پور نے آنولہ سے اپنا سیاسی مستقر رام پور منتقل کر دیا۔ آنولہ کسی زمانے میں نواب نجیب الدولہ کی عملداری میں تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے آنولہ میں ایک ٹکسال قائم کی تھی جہاں اس کے نام کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ میرے ذخیرۂ مسکوکات میں احمد شاہ ابدالی کا ایک روپیہ محفوظ ہے، جو آنولہ میں ڈھالا گیا تھا اور اس پر ضرب آنولہ منقوش ہے۔ میں نے ایک بار قادری صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے اس کی فوٹو بنوا کر بھیجنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے اس فوٹو کو کہاں شائع کرایا۔

اہالیانِ کراچی خوب جانتے ہیں کہ ربیع الاوّل کے پہلے بارہ دنوں میں محمد یوسف بجلی والا مرحوم و مغفور کے زیرِ اہتمام خالقدینا ہال کے وسیع لان میں سیرت کی بارہ محافل ہوا کرتی تھیں اور ان کا سلسلہ بحمد اللہ اب بھی جاری ہے۔ ان محافل میں شرکت کے لیئے میں خاص طور پر لاہور سے کراچی جاتا۔ اردو کالج کے اساتذہ میں سے ایوب قادری، محمد یامین محمدی اور پروفیسر علی محمد شاہین بھی ان محافل میں تقریریں کیا کرتے تھے۔

ایک روز میری موجودگی میں قادری صاحب نے بھی تقریر کی۔ ان کا اندازِ بیان بالکل مولویانہ تھا میں ان کی تقریر کے دوران میں زیرِ لب مسکراتا رہا۔ تقریب کے اختتام پر میں نے ان سے کہا کہ وہ تو بالکل مولوی معلوم ہوتے تھے اور انہی کے لب و لہجے میں تقریر فرما رہے تھے۔

قادری صاحب میری بات سن کر مسکرائے اور فرمانے لگے کہ جب مولویوں کے اسٹیج سے بولنا ہو تو پھر مولوی بن کر ہی بولنا چاہیئے۔

لاہور میں جمعہ کے دن انارکلی بازار میں فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے اسٹال لگتے ہیں اور کبھی کبھی وہاں پرانے رسائل بھی بکنے آجاتے ہیں۔ قادری صاحب لاہور میں ہوتے تو جمعہ کے دن علی الصبح انارکلی پہنچ جاتے اور وہاں پرانی کتابوں اور رسالوں پر بغور نظر ڈالتے۔ اگر کوئی کتاب یا رسالہ ان کے کام کا ہوتا تو فوراً خرید لیتے۔ جب تک مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ زندہ رہے، قادری صاحب ان کی دکان پر بالالتزام جاتے رہے۔

میرا اور قادری صاحب کا کئی علمی کانفرنسوں میں ساتھ رہا۔ میں لاہور سے پنڈی، پشاور، کراچی، حیدرآباد جاتا تو موصوف کراچی سے تشریف لاتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ قادری صاحب آنکھ بچا کر اجلاس سے اٹھ جاتے اور کسی علمی ادارے میں پہنچ جاتے۔ شام کو ملاقات ہوتی تو مجھے اس دن کی "فتوحات" دکھاتے اور خوشی خوشی بتاتے کہ فلاں کتاب فلاں ادارے کے سربراہ نے پیش کی ہے اور فلاں کتاب فلاں ادارے سے لائے ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ قادری صاحب نے برسوں کی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد جو کتابیں جمع کی تھیں اب ان کے لواحقین میں سے ان سے استفادہ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کے ذخیرہ کتب میں ایسے جواہر پارے بھی ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے لواحقین کی غفلت سے یہ بیش بہا مجموعۂ کتب دیمک کی نذر ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی ادارہ ان کتابوں کو مناسب قیمت پر خرید لے تو ان کی حفاظت بھی ہو جائے گی جیسے وہ کہیں نہیں رکھ سکتے ہیں۔

ہیں نے قادری صاحب کی زبان سے کبھی کسی رفیق کار یا ریسرچ اسکالر کی غیبت نہیں سنی۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اکثر و بیشتر اسکالر "ہمچو ما دیگرے نیست،، کے وہم کا شکار ہیں اور ان کی محافل میں اپنے مخالفین کی عیب جوئی اور تنقیص کے سوا اور کسی موضوع پہ کم ہی گفتگو ہوتی ہے۔ ایوب قادری کو میں نے ان عیوب سے مبرا پایا۔

مرحوم بڑے متواضع، منکسر المزاج اور مرنجاں و مرنج انسان تھے۔ میں نے یہاں بزرگ کی بجائے جان بوجھ کر انسان لکھا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ولی بننا آسان ہے لیکن انسان بننا دشوار ہے۔ ہم نے کئی بڑے بڑے بزرگوں کو دیکھا ہے لیکن انھیں وصفِ انسانیت سے عاری پایا ہے۔ قادری صاحب جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے انسان تھے۔ ان میں تعلّی اور تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ اسی طرح مرحوم مذہبی معاملات میں بڑے غیر متعصب اور بے ضرر تھے۔ ان کے احباب میں غالی بریلوی، متشدد اہلِ حدیث ثقہ دیوبندی شامل تھے۔ لاہور میں ان کے مستقل میزبان حکیم محمد موسیٰ امرتسری بزمِ رضا پاکستان کے سکریٹری تھے۔ پروفیسر یامین محمدی اہلِ حدیث کے سب سے سخت مکتبِ فکر انجمن غرباء اہلِ حدیث (امامیہ گروپ) کے رکن رکین تھے۔ راقم الحروف ذہنی طور پہ علمائے دیوبند سے تعلق اور نسبت رکھتا ہے قادری صاحب کا تعلق ہم تینوں سے ایک جیسا تھا۔ اور مذہبی موضوع پہ ہماری ان کے ساتھ کبھی بحث نہیں ہوئی۔ ان کی طرح ان کے برادر عزیز ابو معاویہ نعمت اللہ قادری مرحوم بھی مرنجاں و مرنج انسان تھے اور تمام مکاتبِ فکر کے لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے تھے اور ہر شخص انھیں اپنے ہی مکتبِ فکر کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ایوب قادری اور نعمت اللہ دونوں بھائی دو سوا دو سال کے فرق سے ٹریفک کے حادثوں میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

میں نے قادری صاحب کو نجی محافل میں بھی دیکھا اور کانفرنسوں میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ اردو کالج کراچی، انجمن ترقی اردو، مطب حکیم محمد موسیٰ امرتسری، پنجاب یونیورسٹی

لائبریری اور اپنے غریب خانے اور ان کے دولت کدے پر ان سے ملاقاتیں رہیں۔ میں نے انھیں سراپا فنا فی العلم پایا۔ اُن کی گفتگو خالص علمی ہوا کرتی تھی، اُن کا ذہن تحقیقی تھا اور وہ ہر وقت تحقیق و تجسس میں لگے رہتے تھے۔ وہ ہم جیسے طالب علموں کی امداد کو فرضِ عین سمجھتے تھے۔ ایک بار میں کراچی میں قیام کے دوران پنجابی سوداگران دہلی کے قبرستان "یوسف پورہ" میں مسعود عالم ندوی مرحوم کی قبر کی تلاش میں گیا۔ اُن کی قبر تو مجھے نہ ملی لیکن کئی اور مشاہیر کی قبریں مل گئیں۔ ان میں سے ایک قبر پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی بھی تھی۔ غضنفر مرحوم قادری صاحب کے استاد تھے۔ میں نے لاہور آکر قادری صاحب سے اُن کے بارے میں معلومات چاہیں تو انھوں نے اپنا ایک مضمون جو کراچی کے کسی ماہنامے میں غضنفر مرحوم کی وفات کے جلد بعد چھپا تھا، بھیج دیا۔ میں نے اس مضمون سے اپنے مطلب کی باتیں نقل کر لیں اور مضمون واپس کر دیا۔

چند سال ہوئے اُن کا ایک جواں سال بیٹا فوت ہو گیا۔ مجھے اس سانحہ کی اطلاع حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے دی۔ میں نے قادری صاحب کو تعزیتی خط لکھا جس کا انھوں نے فوراً جواب دیا۔ خط کا جواب دینے میں مرحوم تاخیر کو گناہ سمجھتے تھے۔ خواہ وہ جواب میں دو سطریں ہی لکھیں، لیکن جواب فی الفور دیا کرتے تھے۔

قادری صاحب اردو کالج کے مجلّہ "برگِ گل" کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے اس مجلّے کے کئی شاندار نمبر نکالے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر برگِ گل کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے "علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد کا پس منظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا جس میں دو قومی نظریہ کی تاریخ TRACE کی تھی۔ جن دنوں مرحوم مولانا محمد علی جوہر کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں "برگِ گل" کا خصوصی شمارہ مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ مولانا جوہر کا تعلق زمانۂ حال

سے ہے اور میں بنیادی طور پر قرونِ وسطیٰ کی تاریخ و ثقافت کا طالب علم ہوں، اس لئے یہ فرمائش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ انھوں نے مجھے خط لکھا کہ میں اس خصوصی شمارے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ ان کے اصرار پر میں نے مولانا جوہر کی تحریکِ خلافت سے وابستگی کی بنا پر "نظریۂ خلافت" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں مسئلہ خلافت پر تمام مسلمان مفکرین کی آرا جمع کر دیں۔ میرا یہ مضمون بڑا طویل ہو گیا تھا اور ادھر مجھ سے بھی کچھ تاخیر ہو گئی، قادری صاحب رسالہ مرتب کر کے کتابت کرا چکے تھے۔ بدیں وجہ میرا مضمون اس شمارے میں شامل نہ ہو سکا۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ میں انھیں اجازت دوں تو وہ یہ مضمون کسی علمی یا دینی رسالے میں چھپوا دیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مضمون اب ان کی مِلک ہے، جیسا چاہیں کریں۔ انھوں نے وہ مضمون مولانا یوسف لدھیانوی کے حوالے کر دیا۔ اور انھوں نے اسے ماہنامہ بیّنات میں چھاپ دیا۔ جب یہ مجلّہ مجھے ملا تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ خوشی اس بات پر کہ میرا مضمون ایک ہی قسط میں چھپ گیا اور حیرت اس بات پر کہ یہ مضمون بیس صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور بیّنات سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد میرے متعدد مضامین بیّنات میں شائع ہوئے۔ یہی مضمون میں نے تھوڑے سے اضافے اور ترمیم کے ساتھ ملتان یونیورسٹی کی طرف سے چھپنے والی ایک یادگاری کتاب میں "نظریۂ خلافت عہدِ بعید" کے عنوان سے چھپوایا۔ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو مضمون نگار کا نام محمد سلیم اور مضمون کا عنوان "نظریۂ خلافت عہدِ بعید" چھپا ہوا دیکھا۔ "عہدِ بعید" پڑھ کر تو میں سٹپٹا سا گیا لیکن تسلّی اس بات پر ہو گئی کہ مضمون میری بجائے کسی محمد سلیم کے کھاتے میں پڑ گیا اور اس میں موجود اغلاط اس کے سر پڑ گئیں۔

آخری ایامِ حیات میں قادری صاحب "برگِ گل" کا نواب بہادر یار جنگ نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے حسبِ معمول مجھے بھی اس شمارے میں لکھنے کی دعوت

دی۔ میں نے وہی پرانا عذر پیش کیا۔ انھوں نے پھر لکھا کہ میں اس شمارے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ میں نے انھیں لکھا کہ میرے نواب صاحب مرحوم و مغفور کو ۱۹۴۲ء میں کراچی میں مسلم لیگ کی اکتیسویں سالانہ جلسے میں دیکھا تھا اور ان کی تقریر بھی سنی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں تین باتیں ایسی بھی سنی ہیں جو کسی تذکرے میں میری نظر سے نہیں گزریں۔ قادری صاحب نے مجھے فوراً خط لکھا کہ میں ان کی تقریر کے بارے میں اپنے تاثرات اور وہ تین باتیں لکھ کر بھیج دوں۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی لیکن ان کی اچانک موت سے "برگِ گل" کا خصوصی شمارہ شائع نہ ہو سکا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے اس مضمون کا کیا بنا۔

میں عموماً صبح ناشتہ کے دوران اخبار کا مطالعہ کیا کرتا ہوں ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء کو میں حسب معمول اخبار دیکھ رہا تھا کہ دوسرے صفحے پر ایک کالمی تین سطری خبر پر میری نگاہ جم کر رہ گئی۔ میری زبان سے بے اختیار انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا اور ٹوسٹ کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں پکڑا رہ گیا۔ اخبار میں یہ مرقوم تھا کہ مشہور اسکالر اور محقق ڈاکٹر محمد ایوب قادری ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ اتنا بڑا انسان اور اسکالر فوت ہو گیا لیکن ہمارا ایک مؤقر اخبار صرف تین سطروں میں اس کی وفات کی خبر چھاپ رہا ہے۔ اگر کوئی اداکار، موسیقار، پلے بیک سنگر، سرود نواز یا طبلچی مرجاتا تو یہی اخبار کئی روز تک صفحہ اوّل پر سرخیاں جماتا رہتا اور خصوصی نمبر شائع کرتا۔ کیا ہمارے معاشرے میں ایک عالم اور محقق کی یہی قدر ہے؟ اگر کوئی فلمی یا ٹی وی اداکار شاپنگ کے لئے بازار چلا جائے تو وہاں ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی بین الاقوامی شہرت کا اسکالر بازار سے گزرے تو کوئی نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کرے۔ اب کوئی کس حوصلے اور برتے پر علم و ادب کی طرف توجہ دے؟

میں قادری صاحب کی وفات کی خبر پڑھتے ہی بادیدہ گریاں و دل بریاں حکیم محمد موسیٰ کے مطب پہنچا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ اس روز ریلوے اسٹیشن کے سامنے نوری مسجد میں یومِ رضا کی تقریبات کی برسی فرما رہے ہیں۔ میں مطب سے سیدھا نوری مسجد پہنچا اور علیک سلیک کے بعد ان سے پوچھا کہ انھوں نے کوئی منحوس خبر تو نہیں سنی؟ حکیم صاحب نے نفی میں جواب دیا تو میں نے انھیں اس سانحہ کی اطلاع دی۔ قادری صاحب کے ساتھ ان کا جو قلبی تعلق تھا اس کی بنا پر انھیں ان کی وفات کی خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا اور وہ دیر تک ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

قادری صاحب کی وفات سے ان کے بے شمار دوستوں اور مداحوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ ان کے جس دوست یا آشنا سے میری ملاقات ہوئی اس نے دلی رنج کا اظہار کیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے خلوص اور کام سے لگن کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی وفات کو ایک سال گزر چکا ہے لیکن اب تک ان کے دوست و احباب انھیں یاد کر کے سرد آہیں بھرتے ہیں۔ ان کے احباب میں سے ڈاکٹر وارث محمد ترمذی، جناب ثناء الحق صدیقی، حکیم محمد موسیٰ امرتسری اور جناب شمس الدین حنفی جب بھی مجھے ملتے ہیں تو قادری صاحب کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۳ء میں قادری صاحب کی وفات کے ایک ماہ بعد میرا کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو میں تعزیت کی غرض سے ان کے گھر بھی گیا۔ ان کا بیٹا اسعید حسن گھر میں موجود تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور میں دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ میں نے قادری صاحب کی قبر پر جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے ایک پڑوسی کو بلایا اور وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر سخی حسن کے قبرستان میں قادری صاحب کی قبر پر لے گیا۔ میں نے وہاں پر فاتحہ خوانی کی اور ان کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا کی۔ رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاسِعاً کَثِیْراً

ڈاکٹر وفا راشدی

رفعت از محفلِ ما آہ! یگانہ شخصے

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم ایک بلند پایہ عالم، محقق اور ادیب تھے۔ ایک لائق اور مشفق استاد کی حیثیت سے بھی انھیں مقبولیت حاصل تھی۔ وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں، ذاتی اخلاص اور وضعداری کے باعث علمی و ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سادگی، سچائی اور صاف گوئی ان کی ذات کا سب سے بڑا جوہر تھی ؎

خاکسارانہ مزاج اُس کا، ہر اک آن کے ساتھ
وہ خزفِ ریزہ بھی تھا، گوہرِ یک دانہ بھی

علم و ادب کے حوالے سے ڈاکٹر ایوب قادری سے میرا دیرینہ تعلق تھا۔ میں نے قادری صاحب کا نام سب سے پہلے ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب سے سنا تھا۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب اُس زمانے میں اردو کالج کراچی چھوڑ کر سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کر لی تھی یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ اُن ہی دنوں ڈاکٹر صاحب قبلہ کی توجہ اور سفارش سے میری کتاب "بنگال میں اردو" سندھ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے منظور کر لی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اردو کالج کے بزرگوں اور استادوں میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اختر میاں جوناگڑھی اور پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر کا ذکر بڑے احترام سے فرماتے۔ اسی طرح اردو کالج کے ہونہار و ممتاز طلبہ میں ایوب قادری کا نام بے حد شفقت و

محبّت سے لیتے۔ ایوب قادری کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک مضمون تحریر فرمایا جس میں اپنے ہونہار و لائق شاگرد کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر ایوب قادری صاحب کو "بنگال میں اردو" کا ایک نسخہ بھیجا۔ قادری صاحب نے نہ صرف محبّت آمیز الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا بلکہ اس کتاب کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے سے بھی نوازا۔ پھر ہماری خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُدھر وہ ملنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے اِدھر میں اُن سے ملاقات کے لئے بیتاب تھا۔ اس عرصے میں اُن کی کئی کتابیں میری نظر سے گزریں۔ تذکرہ فیض احمد بدایونی[1] کے علاوہ آل پاکستان ایجوکیشنل کراچی کی مطبوعہ کتابیں علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، فرحت الناظرین، علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی) وغیرہ۔ کرم فرمائے مکرم سیّد الطاف علی بریلوی (سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس، مدیر اعلیٰ سہ ماہی "العلم") بڑے جوہر شناس اور یگانۂ عصر صاحبِ فکر و نظر ہیں۔ وہ خود علم و عمل اور جہدِ مسلسل کے حیرت انگیز مثالی پیکر ہیں۔ جوہر قابل ارباب علم و دانش کی کھلے دل سے حوصلہ افزائی کرتے اور ان کو آگے بڑھانے کا خوب جتن فرماتے ہیں۔ ایسی اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ سیّد صاحب نے اپنی فراست اور پرخلوص تعاون سے نہ جانے کتنے سنگریزوں کو ستارے بنا کر آسمان کی زینت بنا دیا۔

ان میں سے ایک ایوب قادری بھی تھے۔ سیّد صاحب نے دو تین ملاقاتوں میں ہی ایوب قادری کی صلاحیتوں کو تاڑ لیا۔ اُن سے "العلم" کے لئے مضامین لکھوائے۔ کئی علمی و معیاری کتابیں اُن سے ایڈٹ اور ترجمے کرائے اور انھیں اپنے ادارے سے شائع کئے۔[2]

---

[1] یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔

[2] دوسروں کے سہارے کچھ شہرت، کچھ عزت، کچھ دولت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ سید صاحب کی بزرگانہ روش کا کرشمہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریب میں مجھے شرکت کا موقع ملا۔ اس تقریب کے اختتام پر سید صاحب نے ایوب قادری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ سید صاحب نے ہم دونوں کے لئے تحسین آمیز کلمات استعمال کئے۔ قادری صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد سیرا ہے، گاہے گاہے علمی یا ادبی تقریبات میں ان سے ملاقاتیں ہوجاتیں اور کسی نہ کسی موضوع سے متعلق گفتگو ہوا کرتی۔

قادری صاحب ۱۹۶۲ء میں اردو کالج میں جز وقتی لیکچرار مقرر ہوئے ۱۹۶۳ء میں کُل وقتی لیکچرار کے عہدے پر قائز ہوگئے۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے اور شعبۂ اردو کے صدر نشیں ہوگئے۔ میرا وتیرہ تھا کہ جب بھی کوٹری سے کراچی آتا، اردو کالج میں ڈاکٹر ایوب قادری سے ملتا۔ اور انجمن ترقی اردو پاکستان میں مشفق خواجہ صاحب سے۔ خواجہ صاحب بہت محبت سے ملتے۔ جس دلچسپی سے میرے مضامین ”قومی زبان“ میں شائع فرماتے اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ میں ان کی نوازشات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

بقیہ حاشیہ نمبر ۴:۔ کم لینے کے بعد عموماً لوگ اپنے محسنوں کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے لیکن یہ ایوب قادری کی بڑائی تھی کہ انھوں نے سید الطاف علی بریلوی کی حیات اور خدمات سے متعلق ایک کتابچہ (مطبوعہ ایجوکیشنل کانفرنس) لکھ کر ان کے الطاف اور اخلاص کا برملا اعتراف کیا۔ قادری صاحب اس کتاب میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

”ایک روز بریلوی صاحب نے میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا اور کتابیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے بسر و چشم قبول کیا۔ تاریخی کتابیں دیکھ کر اظہار پسندیدگی فرمایا اور نصیحت کی کہ یہ بڑا قابلِ قدر ذخیرہ ہے اس کو حفاظت سے رکھئے۔ عاریتاً دینے کا سلسلہ شروع نہ کیجئے۔ دی ہوئی کتب بہت کم واپس ملتی ہیں۔ میں نے اپنے دو شائع شدہ مضمون ”دورِ روہیلہ میں شعر و شاعری“ اور ”روہیلوں کے عہد میں ہندوؤں سے رواداری“ (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۹۸۳ء کے اوائل میں پاکستان آرٹ کونسل کراچی میں عبدالجلیل بسمل کی تصنیف "سلہٹ میں اردو" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان) کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کے صدر اختر حسین مرحوم مسندِ صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ پروفیسر شبیر علی کاظمی مرحوم (شریک معتمد انجمن) نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مقررین میں ایوب قادری نے دورانِ تقریر فرمایا تھا۔ "سلہٹ میں اردو" اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے جو بنگال کے ایک صوبہ کی ادبی خدمات سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ "سلہٹ میں اردو" کے مصنف نے میرے دوست وفا راشدی کی کتاب "بنگال میں اردو" سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ "بنگال میں اردو" مغربی و مشرقی بنگال میں اردو زبان و ادب کی مبسوط و مربوط تاریخ ہے"۔ اس مختصر سے حوالے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ قادری صاحب اس خاکسار کو اپنے دوستوں کے زمرے میں جگہ دیتے تھے اور اس کے کام کو سراہتے تھے۔ یہ بات ان کی شرافت اور ودادتا نہ خلوص کا پتہ دیتی ہے۔

میں ۱۹۸۳ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوا۔ قادری صاحب کا معمول تھا کہ اردو کالج میں کلاس لینے سے پہلے عموماً ۳، ۴ بجے سہ پہر کے وقت شبیر علی کاظمی مرحوم (۳۱ جنوری ۱۹۸۵ء کو وہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے) کے کمرے میں بیٹھ جاتے اور کسی نہ کسی علمی موضوع پر گفتگو چھڑ جاتی۔ علمی مباحثے سے ان کی دلچسپی کا

دکھائے اور عرض کیا کہ "روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات" زیرِ ترتیب ہے۔ سید صاحب نے دونوں مضامین پر اظہار پسندیدگی فرمایا اور کہا کہ عمارات والا مضمون "العلم" کے لئے تیار کر دیجئے۔ دو مہینے کی مدت میں میں نے وہ مضمون تیار کر کے دیدیا جس کو سید صاحب نے اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا خدا کا شکر ہے کہ وہ مضمون علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس کے بعد العلم میں مضمون لکھنے لگا اور سید صاحب مثل عزیزوں کے میرے ساتھ شفقت و محبت فرمانے لگے۔" (سید الطاف علی بریلوی حیات و خدمات۔ مصنفہ ڈاکٹر ایوب قادری۔ ص ۱۰-۱۱ سنہ ۱۹ء)۔

یہ عالم تھا کہ بعض اوقات انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انھیں کلاس لینا ہے۔ اچانک خیال آتا تو اُٹھ کر سیدھے کلاس میں چلے جاتے۔ انجمن سے اُن کا دیرینہ تعلق تھا۔ انجمن نے اُن کی دو کتابیں شائع کیں۔ ایک "جنگ نامہ آصف الدولہ نواب رامپور (ترتیب) ان کی زندگی میں ۱۹ء میں شائع ہوئی۔ اور دوسری کتاب "لولوئے از غیب[1]"، ہے۔ اس کا مخطوطہ قادری صاحب کے نجی کتب خانے کے ذخیرے میں محفوظ تھا۔ انھوں نے اسے بطور عطیہ انجمن کی نذر کر دیا۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا ثناء الحق صدیقی صاحب ایم اے (علیگ) کا مبسوط مقدمہ حاصلِ مطالعہ ہے۔ قادری صاحب اس مثنوی اور اس کے مصنف شیولال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شیولال قصبہ آنولہ (ضلع بریلی، روہیل کھنڈ انڈیا) کے ایک کایتھ خاندان کے فرد تھے۔ وہ جوتش ودیا یعنی علم نجوم سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے شگن کے موضوع پر ایک مثنوی باسم تاریخی "لولوئے از غیب" (۱۱۰۲ھ / ۹۱-۱۶۹۰ء) لکھا ہے

یہ مثنوی عالم گیری عہد کی تخلیق ہے اس لئے شمالی ہند میں اُردو نظم کے ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اُردو زبان و ادب کے طلباؤ و مورخین کے لئے قابلِ توجہ ہے۔"

محترمی جمیل الدین عالی صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے اپنے "حرفِ چند" میں جن گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن سے مثنوی "لولوئے از غیب"، کی افادیت و اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آخری عبارت

---

[1] لولوئے از غیب ایوب قادری کی آخری کتاب ہے جو اُن کی وفات کے بعد فروری ۱۹۸۵ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس کتاب کا سالِ تدوین ۱۹۸۲ء ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ ہے۔

یں قادری مرحوم کے بارے میں جو تاثرات پیش کئے ہیں وہ ریکارڈ کرنے کی چیز ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم اردو کالج کے واسطے سے اور اپنی ذاتی حیثیت میں بھی انجمن کے ایک بہت قیمتی معاون تھے۔ اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔ بڑی لگن کے انسان تھے۔ انھوں نے بہت کام کیا۔ اور بہتوں کی انتہائی مفید اور بے غرضانہ رہنمائی کی۔ زیر نظر مثنوی پر کام انجمن کے لئے ان کا آخری اور بہت قیمتی تمغہ ہے۔"

وفات سے چند روز پہلے ایوب قادری نے انجمن میں مجھ سے بڑی بے تکلفی سے کہا تھا "وفا صاحب میں آپ کی کتابوں پر تبصرے پڑھتا رہتا ہوں، دوستوں سے ذکر سنتا ہوں لیکن یہ کتابیں پڑھنے کو ترستا ہوں۔" یہ بات میرے دل کو لگی اور میں اسی وقت ان کے صاحبزادے سعید حسن کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا اور اپنی دو کتابیں "حیاتِ وحشت" اور "آہنگِ ظفر" انھیں پیش کر دیں۔ قادری صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی ان کتابوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ صد حیف کہ اس کی نوبت نہ آئی۔

کئی برسوں سے قادری صاحب کا معمول تھا کہ جس حال میں ہوتے جہاں ہوتے جیسے ہوتے بلا ناغہ روزنامچہ ضرور لکھتے۔ انتقال سے ایک دن پہلے انجمن میں ہماری کافی دیر تک بیٹھک رہی۔ اس کا ذکر انھوں نے ۲۴ر نومبر ۸۳ء کی ڈائری میں ان الفاظ میں کیا:

"ایک بجے کے بعد کھانا کھایا۔ پھر سیدھا کالج گیا۔ شبیر علی کاظمی صاحب سے ملا۔ اُردو رسالہ[1] کے دو مضمون دیکھے۔ کلاس لیا۔" (مطبوعہ روزنامہ جسارت کراچی ۲ دسمبر ۸۳ء)

---

[1] قادری صاحب کا آخری مضمون "وحید احمد مسعود" سے متعلق ان کی زندگی میں رسالہ "اُردو" کے شمارہ جولائی تا ستمبر ۸۳ء میں طبع ہوا تھا۔

اس کے دوسرے دن جمعہ ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو اچانک ایک حادثے کا شکار ہوئے اور ہماری پر رونق محفل کو سنسان کر گئے۔

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم خلوص و مروت کا مجسمہ تھے۔ اخلاص و محبت میں یگانہ۔ کوئی علمی بحث ہو یا ادبی مسئلہ، کھل کر اظہار خیال کرتے۔ موضوع کی چھان پھٹک کے بغیر نہ کوئی بات کرتے نہ کچھ لکھتے۔ اظہار کے لئے سادہ پیرایہ اختیار کرتے الفاظ کا ہیر پھیر انھیں نہیں آتا تھا۔ علمیت کی دھونس جمانے کی کبھی کوشش نہ کرتے۔ لہجے میں نرمی و عاجزی، وضع قطع میں ایسی سادگی کہ درویشی کی شان نمایاں رہتی۔ اس پر ان کی دلفریب مسکراہٹ کا جادو سر چڑھ کے بولتا۔ استادوں کا احترام، شاگردوں سے محبت، چھوٹوں سے شفقت اور دوستوں سے مروت کا ایسا دلآویز انداز اپناتے کہ مشرقی تہذیب کی حقیقی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی۔ وہ موقع پرستی یا مصلحت کوشی کے فن سے بے بہرہ تھے۔ اس نفا نفسی اور زرپرستی کے دور میں ایسی نیک خصلت، صالح اور بے غرض ہستی کا اُٹھ جانا ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے جو بلاشبہ ایک ناقابلِ تلافی قومی و علمی نقصان کے مترادف ہے ؎

اس کا دل تھا دین کے نورِ مبیں سے مستنیر
محرمِ اسرارِ فطرت، عالمِ روشن ضمیر
وہ کہ تھا پروانۂ شمعِ رسالت اے خدا
ہو کرم اُس پر طفیلِ شافعِ محشرؐ ترا
وہ سدا فردوس کی ٹھنڈی ہواؤں میں رہے
خلدِ رنگ و نور و نکہت کی فضاؤں میں رہے

ڈاکٹر محمد اسلام

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

(ایک تاثر)

میر تقی میر نے سچ کہا ہے ؎

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

بے شک دنیا میں وہی لوگ مرنے کے بعد یاد کئے جاتے ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے کوئی کام کر جاتے ہیں۔ میرے کرم فرما محمد ایوب قادری مرحوم بھی اُن نابغۂ روزگار لوگوں میں سے تھے جو اپنے عظیم علمی کارناموں کی وجہ سے امر ہو گئے ہیں۔

ایوب قادری مرحوم کو علم و ادب سے جو شغف تھا اُس سے ادبی حلقے بخوبی واقف ہیں۔ تحقیقی کاموں کے تو وہ مردِ میدان تھے۔ وہ ہر وقت علم کی طلب و جستجو میں سرگرداں رہتے اور جہاں سے جو چیز ملتی اُس کو سینہ یا سفینہ میں محفوظ کر لیتے اور ضرورت کے وقت کام میں لاتے۔

ایوب صاحب کے کردار کی کئی خوبیاں ایسی ہیں جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ سادہ طبیعت، صاف گو، مرنجاں و مرنج، عفو و درگزر سے کام لینے والے اور اپنی کمزوریوں کا اخفا نہ کرنے والے تھے۔ سادگی اُن کی ہر بات میں تھی۔ اُن کا طرزِ بود و ماند سادہ تھا۔ ان کی گفتگو سادہ اور تصنّع و تکلّف سے عاری تھی۔ اُن کا لباس سادہ تھا۔ اُن کی اِس سادگی کو دیکھ کر لوگوں کو یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ اس سادگی میں علوم و فنون کا ایک خزانہ چھپا ہوا ہے۔

صاف گوئی بھی ایوب صاحب کے کردار کی ایک اہم خوبی تھی۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے، برملا اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ بعض اوقات اُن کی اس صاف گوئی پر دوسرے لوگ برا مان جاتے مگر ایوب صاحب حق گوئی کو دوسروں کے برا ماننے سے ترک کرنے کے لیئے تیار نہیں ہوتے تھے۔

اُن میں عفو و درگزر کا مادہ بھی بہت تھا۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا ہوا کہ اُن کا کسی سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ اسی میں فریق ثانی نے اُن کو سخت باتیں بھی کہہ دیں اور پھر اُن سے کٹے کٹے سے رہنے لگے۔ ایوب صاحب ان کی سخت باتیں سُن کر بھی ناراض نہیں ہوئے۔ اور پھر خود ہی اُن کو منانے کے لیئے کوشاں رہے۔ ایسا ایک واقعہ اُن کا پروفیسر رشید احمد ارشد صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ارشد صاحب، ایوب صاحب سے کسی بات پر ناراض ہوگئے اور پھر ان سے ملنا جلنا اور گفتگو کرنا بند کر دیا۔ لیکن ایوب صاحب برابر ان کو راضی کرنے میں لگے رہے۔ ایک روز حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے مکان پر دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ ارشد صاحب نے بچ کر نکلنا چاہا لیکن ایوب صاحب اُن سے معانقہ کرنے کے لیئے کوشاں رہے۔ وہ منظر بھی بڑا دلچسپ تھا جب ایوب صاحب دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہنستے اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ "ارے مولانا صاحب! بس اب اپنی ناراضگی کو دور کیجئے اور آج تو مجھ سے گلے مل لیجئے"۔ اور پروفیسر ارشد صاحب خود پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور ایوب صاحب کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلتے جاتے تھے۔ آخر کچھ عرصہ بعد احباب نے دونوں میں صلح صفائی کروادی۔

ایوب صاحب نے کراچی میں آکر شروع میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ رہنے کے لیئے مناسب ٹھکانا نہیں تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے مالی حالت بھی درست کر دی اور ایک پُر آسائش۔ دو منزلہ مکان بھی عطا فرمادیا۔ لیکن ایوب صاحب نے اپنی سابقہ حالت کو کبھی چھپایا نہیں۔ بلکہ بعض موقعوں پر خود ہی

اس کا ذکر کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ علمی و ادبی گفتگو کے دوران انھوں نے سب کے سامنے بتایا کہ "جب میں وحید آباد کی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا تو وہاں بیٹھنے اٹھنے تک کی سہولت نہیں تھی لیکن میں اسی حالت میں کتابیں جمع کرتا اور علمی و ادبی کاموں میں لگا رہتا تھا۔"

ان میں صبر و ضبط کا مادہ بھی بہت تھا۔ چھوٹے بھائی نعمت اللہ قادری اور جوان بیٹے زبیر حسن کا انتقال ہوا۔ ایوب صاحب کے دل نے ان دونوں صدموں کا اثر لیا لیکن بظاہر وہ خود کو سنبھالے رہے اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ چنانچہ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بیٹے کے انتقال کے تیسرے روز بیٹھے ہوئے احباب کے ساتھ کسی علمی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

علما کی قدر و منزلت بھی ایوب صاحب کے دل میں بہت تھی اور وہ ان کی خدمت کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پنجاب سے ایک بڑے عالم ان کے گھر تشریف لائے۔ جب وہ جانے لگے تو ایوب صاحب نے ان کے جوتے ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیئے۔ ہر چند انھوں نے ان کو منع کیا لیکن ایوب صاحب اپنا کام کر گزرے۔

غرض ان کی کن کن خوبیوں کا ذکر کروں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو دل اس تصوّر سے تڑپ اٹھتا ہے کہ دستِ بیدادِ اجل نے ہم سے کیسا گوہر یکتا چھین لیا۔ نوّر اللہ مرقدہٗ و مضجعہٗ

غلام محمد لاکھو

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

(چند یادیں)

جب سے ادبی دنیا اور خاص کر علم تاریخ سے شغف ہوا تب سے کچھ بزرگوں کے نام سن رکھے تھے جن میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام سرفہرست ہے۔ کراچی سے میرا علمی و ادبی واسطہ مرحوم پیر حسام الدین راشدی کی وجہ سے بڑھا۔ پیر صاحب سے دعا سلام ۱۹۶۶ء سے شروع ہوئی۔ جب بھی کراچی جاتا آپ سے ضرور ملاقات ہوتی۔ آخری دنوں میں پیر صاحب تنہائی کا حد سے زیادہ شکار نظر آتے تھے۔ اس لیے ملاقات کے بعد اٹھتے تو اگلی مرتبہ آنے کے لیئے ضرور کہتے۔ الحمرا میں واقع پیر صاحب کے بنگلہ پر جن ادبا و شعراء کے نام بڑی عزت و تکریم سے سنے، ان میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام بھی سرفہرست ہے۔

اردو ادب میں تاریخی لٹریچر اور تحقیقی مواد مہیا کرنے میں شروع سے لے کر آج تک جن لوگوں نے قلم اٹھایا اور ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے تاریخ کے ذریعہ قومی شعور کو آگے بڑھایا، ان میں ڈاکٹر قادری مرحوم صفِ اول کے مجاہد تصور کئے جاتے ہیں۔ قادری صاحب کا تعلق تحقیق اور تاریخ سے تو تھا ہی لیکن اردو ادب کی تاریخ اس بزرگ کو صدیوں تک اردو کے ایک محسن کے طور پر یاد رکھے گی۔ کیونکہ آپ نے برصغیر کے مشاہیر اور تاریخ کی چند فارسی کتب کو اردو میں منتقل کیا اور اس طرح فارسی سے ناآشنا لوگوں کے لئے ایک طرف آسانی پیدا کی اور دوسری طرف اردو کے تاریخی ادب میں گرانقدر

اضافہ کیا۔ ترجمے کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے، ادب کی صنف اتنی ہی نازک ہے۔ تراجم کے علاوہ ڈاکٹر قادری مرحوم نے کچھ اصل ورک بھی چھوڑا ہے۔

۱۹۸۱ء میں ایک مرتبہ پیر حسام الدین راشدی کے پاس گیا۔ باتوں باتوں میں آپ نے مجھ سے سندھ کے ایک قبیلہ بہیم کے متعلق سوال کیا اور فرمانے لگے کہ گاؤں پہنچ کر اس ضمن میں جتنا بھی مواد مل سکے مجھے بذریعہ ڈاک روانہ کر دینا۔ گاؤں واپس آکر اس سلسلے میں تگ و دو کی۔ اور میرے اپنے ذخیرے میں بہلیم قبیلے پر جو مواد مل سکا، پیر صاحب کو بھیج دیا۔

اس دوران راشدی صاحب پر بیماری کا حملہ ہوا۔ آپ علاج کی خاطر لندن روانہ ہو گئے اور واپسی پر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ماہنامہ قومی زبان نے ہمارے اس بزرگ پر ایک شاندار نمبر نکالا جس میں میری توجہ دو مضامین پر گئی۔ جن میں ایک پنجاب کی مصنفہ کا مضمون اور دوسرا ڈاکٹر قادری کا آرٹیکل جس کا عنوان تھا "اردو کا پیر"۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے قادری صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ میرے خیال میں انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے پیر صاحب کی ایک اہم اردو کتاب "سندھی ادب" کو اس آرٹیکل میں شامل نہیں کیا تھا۔

گزشتہ سال میرے مربّی دوست ڈاکٹر نواز علی شوقؔ نے خط لکھ کر مجھے جامعہ کراچی بلایا کیونکہ وہ مجھے وہاں ٹیچر بنانے کے لئے تاریخ عامہ کے چیئرمین سے بات کر چکے تھے اور اس ضمن میں رحمٰن صاحب سے میری ملاقات کرانا چاہتے تھے۔ میں اپنے دوست غلام علی کے ساتھ یونیورسٹی گیا ہم سیدھے رحمٰن صاحب سے جا کر ملے وہاں ایک اور بزرگ پہلے ہی سے موجود تھے جن کا تعارف کراتے ہوئے رحمٰن صاحب نے کہا ان سے ملئے یہ ہیں اردو کے

بلند پایہ محقق اور ادیب ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب، میں جس شخص کو آسمان پر تلاش کر رہا تھا وہ مجھے زمین پر مل گیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر قادری صاحب سے راشدی صاحب کے سلسلے میں آپ کے تحریر کردہ مضمون پر جرح شروع کر دی۔ وہ بڑے عالم اور ادیب تو تھے ہی لیکن ساتھ شرافت اور علمیت کا مجسمہ بھی۔ میری بات پر ذرہ بھر بھی ناراض نہ ہوئے اور میرے موقف سے اتفاق کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ باتوں باتوں میں، میں نے ان سے سوال کیا۔ حضرت آج کل کیا تحقیق ہو رہی ہے؟ فرمانے لگے سندھ کا ایک قبیلہ بہلیم ہے، اس پر کچھ لکھنے کا ارادہ ہے لیکن مناسب مواد دستیاب نہیں ہو رہا۔ ایک مرتبہ پیر صاحب نے بھی کسی دوست سے اس موضوع پر مواد منگایا تھا لیکن محکمہ ڈاک کی اچھی کارکردگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھ تک نہیں پہنچ پایا۔ قادری صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے قادری صاحب کو بتایا کہ یہ مواد تو پیر صاحب کو میں نے ہی ارسال کیا تھا۔ یہ سن کر مرحوم بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے، یار میرا ایک اچھا خاصا پرابلم حل ہو گیا۔ بڑی قربت اور نیازمندی سے کہنے لگے، بھائی دوبارہ تکلیف کر کے یہ مواد مجھے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ کر دینا تو آپ کی بڑی نوازش ہو گی۔ انھوں نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دے دیا۔

گاؤں واپس ہوتے ہی میں نے بہلیم سے متعلق مواد سندھی ادب کی ایک کاپی اور خط قادری صاحب کو ارسال کر دی اور ساتھ ہی پیر صاحب کا ایک کتابچہ "ملا محب علی سندھی" کا فوٹو اسٹیٹ بھی مانگ لیا۔ قادری صاحب نے مواد ملنے کی اطلاع ۸۳-۹-۷ کو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ یوں دی:

برادرم لاکھو صاحب السلام علیکم

آپ کا ارسال کردہ رسالہ سندھی ادب (راشدی مرحوم) اور خط ملا۔ اطلاع

متعلق بہلیم موصول ہوا۔ جس کے لیئے دل سے شکر گزار ہوں۔

مطلوبہ عکسی نقل محُب علی سندھی ضرور بھیجوں گا، اطمینان فرمایئے۔ اگر کراچی آنے کا پروگرام ہو تو مطلع کر دیجیئے تاکہ ملاقات رہے۔ فقط والسلام۔

خاکسار محمد ایوب قادری

میرے پاس قادری صاحب کا یہ پہلا اور آخری خط ہے جو میرے لئے ایک بڑا اعزاز اور سعادت ہے۔

جریدے "مہران،، نے پیر حسام الدین راشدی پر گزشتہ سال ایک یادگار ایڈیشن شائع کیا جس میں ہمارے ایک اور بزرگ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی صاحب نے پیر صاحب کے ایک نادر مقالے "ایران اور سندھ کے تعلقات،، کا انکشاف کیا۔ بعد میں میری گزارش پر انھوں نے اس کی عکسی نقل بھی فراہم کر دی تھا۔ میں نے مقالہ پڑھتے ہی اس کا سندھی ترجمہ کرنا شروع کر دیا لیکن یہ اس کو جتنا آسان سمجھا تھا اتنا ہی مشکل ثابت ہوا۔ کیونکہ نقوش والوں نے یہ آرٹیکل چھاپا تو بڑی خوشی سے تھا لیکن اس میں کتابت کی کئی ایک غلطیاں رہ گئی تھیں اس لئے ترجمہ کرتے وقت کچھ وضاحتوں کے لئے مجھے پہلے علاّمہ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سے رجوع کرنا پڑا۔ جب دوسری مرتبہ بھی اس ضمن میں ضرورت ہوئی تب علاّمہ قاسمی صاحب اور جناب غلام ربانی آگرو صاحب کو میرے اس علمی کام کا علم ہو گیا تھا۔ اور دونوں حضرات نے نہ صرف اس میں بڑی دل چسپی لی لیکن ساتھ ہی رسالے مہران میں اس آرٹیکل کو شائع کرنے کا وعدہ بھی کر دیا۔

گزشتہ سال نومبر کے آخری ہفتے میں میرا پھر کراچی جانا ہوا۔ راشدی صاحب کا مقالہ ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ذاتی خیال تھا کہ پیر صاحب کے ایک اور ساتھی ڈاکٹر

ریاض الاسلام سے مل کر اس ضمن میں ضروری معلومات حاصل کر کے ترجمہ کا کام پورا کرلوں۔ جامعہ کراچی میں ڈاکٹر شوق کے ہمراہ ریاض الاسلام سے ملاقات بھی ہوئی (اس سے پہلے کبھی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی) لیکن خدا جانے کیوں۔ دورانِ گفتگو صرف گپ شپ پر گزارہ کیا۔ اور سندھی شعبہ میں واپس آگئے۔ ابھی مشکل سے ڈاکٹر شوق کے دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے۔ مختصر گفتگو ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر مواد بھیجنے پر میں شکریہ ادا کیا۔ اور ۲۵ رنومبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ اپنی رہائش پر ملاقات کا وعدہ لے کر وہ کسی کام سے روانہ ہو گئے۔ اس رات ڈاکٹر شوق کے ہاں قیام رہا۔ اور ناشتہ کے بعد ہم دونوں قادری صاحب کے بنگلہ واقع ناظم آباد پہنچے۔ جب میں نے ناشتہ سے منع کیا تب ڈاکٹر شوق نے کہا۔ یار یہ اُردو والے ہم جیسے مہمان نواز تو نہیں اس لئے گھر سے کھا پی کر چلیں تو بہتر رہے گا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم منزل پر پہنچے اور کال بیل بجائی کسی نے آکر نام معلوم کیا اور پھر ہمیں مہمان خانے پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہاتھ ملایا اور کھڑے کھڑے بیٹے کو ناشتہ کے متعلق ہدایت دینے لگے۔ ڈاکٹر شوق اور میں نے قدرے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بیک وقت کہا کہ ہم ناشتہ کر کے آئے ہیں۔ اس لئے آپ تکلیف نہ کریں۔ وہ ایک دم بولے، شوق صاحب آپ اور ہم تو آئے دن ملتے رہتے ہیں، لاکھو صاحب بڑی دور سے آئے ہیں ان کی خاطر تواضع میرا فرض ہے۔

چائے بسکٹ کے بعد میں نے قادری صاحب سے کہا مجھے پیر صاحب کے آرٹیکل "سندھ اور ایران کے تعلقات" پر کچھ وضاحتیں درکار ہیں۔ آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا، کیجئے بسم اللہ۔ اس کام کی تکمیل میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ وہ بتاتے رہے اور میں نوٹ کرتا رہا۔ اس طرح پیر صاحب کے ایک اہم مقالے کا سندھی ایڈیشن میری طرف سے آپ کے ہی ایک اور معتقد کے توسط سے سرانجام پایا۔ کام کے مکمل ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر چائے کا دور ہوا۔ اور میری گزارش پر اپنی لائبریری دکھانے کے لئے بنگلہ کی

بالائی منزل پر لے گئے جہاں حال ہی میں کتب شفٹ کی گئی تھیں اور ان کو سٹ کرنا باقی تھا۔ وہاں بھی ہم بیس پچیس منٹ تک علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ جب ہم اجازت لے کر واپس ہونے لگے تو قادری صاحب قدرے فکرمندی سے کہنے لگے، لاکھو صاحب پھر کراچی کب آنا ہوگا؟ میں نے کہا ہر دو تین ماہ بعد آنا ہوتا ہے۔ ”شوق صاحب، جب لاکھو صاحب اگلی مرتبہ کراچی آئیں گے تب میرے کتب خانے کی سیٹنگ ہو چکی ہوگی اور میں ان کے لئے یہیں ایک دعوت کا انتظام کروں گا“، ڈاکٹر قادری نے کہا۔

قادری صاحب کے گھر پر یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ دوران گفتگو ہم نے کئی ایک آن دی ریکارڈ اور آف دی ریکارڈ باتوں پر کھل کر تبادلہ خیال کیا۔ باتوں باتوں میں، میں نے پوچھا۔ مجھے انجمن پنجاب پڑھنے کا ابھی موقع نہیں ملا، آپ بتلائیں کیسی کتاب ہے۔ کہنے لگے اس کے متعلق میں نے کافی سنا ہے لیکن ابھی تک پڑھی نہیں۔ کئی ایک لوگوں کو محترمہ نے دو دو کاپیاں گفٹ دی ہیں معلوم نہیں کیوں مجھ پر نظر نہیں پڑی۔ ٹھیک ہے کام پڑے گا تو خود یہ خود ڈاکٹر صاحبہ کتاب دے جائیں گی۔ اخباری دنیا ملکی موضوعات اور علمی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے قادری صاحب نے مجھ سے ایک سوال کر دیا۔ یہ جنگ والوں نے جو مہران رنگ شروع کر رکھا ہے، آپ کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہے۔ میں نے جواب میں انگریزی کا یہ مقولہ دہرایا۔

SOMTHING IS BETTER THAN NOTHING

چلئے یہ بھی ٹھیک ہے۔ جواب میں قادری صاحب نے یہ تاثر دیا۔ ہاں بھلا قدوسی کی کتاب ”تاریخ سندھ“، دیکھی ہے۔ مجھ سے آپ نے دوسرا سوال کیا۔ قادری صاحب قدوسی صاحب کی کتاب بھی اردو داں طبقے کے لئے سود مند رہے گی۔ ویسے مجھے اس بزرگ کی ”صوفیائے سندھ“ قدرے بہتر نظر آئی۔ قادری صاحب کا تعلق ہندوستان کے بدایوں علاقے سے تھا بدایوں کی بات

نکل پڑی تو بڑے فخر سے کہنے لگے۔ میں بدایونی ہوں۔ اس علاقے نے ہندوستان کو ملا عبدالقادر بدایونی جیسا بے مثل مورخ دیا۔ غالباً آئندہ سال ہندوستان جانا ہوگا۔ بدایوں جانے کا پروگرام بھی ہے

میں سوچنے لگا، اس شخص کو بدایوں سے کتنا عشق و محبت ہے، دورانِ گفتگو اپنے آپ کو بدایونی بھی کہتا ہے۔ پھر ادبی طور پر تخلّص قادری کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ سوال ابھرا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ جواب دریافت کر لوں۔ افسوس صرف یہ ہے کہ موت نے قادری صاحب کو ایک بار بدایوں دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح اور کئی موضوعات پر بھی گفتگو ہوئی۔ جن کو کسی دوسری محفل ضبط تحریر میں لاؤں گا۔ ہم واپسی میں قادری صاحب کے خلوص، سچائی، مہمان نوازی اور علم دوستی کی باتیں کرتے ہوئے واپس گھر پہنچے اور اگلی صبح بوریا بستر باندھ کر گاؤں واپس ہونے لگا عین اسی وقت میرے بھتیجے ذو الفقار نے میرے سامنے جنگ اخبار لا کر رکھ دیا۔ میں اخبار کو سرسری دیکھنے لگا تو ایک دم اس ناگہانی خبر پر نظر پڑی:

"اردو کے مشہور ادیب اور محقق ڈاکٹر ایوب قادری ایک حادثے کے نتیجے میں وفات پا گئے"

خبر پڑھتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ جس وقت میں یہ خبر پڑھ رہا تھا عین اسی وقت مرحوم کا جسد خاکی سرزمینِ سندھ کے حوالے ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر قادری مرحوم بلاشبہ بڑے صاف گو حلیم اور شریف النفس انسان تھے۔ گو وہ اردو کے ایک بڑے عالم تھے۔ لیکن جن حضرات نے بھی آپ سے ملاقات کی ہوگی یا آپ کو صرف ایک بار بھی دیکھا ہوگا، وہ یقیناً میری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ وہ

اپنی ڈگری اور علمی بصیرت کی حیثیت سے کہیں کم اپنی پذیرائی کرتے تھے۔ گو آپ نے اکثر علمی کام تراجم کی صورت میں کیا لیکن ان میں جا بجا حاشیہ آرائی اور تعلیقات دیکھنے سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ قادری صاحب کو برصغیر کے مشاہیر تاریخ اور تصوف پر کتنا اچھا مطالعہ اور کیسی گہری وابستگی تھی۔ اردو زبان میں قادری صاحب کے حوالے سے یہ کتب مآثر الامرا (تین جلد) تذکرہ علمائے ہند۔ جہانیاں جہاں گشت اور طبقات اکبری (ابھی شائع نہیں ہوئی) ہمیشہ زندہ رہے گی۔ پیر حسام الدین راشدی کی وفات کے بعد مرحوم ایوب قادری صاحب کی اچانک اور دردناک موت علمی دنیا کے ساتھ میرے لئے ذاتی طور پر بھی ایک ناقابلِ تلافی نقصان اور صدمہ ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر نصیب اختر

ایک محقق تھا نہ رہا

ڈاکٹر ایوب قادری کا تعلق تحقیق و تدقیق کی دنیا سے تھا۔ اس دنیا سے جو مشکل پسندوں اور دقت طلبوں کی ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہتے تو استاد کی حیثیت سے چند گھنٹے لگے بندھے اسباق پڑھا کر باقی وقت آرام سے گزارتے مگر وہ تو ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر تحقیق میں الجھے رہتے اور تلاشِ مواد میں سرگرداں نظر آتے۔ اس شہر اور اس کے مضافات ہی پر منحصر نہیں بلکہ پاکستان کا شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں نادر و نایاب کتب و مخطوطات ہوں اور قادری صاحب سفر کی ہزار صعوبتیں سہہ کر وہاں نہ پہنچے ہوں۔ نوادراتِ علمی کی تلاش میں شہر شہر پھرے، حتیٰ کہ انھوں نے دشت و صحرا بھی نہ چھوڑے۔ جس زمانے میں وہ ادارۂ تحقیق و تصنیف کے لئے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ پر کتاب لکھ رہے تھے، تلاشِ مواد میں کراچی سے اندرونِ سندھ، ملتان اور اوچ تک پہنچے۔ چلتے وقت انھیں یہ معلوم تھا کہ سندھ کے بعض علمی خانوادوں، میروں، پیروں اور زمینداروں کے پاس کیسے کیسے گراں مایہ علمی خزینے موجود ہیں اور ان تک پہنچنا ضروری ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے انھیں دشت و صحرا کی جس طرح خاک چھاننا پڑی اس سے ان کے قریبی احباب واقف ہیں اور منزل تک بمشکل پہنچ کر جو محرومیٔ منزل رہی وہ بھی ایک بہت بڑی ستم ظریفی تھی۔ ان میں سے بعض صاحبانِ نوادراتِ علمی نے انھیں تقدس مآب تبرکات کے طور پر محفوظ رکھا تھا۔ اس لئے اُن کی زیارت تو کسی نہ کسی طرح ممکن تھی لیکن پڑھنے یا اُن سے

اخذ و اقتباس کی اجازت نہیں تھی۔ جو شخص اتنی دور ان کتب قدیم سے اہم معلومات حاصل کرنے گیا ہو اسے محض دور ہی سے ایک نظر زیارت بھلا کیا فیض پہنچا سکتی تھی۔ بہر طور چند اہم کتب و مخطوطات کے متعلق صرف اتنی اجازت مل سکی کہ وہ انھیں پڑھ تو سکتے ہیں لیکن اس سے کچھ نقل نہیں کر سکتے۔ اس سے بات تو نہیں بنتی تھی لیکن یہ شرط تسلیم کئے ہی بنی۔ انھیں جلد جلد جستہ جستہ پڑھا۔ اور چونکہ قادری صاحب کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ کتاب کے ورق تیزی سے الٹ پلٹ کر اپنے مطلب کا مواد جلد تلاش کر لیتے تھے اس لئے ان کا یہ وصف کام آیا اور انھوں نے ضروری مواد تلاش بھی کر لیا لیکن مسئلہ نقل کرنے کا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ جو کچھ ذہن میں محفوظ رکھ سکے اسے ہی علیحدگی میں کاغذ پر منتقل کیا اور اس طرح وہ تھوڑی بہت معلومات حاصل کر سکے۔ یہ تمام روداد انھوں نے واپس آکر ادارہ تحقیق و تصنیف کی ایک ماہانہ نشست میں سنائی تھی جس میں راقم الحروف بھی بہ حیثیت رکن موجود تھا۔ اسی طرح وہ کراچی کے مضافات میں دور دراز مقامات پر واقع دینی مدارس کے کتب خانوں میں بھی جاتے تھے جہاں راقم کو بھی ایک دو مرتبہ ان کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ ان مدارس تک پہنچنے کے لئے بس کا طویل سفر طے کرنا پڑتا تھا اور پھر کافی دور ایسے کچے راستوں پر پیدل چلنا پڑتا تھا جہاں خاک ہی خاک اڑتی تھی۔ نتیجتاً ان مدارس تک پہنچتے پہنچتے تمام کپڑے خاک دھول میں اٹ جاتے تھے مگر ان کی طبیعت پر ذرا بھی میل نہ آتا تھا۔ انھیں اپنی دھن میں ان باتوں کی پرواہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تحقیق و تدقیق کی راہ میں درپیش ہر تکلیف و پریشانی کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے اور جبیں پر ذرا بھی شکن نہ آتی تھی۔ بلا شبہ ان کے اس وصف نے انھیں بہ حیثیت محقق ایک ممتاز مقام عطا کیا۔

تحقیق کے میدان میں انھوں نے بہت سے نمایاں کام انجام دئے حالانکہ وہ نہ تو کسی ایسے تحقیقی ادارے کے سربراہ یا سکریٹری تھے جن کے پاس افراد و اختیارات و وسائل ہوتے

ہیں جن سے تحقیقی کام میں بہت سی سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں، نہ وہ اتنے دولت مند تھے کہ دولت کا سہارا لے کر اپنا کام دوسروں سے کرا لیتے اور نہ وہ کوئی اعلیٰ سرکاری افسر تھے جو سرکاری حیثیت اور اثر و رسوخ استعمال کرتے۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں تھے۔ تنہا تنہا سے انتہائی سادہ و معمولی سے فرد لگتے تھے۔ لیکن بہت کچھ تھے اور ان کے لئے وہ سب کچھ ممکن تھا جو کسی اعلیٰ منصب و حیثیت، دولت یا کسی ادارے اور وسائل سے متوقع ہو سکتا ہے۔ یکہ و تنہا نظر آنے کے باوجود وہ ادارہ و انجمن تھے۔ ان کے مداحوں، معتقدوں، دوستوں اور احباب کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو وقت ضرورت ان کے تحقیقی کام میں ان کی معاون ہوتی تھی۔ اور انھیں آسانیاں بہم پہنچانے میں ذرا بھی کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتی تھی بلکہ بعض تو "سپردم بہ تو مایۂ خویش را"، کہہ کر اپنا علمی سرمایہ ان کے حوالے کر دیتی تھی۔ دولت مند نہ ہونے کے باوجود ان کے پاس نادر و نایاب کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جو بہت سے تحقیقی اداروں کے ذخیرہ ہائے کتب سے کم یا کمتر نہیں تھا۔ پھر ایک اعلیٰ پایہ کے محقق و مصنّف ہونے کی حیثیت سے کتنی ہی کتابیں ہدیتاً و تحفتاً ان کے پاس آتی رہتی تھیں اور کتنی ہی ان کے تحریر کردہ مقدموں اور تبصروں کے عوض انھیں ملتی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ جو کتاب وہ چاہتے انھیں دستیاب ہو جاتی اور اگر کوئی کتاب ان تمام صورتوں میں سے کسی صورت ان تک نہ پہنچتی تو وہ خود اس تک پہنچ جاتے۔ وہ دولت و حیثیت سے کام لینے کے بجائے اپنی محنت و صلاحیت پر بھروسہ کرتے تھے۔ وہ سخت محنت کے عادی تھے اور اپنے اوقات کار کے سختی سے پابند تھے۔ ان کے روزانہ کے معمولات ایک نظامِ اوقات کے تحت انجام پاتے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کے لئے بھی اوقات مقرر کر رکھے تھے اور وہ بھی بہت مختصر سے۔ ان کا باقی تمام وقت تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی تفریح، کوئی شوق اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی پکنک یا سیر و سیاحت کے لئے جاتے بھی تو کتابیں ان کے ساتھ ہوتیں۔ بلکہ بعض اہم علمی

کام انھوں نے سیاحت ہی کے دوران انجام دئے۔ ماثر الامراء کی تین ضخیم جلدوں کے ترجمے کا بیشتر کام انھوں نے سیاحت کے دوران کراچی سے باہر تفریحی مقامات ہی پر انجام دیا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بڑی محنت و جانفشانی سے لکھا اور سے بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ ناشرین ان کی تحریریں پر اصرار حاصل کرتے اور اہل علم انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ کسی مقالے یا کتاب پر ان کا نام اس کے اعلیٰ اور معیاری ہونے کی ضمانت ہوتا تھا۔ یہ اعتبار کم ہی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

قادری صاحب جس طرح خود تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے اسی طرح دوسروں کو بھی اس میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خود موضوعات دے دے کر اور کہہ کہہ کر لکھواتے تھے۔ کبھی کبھی تحقیق کے موضوع پر بات چل نکلتی تو کہا کرتے کہ علم کے بحر ذخار و ناپید اکنار میں کتنے ہی جزیرے دریافت طلب اور کتنے ہی نکتے تحقیق طلب ہیں۔ اور کتنے ہی موتی بند سیپیوں سے باہر منصۂ شہود پر آنے کے متقاضی ہیں۔ میں لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہوں اور کسی نہ کسی رسالے کے خصوصی نمبر کے بہانے ان سے لکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی کوششوں سے لکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا تھا، جو ان کی خاطر سے، لحاظ سے اور بار بار کے تقاضوں سے لکھا کرتا تھا اور نہایت دیدہ ریزی، دماغ سوزی اور جگر کاوی سے لکھتا تھا۔ ان ہی کے تقاضوں سے تحریر کئے جانے والے مقالات سے کتنے ہی رسالوں کے یادگار خصوصی نمبر ترتیب پائے۔ اگرچہ ان میں سے کئی پر بہ حیثیت مرتب دوسروں کے نام بھی ہیں لیکن وہ دراصل ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان مرتبین نے اپنے ابتدائیوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح متعدد کتابیں ان ہی کے تقاضوں اور اکثر اوقات کسی نہ کسی صورت میں ان کے تعاون سے تصنیف و تالیف کے مشکل مراحل سے گزریں۔ جس کا ذکر ان کے مصنفین و مولفین نے اپنے دیباچوں میں کیا ہے۔

ان کے پڑھنے لکھنے کا انداز اگرچہ خالصاً مشرقی تھا لیکن تحقیق و تدقیق میں وہ مغرب کے جدید اصول اور طریقہ ہائے استدلال کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ حاشیہ میں پورے پورے حوالے دیتے اور ان کی صحت کا خیال رکھتے۔ اس سلسلہ میں نہایت دقت نظری اور دیانت داری کا ثبوت دیتے تھے۔ لیکن جہاں تک ان کے اٹھنے بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے کے انداز کا تعلق ہے وہ مشرق کا خالص روایتی انداز تھا۔ وہ ایک بوریہ نشیں تھے اور زمین پر فرش بچھا کر ایسی قلندرانہ شان سے بیٹھتے تھے جیسے سب ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے ان کے ارد گرد کتابوں کے انبار ہوتے اور فرش پر چاروں طرف اتنی کتابیں پھیلی ہوتیں کہ ان سے ملنے کے لئے آنے والوں کو اکثر اوقات کتابیں ہٹا کر اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنانا پڑتی تھی یا وہ خود کتابیں سمیٹ کر انھیں بٹھاتے تھے۔ دراصل مغربی طرز کی میز اور کرسیاں ان کے کام کے انداز اور مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ بیٹھ کر، لیٹ کر، پاؤں پسار کر اور سکڑ کر آڑے ترچھے اور الٹے سیدھے ہر پہلو اور ہر انداز میں کتب بینی جاری رکھتے تھے۔ فرش پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا یہ مشرقی انداز ان ہی کا نہیں تھا بلکہ مغربی ممالک کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل بعض مشہور پروفیسر صاحبان کو ان گنہگار آنکھوں نے پردۂ شب میں اسی انداز میں دیکھا ہے۔ ان کے مطالعے کے کمرے اگرچہ پڑھنے لکھنے کے مغربی طرز کے اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ ہوتے تھے لیکن وہ رات کے اوقات میں میز کرسیوں اور الماریوں سے باقی ماندہ تھوڑی سی جگہ میں دری یا گدا بچھائے مصروفِ مطالعہ نظر آتے تھے۔ یہ محترم حضرات محض تصنع کی خاطر کتنی تکلیف اٹھاتے تھے لیکن قادری صاحب تکلیف برطرف اپنی سادگی و سہولت کو مدنظر رکھتے اور نہایت آرام دہ اور ایک مخصوص وضع و انداز میں کام کرتے تھے۔

قادری صاحب کی سب سے بڑی کمزوری کتاب تھی۔ کتاب دیکھتے ہی بے تاب ہو جاتے تھے۔ کسی کے گھر جاتے اور کتابیں نظر آجاتیں تو تمام باتیں بھول جاتے۔

ایک ایک کر کے ساری کتابیں دیکھنا شروع کر دیتے۔ اس دوران اگر کوئی ہزار باتیں بھی کرتا تو وہ ہوں ہاں کرتے رہتے اور اپنا شغل جاری رکھتے جب تمام کتابیں دیکھ لیتے تو بات کرتے۔ اس عرصہ میں میزبان کی جو کیفیت ہوتی تھی وہ بخوبی سمجھی جا سکتی ہے لیکن جوں ہی وہ اپنے اس محبوب مشغلے سے فارغ ہوتے اور عالمانہ انداز میں سلسلۂ گفتگو شروع کرتے تو میزبان کی تمام کبیدہ خاطری دور ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کتابوں پر جان دیتے تھے بلکہ ان کی جان ہی کتابوں میں تھی جنھیں وہ حرزِ جاں بنائے رکھتے تھے۔ ان کی ہر ممکن طریقے سے حفاظت کرتے تھے۔ ان کی جلدیں بندھواتے۔ انھیں بار بار دھوپ دکھاتے اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ سلیقے سے لگاتے۔ اس کام میں ان کے کئی کئی دن لگ جاتے تھے اسی طرح اخبار و رسائل کا ایک ایک ورق سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے۔ کسی کو کوئی کتاب یا رسالہ بڑی مشکل سے دیتے تھے۔ چند خاص احباب اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن پھر بھی کتاب کی عارضی جدائی انھیں برداشت نہ ہوتی تھی۔ اور وہ اس وقت تک ماہیٔ بے آب رہتے جب تک کتاب واپس نہ آجاتی۔ بیس بائیس سالہ طویل تعلقات کے دوران کبھی ان کی زبان سے یہ شکایت نہیں سنی کہ فلاں شخص نے ان کی فلاں کتاب واپس نہیں دی، حالانکہ یہ شکایت تقریباً ہر اس شخص سے سنی جسے کتابیں رکھنے کا شوق رہا ہے۔ شاید انھیں دوسروں کے مقابلے میں کتابوں سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ کتاب دیکھ وہ بھول سکتے نہیں تھے۔ اور واپس لئے بغیر چھوڑتے نہیں تھے۔ اس معاملہ میں وہ بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے احباب ان کے مزاج کی برہمی سے پہلے ہی کتاب واپس کر دیتے تھے۔

کتاب سے ان کا رشتہ بڑا گہرا اور پرانا تھا۔ یہ تعلق اس عمر سے تھا جب ان کی اہمیت و افادیت کا انھیں پورا پورا شعور و ادراک بھی نہیں تھا۔ لیکن جوں جوں شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی، یہ رشتہ و تعلق مضبوط و قوی اور ذہنی و قلبی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ

کتاب ہی ان کی زندگی بن گئی۔ کتابوں سے ان کا رشتہ ان ادوار میں بھی نہ ٹوٹا جب بڑے مضبوط رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ ماہ وسال پر مشتمل زندگی کے طویل ادوار میں کتابیں جس طرح ان کے ساتھ رہیں اس کا اندازہ ان کے معمولات شب وروز سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ سوتے تو کتابیں ان کے سرہانے یا دائیں بائیں ہوتیں، بیٹھتے تو کتابیں ان کے ارد گرد بکھری ہوتیں۔ چلتے تو کتابیں ان کی بغل میں ہوتیں۔ جہاں جاتے کتابیں ان کے ساتھ ہوتیں۔ جو گفتگو کرتے وہ کسی نہ کسی کتاب ہی کی ہوتی اور جو کام کرتے وہ کسی نہ کسی کتاب ہی کا ہوتا۔ غرض کہ کتابیں ہر وقت اور ہر جگہ ان کے دم کے ساتھ رہتیں۔ اس وقت بھی جب ان کا دمِ واپسیں تھا تو جائے حادثہ پہ ان کی زندگی بھر کی رفیق یہ کتابیں ہی ان کے پاس تھیں۔ ان کے چند قطرات خون ان کتابوں پر گر کر کچھ اس طرح جذب ہو گئے تھے جیسے انھیں ابدی سکون کے لئے ایک ہمدرد دیرینہ کی آغوشِ محبت مل گئی ہو۔ جاتے جاتے بھی وہ ان کتابوں پر اپنے خون کا ایک ایسا نشان چھوڑ گئے جو کتابوں سے ان کی دائمی محویت و رفاقت کی یاد دلاتا رہے گا۔

کتابوں کی اس والہانہ محبت ہی نے انھیں شوقِ مطالعہ کتب عطا کیا اور وسیع مطالعہ کتب نے انھیں محقق، مصنّف، مؤلف، مرتّب اور مترجم بنا دیا۔ ان تمام حیثیتوں میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن جس حیثیت میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں وہ ایک محقق کی ہے۔ اس حیثیت میں کام کرنا کسی سنگلاخ زمین سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اور ایسے حالات و ماحول میں جہاں قدم قدم پہ سنگِ گراں ہوں نہایت ہی سخت تھا۔ مگر وہ ان سختیوں کو جی جان سے جھیلتے رہے۔ مشکلات سے اس طرح کھیلتے رہے جیسے یہ ان کا محبوب کھیل ومشغلہ ہو۔ ایسے لوگ مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

لیکن یہ فلک کج رفتار جس انسان کے لئے برسوں مارا مارا پھرا اسے ہی تا دیر نہ دیکھ سکا۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اسی پردۂ خاکی میں پنہاں ہو گیا۔ قادری صاحب جیسے انسان کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ ان کے تہہِ خاک ابدی نیند سو جانے کے بعد غالبؔ کی بیان کردہ اس حقیقت کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

وفاتِ مردِ عاقل ڈاکٹر محمد ایوب قادری

۱۹۸۳ء

انسان دوست، مخلص و دانا و خوش خصال
حلقہ بگوش جن کے تھے اچھے برے سبھی
رحلت کا ان کی سنتے ہی خاور نے یہ کہا
ہیں "ایک شکوہ حادثہ ایوب قادری"

۱۴۰۴ھ

خورشید خاور

ڈاکٹر فضل رب صدیقی

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم

تاریخ اردو ادب اُن مشاہیر علم و ادب سے پُر ہے جنہوں نے اردو زبان کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ۱۸۰۷ء سے قبل و بعد علماء کرام نے جو خدمات اردو زبان اور اردو ادب کے لئے انجام دیں وہ تاریخ علم و ادب کا جز لاینفک بن چکی ہیں اور اردو ادب کی تاریخ کا خاصہ احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد اردو زبان اور اردو ادب میں خاصہ تغیر و تبدل ہوا اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو ادب یہاں پر انقلابی دور سے نبرد آزما ہوا۔ نیا اسلوبِ نگارش جدید طرز نگارش اور خیالاتِ جدید ادب کی آمیزش نے اسے اور بھی نکھار دیا۔ ایسے دور میں جبکہ اردو زبان کا احیاء اور جدید خطوط پر زور دیا جا رہا تھا اور اس میں نت نئے خیالات کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے اور اسے خرد برد سے بچانے کے لئے پاکستان کے دانشوروں نے جو قابلِ قدر خدمات انجام دیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔ ان لوگوں

نے اردو ادب کے لئے سینہ سپر ہو کر اس کی ترقی و ترویج کے لئے دن رات محنت کی اور عام ذہنوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ اردو زبان دنیا کی ہر زبان کے مقابل کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس میں وہ ساری خوبیاں ہیں جن کو اگر صحیح معنوں میں بروئے کار لایا جائے تو دنیا کی عظیم زبانوں میں سے ایک زبان یہ بھی ہو سکتی ہے۔

انہی علمائے علم و ادب میں سے ایک شخصیت ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی تھی جنہوں نے اردو و ادب میں نمایاں مقام پیدا کیا اور اردو ادب کے سلسلے میں انتہائی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ گورنمنٹ اُردو آرٹس کالج کراچی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور ساتھ ہی اردو زبان کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اسی درس و تدریس کے دوران آپ نے پی۔ایچ۔ڈی کی تیاریاں شروع کر دیں اس سلسلے میں آپ نے مقالہ کا موضوع بھی وہی منتخب کیا جو وقت کا تقاضا تھا کہ ۱۸۰۰ء سے اردو زبان میں جو مدو جزر آئے اور جن بزرگوں نے اردو ادب و زبان سے خود کو وابستہ کر رکھا تھا آپ کی دور بین نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ آپ نے اسی مناسبت سے علماء کرام کی اردو زبان کی خدمات کا بغور جائزہ لیا۔ اس سے خاصے متاثر ہوئے چنانچہ آپ نے اسی موضوع کو پی۔ایچ۔ڈی کے لئے منتخب کیا اور اپنا یا تھا کہ "اردو نثر کے ارتقاء میں علمائے کرام کا حصہ" کے عنوان سے شروع کیا اور ایک ضخیم جامع اور مکمل مقالہ تحریر کیا۔ جس پر آپ کو کراچی یونیورسٹی کی جانب سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ دوران درس و تدریس یہ عظیم کامیابی آپ کے

حصے میں آئی اس کامیابی کے بعد آپ کراچی یونیورسٹی میں بھی شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے اور بطور مددگار پروفیسر خدمات انجام دینے لگے۔ آپ کو درس و تدریس سے عشق تھا۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ملک کا بچہ بچہ اردو زبان سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو جائے بلکہ اس پر عبور حاصل کرے۔ علم سے یہ لگاؤ ان کی رگ و پے میں سما گیا تھا بحیثیت استاد وہ ہر طالب علم سے یکساں مشفقانہ رویہ رکھتے تھے اور اُن کے علمی مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمہ وقت کمربستہ رہتے تھے۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اردو ادب کی ترقی کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے تھے۔ ایک ریسرچ اسکالر کی طرح آپ دن رات مصروف رہتے تھے چنانچہ ان کے تحقیقی مضامین مقالات بیشتر اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں جو عوام الناس کے لئے عموماً اور ادیبوں اور محققوں کے لئے خصوصاً توجہ کا باعث بنتے رہے۔ ان کے بیشتر مقالے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اگر ان کو جمع کر کے کتابی شکل میں لایا جائے تو اردو ادب کے لئے انمول ثابت ہوں گے۔

درحقیقت اردو زبان ایسے ہی لوگوں کی رہین منت ہے جن کو جنون کی حد تک اس زبان سے عشق ہے اور جنہوں نے اسے اپنی زندگی کا اہم ترین مشن بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک کتاب کو ساتھ رکھا اور مطالعہ کو جاری رکھا زندگی کا ہر ہر لمحہ اس کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

سادگی و انکساری آپ کا خاصہ رہا ہے۔ گفتگو جامع اور دلکش انداز میں کرتے تھے۔ شخصیت اتنی متاثر کن تھی کہ ہر شخص ایک مرتبہ ملنے

کے بعد ہی ان کا ہمنوا ہو جاتا تھا۔ ہر شخص سے بے لوثی اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا حلقۂ احباب ہر شعبۂ زندگی پر محیط ہے۔ آپ کی شخصیت اتنی بھاری بھرکم ہے اور اس کے اتنے پہلو ہیں کہ اس قدر مختصر مضمون میں اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ تاریخ اردو ادب کے ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا تھے۔ اپنی مختصر زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ان ہی کا حصہ ہیں۔ اگر زندگی وفا کرتی تو اردو ادب میں مزید گراں قدر اضافہ کرتے۔ ان کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر یہ مطالبہ کروں کہ ان کی کوئی یادگار قائم کی جائے تو بے جا نہ ہوگا اس کے لئے کراچی یونیورسٹی اور گورنمنٹ اردو کالج کے ذی علم اشخاص کی توجہ اس سمت مبذول کرانا چاہوں گا۔

جناب نصیر دہلوی

شکستہ دل کی آواز

نقش فرقت میں محبت کے ابھر جاتے ہیں،
ہجر کے تیر دل زار کو برماتے ہیں
ہم جدائی میں ہوئے جاتے ہیں زندہ درگور
مرنے والے کبھی ہم بھی تجھے یاد آتے ہیں

*

آہ! میرے دوست، میرے بھائی قادری۔ تم کس قدر اچانک اس منزل پر پہونچ گئے جہاں گو کسی نہ کسی دن ہر ایک کو پہنچنا ہے مگر کب کس کو پہنچنا ہے نہ کسی کو علم ہے نہ پہنچنے کی قدرت۔ یہ تو صرف خلاق عالم کی مشیت اور اُس کے حکم پر موقوف ہے۔ ہائے انسان کس قدر مجبور و بیکس ہے۔
نہ یہاں آنے پہ قادر نہ وہاں جانے پر ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے،
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس بے بسی اور لاچاری کے باوجود ہمیں اپنی اس قدر

بے ثبات زندگی پر کس قدر بھروسہ ہے کتنا اطمینان ہے حالانکہ عالم یہ ہے کہ ؎

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سَو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں

کاش کبھی ہم غور کریں کہ ہماری زندگی کی اساس ہی کیا ہے ؎

جھونکا ہوا کا آیا چمن میں گزر گیا،
یہ زندگی ہے جس کے یہ سامان دیکھنا

کل کی بات معلوم ہوتی ہے جب تم کس قدر خلوص اور محبت سے کہہ رہے تھے۔ "نصیر بھائی گو سانحات نے تمہیں بے موت مار ڈالا۔ تم بالکل گوشہ نشین اور گمنام ہو کر رہ گئے۔ مگر میں تمہیں یوں نہیں مرنے دوں گا۔ ادبی و شعری دنیا میں امر کر کے رہوں گا۔" مگر یہ کیا ہو گیا کہ مجھے امر کرنے کا عزم لئے خود ہی مر گئے۔ مجھ پر گزرے ہوئے سانحات میں ایک اور شدید سانحہ کا اضافہ کر گئے۔ خود مجھے تو اپنی فکر ہے نہ اپنا غم۔ عرصے سے میں تو اس عالم میں ہوں ؎

اب خود نصیر درد ہے احساسِ درد کیا،
کوسوں ہے اب وہ منزلِ آہ و فغاں سے دُور

لیکن دنیائے ادب و تحقیق کو ابھی تمہاری ضرورت تھی مگر ؎

جانے کیا راز ہے قدرت کا خدا ہی جانے
جن کی ہوتی ہے ضرورت وہی مر جاتے ہیں

کس قدر لگن بلکہ جنون کی حد تک عشق تھا تمہیں اس ادبی دنیا سے اس میں تم اس قدر منہمک اور غرق تھے کہ اپنے باغ و بہار بچوں

تک سے بے نیاز رہے تمہیں جس نے بھی جہاں دیکھا یہی دیکھا کہ یا مطالعے میں غرق ہو یا کچھ لکھ رہے ہو۔ حد تو یہ ہے کہ راہ چلتے بھی کتاب نظر کے سامنے ہے۔ اسی عالم میں اپنی جان بھی قربان کردی۔ کم از کم اس کا میں عینی شاہد ہوں کہ میں جب بھی صبح، دوپہر یا شام جس وقت بھی تم سے ملنے گیا کبھی ایک مرتبہ بھی آرام کرتے نہ پایا۔ علم سے ایسی بے پناہ لگن زندگی میں کسی اور کی نہیں دیکھی میرے نزدیک تم منفرد تھے۔

کتنی تلاش اور کس قدر جستجو اور کاوش سے تم نے کیسی کیسی نادر و نایاب کتب کس شوق سے جمع کیں۔ اپنی بساط سے کہیں زائد مصارف نہ معلوم کس کس طرح اور کہاں کہاں سے کئے اور آخر دم تک ایک ایک ورق کو یوں کلیجے سے لگائے رکھا کہ گویا وہ سب تمہارے لختِ جگر تھے۔

تمہارے اہل و عیال احباب و اعزا کو تمہاری ہمیشہ ہمیشہ کی اچانک جدائی جس قدر شاق گزر رہی ہے اُس غم جانکاہ میں تو میں برابر کا شریک ہوں ہی لیکن تمہارے گراں قدر کتب خانہ کی ویرانی دیکھی نہیں جاتی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کتب حسرت سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں اور زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہوں ہمیں کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ جب بھی یہ خیال آتا ہے تصور سے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔

ہائے قادری بھائی! میں تمہاری کس کس بات کو یاد کروں۔ علم دوستی کو یا ادبی شغف کو۔ تحقیق و تنقید میں اس درجہ جانکاہی

کو یا بے بنیاد معلوماتی بصیرت کو۔ کاش تم اتنی خوبیوں کے حامل ہونے کے بجائے ایک عام انسان ہوتے تو کچھ عرصے بعد تمہاری وفات حسرت آیات کو بھلا دیا جاتا مگر تم جیسی ہستی کا یوں اچانک اٹھنا تو بھلائے نہیں بھلایا جاسکتا۔ مجھے تو ؎

تمہیں یاد کرنا مری بے بسی ہے
بھلایا تو بے حد مگر یاد آئے

اور نہ معلوم کب تک یوں ہی یاد آتے رہوگے۔ لوگ کہتے ہیں قیامت میں ملیں گے۔ ایک تو قیامت کا انتظار ہی اپنی جگہ ہے پھر اس پر میرے دل کی یہ آواز دوسری قیامت ہے ؎

وہ عالم نفسا نفسی کا وہ ہنگامہ قیامت کا
یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ملے گا کون محشر میں

سان گمان تک نہ تھا کہ تمہاری آخری تصنیف "کاروانِ رفتہ" خود تمہارے اُس کارواں کے ہمراہ روانہ ہوجانے کی پیش خیمہ بن جائے گی۔

واصل عثمانی

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم

علم و ادب ان کی زندگی تھی

بدایوں ہمیشہ سے علم وفضل ادب و دانشا کا مرکز و منبع رہا ہے۔ اس سرزمین سے ادبا، شعراء، ناقدین اور مورخین فن کار وقلم کار اتنی کثیر تعداد میں اٹھے کہ ان کا صحیح شمار اور تخمینہ لگانا مناسب و ممکن نہیں۔ عبد القادر ملوک شاہ بدایونی۔ فانی بدایونی۔ شکیل بدایونی۔ آل احمد سرور۔ محشر۔ ادا جعفری اور دلاور فگار تک کا سلسلہ بڑا طویل اور قابل یادگار ہے۔ ہر عہد میں اس کے علمی و ادبی ماحول میں ارتقاء کی روشن کرنیں دکھائی دیں گی بدایوں کی ادبی خدمات پر مختلف ارباب قلم نے ورق کے ورق سیاہ کئے ہیں مگر پھر بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکے۔ ابھی مزید ضرورت ہے کہ وہاں کے اہل علم وفن کے ساتھ ساتھ وہاں کی مقتدر و مفتخر شخصیات کے کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا جائے کیونکہ یہ ہماری علمی و ادبی معاشرتی و تہذیبی روایات کا ایک اہم حصہ ہے اسی مردم خیز خطہ سے پروفیسر ڈاکٹر ایوب قادری

نے اپنی ابتدائی تعلیم کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ خود چلتے پھرتے ادارہ یا اکیڈمی بلکہ انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے ان کے پاس چند لمحات گزار لینے سے علوم و معارف کے وہ خزینے حاصل ہوتے تھے جو برس ہا برس کی محنتِ شاقہ اور تحقیق و تدقیق کے بعد بھی دستیاب ہونے محال ہوتے ہیں۔ ایوب قادری کو علوم و فنون کا یہ ذخیرہ کہیں سر راہے پڑا ہوا نہیں ملا بلکہ انہوں نے اپنی راتوں کی نیندیں تج کر کے اور خونِ جگر جلا کر علم و ادب کے یہ خزانے حاصل کئے تھے ان کی اسی قابلیت اور بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے تشنگانِ علوم و معارف انہیں نگاہِ رشک سے دیکھتے اور ان کے کارناموں پر عش عش کرتے ہیں وہ اپنی عادت کے مطابق چراغ سے چراغ روشن کرنے کے اصول پر قائم رہے اکابر کے علاوہ وہ اصاغر سے بھی اخذِ علوم کرنا ان کا شیوہ تھا وہ علم و ادب کے جویا اور فنِ تحقیق کے کوہکن تھے۔ وہ ادب کی جوئے شیر نہ بہا سکے مگر اپنی کوشش اور سعیٔ عمل سے کبھی گریز نہ کیا۔

ان کی طبیعت کو جستجو اور تحقیق سے خاص مناسبت تھی ان کا دائرۂ تحقیق خصوصی طور پر رجال تک تھا مگر ان کا مطالعہ بہت وسیع ان کی نگاہ بڑی عمیق اور ان کا اندازِ فکر منفرد تھا۔ وہ ادبی فن پاروں کو تحقیق کی نگاہ سے پرکھتے اور کھرے و کھوٹے کو تنقید کی کسوٹی پر کستے تھے۔ وہ تنقید سے زیادہ تحقیق کے مردِ میدان تھے۔ میں نے ہمیشہ انہیں کسی نہ کسی تحقیق میں غلطاں و پیچاں دیکھا ہے۔ خالی اوقات میں بھی میں نے ان کو کبھی بیکار بیٹھے نہیں دیکھا۔ وہ کچھ نہ کچھ تحقیقی کام کرتے ہی رہتے تھے۔ کبھی دوسروں کو اپنے مفید و موزوں مشوروں سے نوازتے

کبھی اپنے کسی خیال پر دوسرے ارباب قلم کو دعوتِ فکر دیتے اور اردو رسالہ کے کسی خصوصی شمارے کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ایوب قادری اس میں ضرور جلوہ افروز نظر آئیں گے۔ ان کے مضامین بڑے پر وقیع اور معلومات افزا ہوتے تھے۔ ان کے مضامین قاری کو قلم پکڑنے کی دعوت دیتے اور خشک موضوعات کو بھی اپنی شستہ و شگفتہ تحریر کے ذریعہ گل گلزار بنا دیتے محققین ان کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے اور ان کے دلائل کو موثر گردانتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب قادری نے بدایوں کی علمی شخصیات پر سلسلہ وار مضامین لکھے ہیں انہوں نے بہت سے ایسے جوہرِ قابل تلاش کر نکالے ہیں جن کے علمی کارناموں کو وقت کی گرد نے دھندلا دیا تھا۔ ان کے ادبی ذوق نے اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی ادب کے مطالعہ کے لئے مجبور کیا۔ ہندی شاعری پر ان کا مقالہ" ویر گاتھا کال" ان کی ژرف نگاہی اور ذوقِ تحقیق کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے فکر و خیال کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ مضامین بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھتے تھے جس میں تحقیق و تنقید کا حق ادا کرتے تھے۔ ان کی تحریر میں بڑی پختگی اور شائستگی پائی جاتی تھی جس موضوع پر قلم اٹھاتے علوم و معارف کے دریا بہاتے وہ اپنی تحریریں ایسے ایسے نازک نکتے پیدا کرتے کہ قاری کو تعجب ہوتا کہ قادری صاحب نے صرف ایک نکتے سے کیا کیا نتائج اخذ کئے ہیں پرزے پرزے جمع کر کے گریبان بنانے کا ہنر سنگریزوں سے محل تعمیر کرنے کا فن ڈاکٹر قادری کا اہم کارنامہ ہے۔ وقت کے گرد و غبار سے اٹی ہوئی روایات کو اپنے قلم کی جنبش سے صاف کرنا ایوب قادری کا وہ اعجاز ہے جو ہر کس و

IDARE-ADBIYAT-E-URDU
ACC. No ۲۸,۷۳۲ / ۹-أ
۱۵۸

ناکس کو نصیب نہیں۔ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا عنوان بھی ۱۸۵۷
کے بعد کے علماء سے متعلق ہے جس میں برصغیر میں علماء کی جماعت کے
شاندار کارناموں کے ذکر کے علاوہ ایسی اور بہت سی معلومات فراہم کردی
گئی ہیں جو اس سے پیشتر اتنی تفصیل و وضاحت سے اور اتنے مربوط طریقہ
سے کسی نے پیش نہیں کیں۔ وہ اپنی تحریر کو حوالہ جات سے مزین و مستند
کرتے تھے بغیر حوالے کے وہ لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔ حوالہ اخذ کرتے میں
بھی وہ احتیاط کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اگر کوئی حوالہ اُن کے
معیار پر پورا نہ اترتا تو وہ اسے ترک کردیتے تھے۔ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے
تو بڑا تفصیلی مدلل اور موثر اندازِ بیان اختیار کرتے۔ جب وہ اپنا مقالہ
تصنیف کر چکتے تو دوسرے اصحاب کے لئے اس موضوع میں کچھ بھی نہ
چھوڑتے نو واردانِ ادب جب اس موضوع پر لکھنا چاہتے تو ان کی مثال
اس مہمان کی سی ہو کر رہ جاتی جو دعوت ختم ہونے کے بعد اس وقت پہنچتا
ہے جب کہ برتن سمیٹے جا رہے ہوں اور دسترخوان لپیٹا جا رہا ہو۔

مواد کی تلاش میں وہ ڈگر ڈگر گھومے ہیں۔ کتب خانوں کا سراغ لگایا ہے
کرم خوردہ کتابوں کو کھنگالا ہے۔ مخطوطات کا جائزہ لیا ہے۔ بیرونِ ملک
سے بھی عکسی تصاویر منگوائی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بیش قیمت گھڑیاں
کتب خانوں کی چار دیواریوں میں ماخذ کے حصول اور مواد کی تلاش میں
گزاری ہیں۔ ذاتی خصوصی کتب خانوں سے لے کر عوامی کتب خانوں تک
انہوں نے میلوں کا سفر طے کیا ہے۔ میں نے انہیں بارہا انجمن ترقی اردو، ترقی
اردو بورڈ، غالب لائبریری، کراچی یونیورسٹی لائبریری۔ لیاقت میموریل لائبریری
میں سر جھکائے ہوئے کچھ نوٹ کرتے ہوئے پایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ علم و ہنر

کی اس پُر خلوص کوشش نے ہی ڈاکٹر ایوب قادری کو علماء کے کارناموں کے تحقیقی مطالعہ کی طرف مائل کیا انہی ارباب علم وفضل کا فیض تھا کہ ایوب قادری نے اپنی عمر عزیز سیر وتفریح لہو ولعب میں نہیں گنوائی بلکہ نوٹ بک ہاتھ میں دبائے اور بار کر قلم جیب میں رکھے ہوئے ہر اس مرکز کی طرف لپکے جہاں سے پرکالۂ علم و آگہی اپنی جھلک دکھاتی اس سلسلہ میں ایک بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ ایک بار ۷ رجنوری ۱۹۸۳ء بروز شنبہ ماڈرن ہلیس ناظم آباد کی ایک تقریب میں میری ملاقات قادری صاحب سے ہوئی ہے میں نے بتایا کہ علاؤ الدین خلجی کے عہد کے خواجہ کرک ابدال کے ملفوظات کا قلمی نسخہ اور تاریخ ظہور قطبی (قلمی) میں نے جامعہ کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ کرادی ہے دوسرے دن ہی قادری صاحب کراچی یونیورسٹی تشریف لے جاتے ہیں اور میرے برادر بزرگ محمد عادل عثمانی صاحب سے جو اس وقت چیف لائبریرین تھے۔ ملفوظات خواجہ کرک پڑھنے کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں عادل صاحب نے اسی وقت مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ شاید گزشتہ شب تم نے ایوب قادری صاحب سے ملفوظات اور تاریخ ظہور قطبی کا تذکرہ کیا تھا وہ اس وقت میرے پاس تشریف فرما ہیں مجھے تعجب ہوا کہ قادری صاحب نے اس سے استفادہ کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہ کی۔

ان کے کتب خانے میں بڑی نادر و نایاب کتب کا ذخیرہ ہے ایک بار انہوں نے مجھ سے اس ذاتی کتب خانہ کے نوادرات کا تذکرہ کیا تھا۔ میرے ہم وطن جسٹس نبی اللہ کردی مسلم لیگ کے اساسی ممبر تھے انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی تھی جس کا ذکر شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب FOUNDATION OF PAKISTAN میں کیا ہے کہ اس

خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ اسی زمانہ کا مطبوعہ قادری صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اپنے مکان کی بالائی منزل پر انہوں نے مطالعہ کا ایک کمرہ مخصوص کر رکھا تھا جس میں چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی خوبصورت الماریاں کھڑی ہیں جن میں کتابیں بڑے سلیقہ سے سجی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے اوراق قادری صاحب کی انگلیوں کے لمس کے آئینہ دار ہیں۔

ایوب قادری صاحب سے ہمارے گھریلو تعلقات تھے آخری بار میں نے ۹ ستمبر ۱۹۸۳ء کو انہیں عادل عثمانی کی بچی کی شادی میں دیکھا تھا کچھ دیر گفتگو رہی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا تھا مگر اب وہ اس کا کبھی بھی جواب نہ دے سکیں گے۔ خدا معلوم ان کو میرا خط ملا بھی یا نہیں۔ میرے پاس ان کے خطوط کا ذخیرہ موجود ہے جسے میں ایک قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں۔

وہ بڑے منکسر المزاج اور وعدہ کے پابند تھے ان کی کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی نمود و نمائش سے بہت گریز کرتے تھے انہوں نے جتنا علمی ادبی کام سرانجام دیا بڑی خاموشی اور بغیر تشہیر کے کیا وہ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف شارح یا مترجم تھے ان کی تحریر میں سادگی اور میانہ روی کی جھلک ملتی ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو رسالوں میں بکھرے ہوئے ان کے صدہا مضامین یکجا کر کے کتابی شکل میں چھاپ دیئے جائیں تاکہ اردو ادب کے اس خاموش سپاہی کی سعی مشکور رائیگاں نہ جائے اور مستقبل کا مصنف جب کبھی اردو تحقیق۔ ادب و انشاء۔ تاریخ و تنقید پر قلم اٹھائے تو ڈاکٹر ایوب قادری کی روشن کی ہوئی شمعیں اس کی صحیح خطوط پر رہنمائی کر سکیں۔

سید تقی رضا بلگرامی

آہ! ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

دریغا یکے از محبانِ خاص
نہاں گشتہ از چشمِ ما ناگہاں

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ٹریفک کے حادثے میں نباریخ ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء اس جہانِ فانی کو الوداع کہی اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہماری بازگشت بھی اسی کی طرف ہے لیکن اس قسم کے سانحے از حد افسوسناک اور قابلِ عبرت ہوتے ہیں۔ مرحوم قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے محنت کرنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ اُن کا یہی طریقہ تادمِ آخر رہا۔ وہ باوجود قدرت رکھنے کے سادہ لباس پہنتے تھے اور عوام الناس کی طرح بس میں یا پیدل سفر کرتے تھے۔ انہوں نے محنت ہی سے خود کو علمی مدارج پر پہونچایا اور معاشرے میں ایک اچھا مقام حاصل کیا۔ وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار اور اُردو

آرٹس کالج کراچی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ اُن کا شبدیزِ قلم تصنیف و تالیف میں ہمیشہ سرپٹ چلتا رہا اور اتنا کچھ معنوی سرمایہ چھوڑا جو انھیں زندۂ جاوید رکھے گا اور طالبانِ علم اس سے فیض پاتے رہیں گے۔ تذکرہ علماء ہند اور مآثر الامراء کے تراجم اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت پر اُن کی ضخیم اور پُر مغز تالیف اُن کے بڑے علمی کارنامے ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب کا تیسرا ایڈیشن انھوں نے مزید اضافوں کے ساتھ مرتب کر لیا تھا جسے وہ طبع کرانے کی فکر میں تھے۔

مرحوم اپنے احباب اور دوستوں کے باب میں بہت کشادہ دل اور وسیع المشرب تھے۔ خلوص و محبت، تواضع و انکساری اور ایثار و قربانی، یہ وہ جوہر تھے جو اُن کی ذات میں بہت نمایاں تھے اور وہ انھیں صفات سے پہچانے جاتے تھے۔ فقیر محررِ سطور کی اُن سے شناسائی مکرمی جناب بزمی انصاری صاحب کی وساطت سے چند سال قبل ہوئی تھی۔ رسمی تعارف کے بعد انھوں نے میرا مشرب دریافت کیا۔ میں نے حضرت علامہ اقبال مغفور کی زبان میں جواب دیا ع "یہ گنہگار بوترابی ہے"، میں نے مرحوم کے بارے میں اس تعارف سے قبل جو سنا تھا اس کے علی الرغم میرا جواب سُن کر ان کی جبین شکن آلود نہیں ہوئی بلکہ یہ معلوم کر کے کہ میرا تعلق بلگرامی سید خانوادہ سے ہے، پہلی تقریب میں ہی اس قدر اخلاص برتا کہ تقریباً سوا دو گھنٹے تک مجھ سے گفتگو کرتے رہے اور اپنا مقالہ بہ عنوان "میر عبدالواحد بلگرامی (وفات ۱۰۱۷ھ / ۱۶۰۸ء) جو رسالہ "اردو" میں طبع ہوا تھا ازراہِ کرم عنایت فرمایا۔ (یہ مقالہ بعد میں میر مذکور کی تصنیف "سبع سنابل" کے اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور میں مقدمہ کے طور پر شامل کیا گیا)۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں جلد جلد ہوتی رہیں اور

ہم دونوں قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور جلد ہی تکلفات کے سب حجاب اُٹھ گئے۔ مرحوم اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود وقت نکال کر یونیورسٹی جانے سے قبل اکثر و بیشتر علی الصبح غریب خانہ واقع ناظم آباد پر تشریف لے آتے تھے اور مجھے ممنون فرماتے تھے۔

مرحوم نے اپنی کاوش سے اچھا خاصا علمی ذخیرہ جمع کر لیا اور پانچ چھ ہزار کتابوں کا کتب خانہ ترتیب دے لیا تھا اور اس کتب خانہ کا دروازہ نہایت فراخ دلی سے مجھ کم سواد کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ میں جو کتاب چاہتا مطبوعہ یا قلمی، لے آتا اور جب تک چاہتا اپنے مطالعہ میں رکھتا۔ مودّت و محبت کے یہی گہرے نقوش ہیں جن سے ان کی یاد ہمیشہ وابستہ رہے گی۔

میں خدائے قدوس و برتر سے دست بہ دعا ہوں کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور ان کی روح کو دائمی سکون بخشے۔ آمین بحق طٰہٰ و یٰسین

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی اندوہناک وفات کا حادثہ ان کے اعزہ و احباب کے لئے روح فرسا سہی اور یقیناً روح فرسا ہے لیکن کراچی اور کمتر درجے میں لاہور، حیدرآباد اور راولپنڈی ان سب شہروں کی چھوٹی بڑی شاہراہیں مدت سے ایسی قتل گاہیں بنی ہوئی ہیں جہاں مواخذے اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر قتلِ عمد اور قتلِ انسان کا کھیل ہر روز کئی کئی بار کھیلا جاتا ہے، ہر ہفتے متعدد گھروں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں دس بیس خاندانوں کے رزق اور رونق چھن جاتی ہے، ماؤں کی گودیں خالی ہو جاتی ہیں، دلہنوں کا سہاگ اجڑ جاتا ہے، بھائیوں کے بازو شکستہ ہو جاتے ہیں اور بہنوں کے خواب تشنۂ تعبیر رہ جاتے ہیں۔ خدا جانے اس ملک میں وہ گھڑی کب آئے گی جب حوادث کے ذمہ دار، نالائق نااہل اور نابکار ڈرائیوروں اور رشوت لے کر یا گرائیں ہونے کے ناطے ان کو لائسنس اجرا

کرنے والے سرکاری ملازم موقع ہی پر اور بمصداق "قصۂ زمین بر سرِ زمین" حادثہ کے بعد ہی، عدالتِ مجاز و متحرک کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچنے لگیں گے یا ہم جیسے مجبوروں کو وہ نوبت (خدانخواستہ) دیکھنی پڑے گی جب اربابِ اقتدار کی بے حسی اور بے تدبیری کے استمرار سے تنگ آکر پبلک ایسے موقعوں پر قانون اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہو جائے گی، کاش ہماری صوبائی حکومتیں اس معاملے کو ترجیح اوّل کی بنیاد پر حل کرنے کی طرف فوراً متوجہ ہوں اور مندرجۂ ذیل تینوں معروضات زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی مدت میں پاکستانی معاشرے کے ٹریفک قوانین و ضوابط کا جزو لاینفک بن جائیں۔

(الف) مجروح و مضروب کو بغیر حادثہ کسی کا انتظار کئے بغیر اور ہر متناقص ضابطے اور قانون کے علی الرغم، قریب ترین کسی بڑے اسپتال میں منتقل کر دیا جائے۔

(ب) اس اسپتال کا سربراہ قانوناً اس کا محکوم ہو کہ سب کام چھوڑ کر اس مضروب یا مجروح کو خود دیکھے اور اس کا علاج اپنی نگرانی میں یا کسی دوسرے اور ذمہ دار ڈاکٹر کے سپرد کر دے۔

(ج) متحرک (MOBILE) سیشن جج، معقول تعداد میں بڑے شہر میں فوراً مقرر کئے جائیں جو بعدِ حادثہ جائے حادثہ پر پہنچ کر معائنہ کریں، مشیروں، عینی گواہوں، اعزہ یا ورثائے مجروح و مضروب کے اسماء پتے اور خلاصۂ معلومات کی یادداشت بنائیں اور ۲۷ گھنٹے کے اندر باضابطہ سماعت کے بعد معاملے کا قطعی فیصلہ کر دیں جس کی اپیل صرف شرعی عدالتِ عالیہ میں ہو سکتی ہو۔

(د) خاطی بلا لحاظِ مرتبہ و رتبہ، فوراً عدالتی تحویل میں لے لیا جائے اور سوائے سیشن جج متعلقہ کوئی مجاز نہ ہو کہ اس کو ضمانت پر رہا کر سکے (عام عدالتوں بشمول عدالتِ عالیہ و فوجی کورٹس کے اختیارات بھی اس بارے میں سلب کر لئے جائیں۔

(ہ) سیشن جج مجاز بھی صرف اسی صورت میں حکم ضمانت دے سکے گا جب مجروح یا مضروب کے قریب ترین ورثاء یا ان کی اکثریت بھی اتفاق کرے۔

اس بارے میں مزید غفلت اور تاخیر بڑے سنگین مفاسد کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ حکومت نے اگر ان معروضات پر کان دھرا تو گویا، ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کا خون رائیگاں نہیں گیا اور تا ابد اہلِ پاکستان کو مخاطب کرتا رہے گا کہ ؎

صفحۂ ہستی کی تزئین کر گیا میرا لہو

تسنیم مینائی

اے صرصرِ اجل، یہ ستم تو نے کیا کیا ؛ تھا جو "چراغِ علم" اسے بھی بجھا دیا

تاریخ کے کھنڈر میں تھا تحقیق کا جو نور ؛ ظلمت میں اپنی تو نے اسے بھی چھپا لیا

اس دورِ قحط الرجال میں حقیقتہً اہلِ علم عنقا ہیں اور جو خال خال ہیں بھی ان میں بھی محققانہ فکر و نظر کمیاب ہے، کیونکہ یہ ایسی نظری صلاحیت ہے جو علمی کمال کا لازمہ نہیں بلکہ ایک اضافی صفت ہے جو کسی کسی کو ہی ودیعت ہوتی ہے۔ ایوب قادری مرحوم بلا اختلاف ان معدودے چند نوابغِ علم میں سے تھے جنہیں اس برصغیر پاک و ہند میں اس خصوصی موہبتِ الٰہی

سے فیضیاب کیا گیا تھا۔ بس اب فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا ایک مبسوط و جامع تذکرہ مرتب کر کے شائع کیا جائے جس میں ان کے حالاتِ زندگی اور میدانِ تاریخ نگاری میں ان کے محققانہ کارناموں کو بھی محفوظ کر لیا جائے تاکہ مستقبل کے مورخین کی رہنمائی اور محققین کی ترغیب و تشویق ہوتی رہے (اس مجوزہ "تذکرۂ ایوبی" کے لیے بنیادی کام تو اس کی ترتیب و تدوین اور مالی وسائل کی فراہمی ہے۔

اس توقع پر کہ شاید کسی کو جلد یا بدیر اس کام پر قلم اٹھانے کی توفیق ہو، میں ان کا ایک اہم مکتوب پیش کر رہا ہوں جس سے ان کی صحیح تاریخ ولادت ان کے خاندانی حالات کا اجمالی پس منظر بھی واضح ہو جائے گا۔ اس مکتوب کے آغاز میں انہوں نے جو میری طرف سے "یاد دہانی" اور اپنے محجوب ہونے کا جو ذکر کیا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ جس طرح بعض دیوانوں کو "چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط جمع کرنے کا جنون ہوتا ہے اسی طرح مجھے بھی اپنے احباب کے خطوط اور تصاویر جمع کرنے کا خبط ہے تاکہ اگر اور کچھ نہ ہو تو "بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلے" اسی ضمن میں مرحوم سے بھی ان کی تصویر کے لئے درخواست کی تھی، جسے انہوں نے شرف قبولیت بخشا۔ قادری صاحب نے اپنی تصویر کی پشت پر صرف مقام ولادت (آنولہ) اور سالِ ولادت (۱۹۲۶ء) لکھا تھا میں نے ان سے درخواست کی کہ تاریخ و ماہ ولادت سے بھی مطلع فرمائیں انہوں نے وعدہ کیا کہ گھر میں ڈائری سے دیکھ کر لکھ بھیجوں گا۔ میں نے ۱۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کے عریضے میں ایفائے وعدہ کے لئے یاددہانی کی جس کے جواب میں انہوں نے اس گرامی نامہ میں پہلے اپنی طرف سے تاخیر پہ محجوب ہونے کا اظہار فرمایا تھا۔ اب ان کے مکتوب کی

عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

۲۱؍دسمبر ۱۹۷۸ء   م   ۲۰؍محرم ۱۳۹۹ھ۔ جمعرات

محترمی کنور صاحب، سلام و رحمۃ"

"گرامی نامہ ملا۔ آپ کی یاددہانی پر محجوب ہوں اور آپ کے خلوص و محبت کا شکرگزار۔ میری صحیح تاریخ پیدائش ۱۷؍ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۲۸؍جولائی ۱۹۲۶ء موافق ۴؍بدی ساون سمت ۱۹۸۳ بکرمی بروز چہار شنبہ ہے۔ تاریخ پیدائش "چراغِ علم" (۱۳۴۴ھ) سے نکلتی ہے۔ ہمارے ایک دور کے عزیز مولوی حکیم عبدالغفور تھے۔ انہوں نے یہ تاریخ نکالی تھی۔"

والد مرحوم مولوی مشیت اللہ قادری فارسی ادب کے فاضل تھے۔ تاریخ، رجال اور انساب پر گہری نظر تھی، تاریخ روہیل کھنڈ کا خصوصی مطالعہ تھا۔ ان کا داد میں ۲۱؍ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۵؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کو انتقال ہوا۔ روہیلوں کے زمانہ میں ہمارا خاندان بدایوں سے اول منونہ اور پھر آنولہ منتقل ہوا اور اپریل ۱۹۵۰ء (آخری تاریخوں) میں آنولہ کو چھوڑ کر مئی ۱۹۵۰ء (شروع تاریخوں) میں پاکستان میں داخل ہوا۔

فقط والسلام۔   مخلص

محمد ایوب قادری

اس حساب سے بوقتِ وفات ان کی عمر تقویم عیسوی سے ۵۲ سال، ۳ مہینے اور ۲۹ دن اور ہجری تقویم سے ۵۹ برس دو مہینے اور چار یوم تھی۔ اس مکتوب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخی ذوق اور اس موضوع پر محققانہ

بصیرت انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔

مرحوم سے میری نیاز مندی کا آغاز اواخر ۱۹۷۶ء یا اوائل ۱۹۷۷ء میں اس تقریب سے ہوا کہ میں نے سید الطاف علی بریلوی صاحب سے درخواست کی کہ مورخانہ بصیرت رکھنے والے کسی ایسے اہلِ قلم کی نشاندہی فرمادیں جو "اشرف نامہ" (مصنفہ نواب اشرف خاں) کو نہ صرف فارسی سے اردو میں ترجمہ کردے بلکہ اس میں بطور تقریظ مستند و معتبر قدیم تاریخی ماخذ سے لال خانی مسلم راجپوتوں کی اجمالی تاریخ بھی ابتداء سے اب تک کی شامل کرسکے۔ سید صاحب موصوف نے میری درخواست سنتے ہی بلا تامل ایوب قادری صاحب سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور ان کے دولتکدہ کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر بھی دیا۔ میں کچھ دن تک اسی شش و پنج میں رہا کہ قادری صاحب سے کب اور کیونکر ملا جائے کہ اچانک ایک دن وہ خود غریب خانے پر تشریف لے آئے میں شرمندہ ہوا کہ غرض تو میری تھی مگر پیش قدمی ان کی طرف سے ہوئی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ بریلوی صاحب نے انہیں میری ضرورت سے مطلع کیا تھا اور ان کے دفتر سے سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ یہ ان کے بڑے پن کی علامت تھی۔

اس ملاقات میں میری مذکورہ بالا ضرورت پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے اس کی اہمیت کی توثیق کی کیونکہ "اشرف نامہ" نہ صرف مصنف کی خود نوشت داستانِ حیات ہے بلکہ اس زمانہ میں جو سیاسی خلفشار تھا اور ملکی و غیر ملکی مختلف طاقتوں میں حصولِ اقتدار کے لئے مسلح نبرد آزمائی ہورہی تھی اس کی بھی دلچسپ اور عبرتناک داستان ہے۔ لیکن اپنی گوناگوں نارسیی، تحقیقی و تصنیفی مصروفیتوں کے باعث انہوں نے مشورہ دیا

کہ کتاب کا ترجمہ تو میں خود کر یوں (جو افسوس ہے کہ ابتک نہ کر سکا) پھر تاریخ لال خانیاں بطور تقریظ یا پیش لفظ کے وہ لکھ دیں گے۔ اسی سلسلے میں قائداعظم کے راجپوت ہونے کا بھی ذکر آگیا تو انہوں نے مجھ سے فرمائش کی اس موضوع پر ایک مدلل مقالہ اردو کالج کے مجلہ " برگ گل" کے قائداعظم نمبر کے لئے قلم بند کر دوں۔ میں نے کافی محنت و کاوش سے اس حکم کی تعمیل کی انہیں ٹیلی فون پر مقالہ کی تکمیل سے مطلع کر دیا جس پر انہوں نے تاکید کی کہ ڈاک سے نہ بھیجا جائے بلکہ وہ کسی دن خود آکر وہ مقالہ لے جائیں گے دوسرے یا تیسرے دن میں ترقی اردو بورڈ گیا اور حقیؔ صاحب سے قائداعظم کی راجپوتیت اور میرے مقالہ کا ذکر آیا تو انہوں نے اصرار فرمایا کہ وہ مقالہ بورڈ کے جریدہ " اردو نامہ" کے قائداعظم نمبر کے لئے نذر کر دوں۔ میں نے قادری صاحب کی فرمائش کا عذر کیا کہ برگِ گل کے لئے تحریر کیا اور اس کی تکمیل سے انہیں مطلع بھی کر چکا ہوں اور وہ کسی دن اسے لینے تشریف لانے والے ہیں مگر انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ نہیں، وہ مقالہ تو " اردو نامہ" ہی کے لئے دیدوں چنانچہ حقیؔ صاحب کے اصرار پر وہ مقالہ اُن کے حوالہ کر دیا افسوس کہ یہ تاریخی مقالہ طویل عرصہ کے بعد ۱۹۸۲ء میں (جب حقیؔ صاحب کا تعلق بورڈ سے منقطع ہوگیا تھا) چھپا اور وہ بھی کاٹ چھانٹ کے بعد اور کتابت کی بے شمار اغلاط کے ساتھ، نیز حقی صاحب کے وعدہ کے برخلاف افتتاحی مقالے کے بجائے درمیانی صفحات پر جب میں نے قادری صاحب کو اصل مقالہ کی نقل دکھائی تو انہوں نے اس کی بہت تعریف کی اور اس کی اشاعت میں میرے ساتھ جو زیادتی کی گئی اس پر اظہار تاسف بھی کیا۔

میں نے ٹیلی فون پر قادری صاحب کو مطلع کیا کہ وہ مقالہ حقیؔ صاحب کے اصرار پر ان کو دینا پڑا تو ایک منٹ وہ خاموش رہے اور پھر میری اس ناروا حرکت پر (غالباً ذہنی تکدر کو ضبط کر کے) ہنستے ہوئے فرمایا کہ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ کی محنت تو ضائع نہیں ہوئی "اردو نامہ" بھی اپنا ہی ہے، اب "برگِ گل" کے لئے کچھ اور لکھ دیجئے میں نے کہا کہ قائد اعظم کا یہی ایک پہلو تھا جس پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی اور اسی لئے میں نے اسے منتخب کیا تھا، اب تو اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر نہ لکھا گیا ہو، مگر انہوں نے اصرار کیا کہ کچھ نہ کچھ تو خامہ فرسائی "برگِ گل" کے لئے بھی ضرور کیجئے محققانہ نہ سہی ادیبانہ ہی سہی۔ چنانچہ میں نے اپنی خجالت رفع کرنے کے لئے ایک ہلکا پھلکا سا مضمون قلمبند کر کے پیش کر دیا، جسے انہوں نے غریب خانہ پر ہی تشریف لا کر پہلے مطالعہ فرمایا اور پھر "برگِ گل" کے قائد اعظم نمبر میں شامل کر دیا۔ اس کے بعد ان ہی کے ایما پر "برگِ گل" کے لئے مولانا محمد علی جوہر نمبر کے لئے لکھنا پڑا۔ جو متعلقہ شمارے میں شامل کیا گیا۔ اور آخر میں ان کی فرمائش پر "برگِ گل" کے بہادر یار جنگ نمبر کے لئے نہ صرف خود لکھا بلکہ حیدر آباد میں مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رزمی جے پوری (الیاس عشقی صاحب کے والد) سے ایک مضمون بصد ہو کر لکھوا کر منگوایا اور قادری صاحب کو پیش کر دیا ان دونوں مضامین، نیز میرے ہمسایہ اور کرم فرما نواب سید شمس الحسن صاحب شمسی لکھنوی کے مضمون کے متعلق انہوں نے ہر بار یہی اطلاع دی کہ تینوں مضامین اسی خصوصی شمارے میں شامل کر لئے گئے ہیں جو طباعت کے مراحل سے گزر کر جلد بندی کی منزل میں ہیں اور تیار ہوتے ہی اس کے جملہ قلمی معاونین کو اعزازی کاپیاں پیش کر دی جائیں گی مگر افسوس ہے کہ

وہ اپنی زندگی میں اپنے مرتب و مدون کردہ شمارے کی اشاعت نہ دیکھ سکے اور نہ الفائے وعدہ میں ہم تینوں کو کاپیاں مرحمت کر سکے۔ اس شمارے کی اشاعت میں تاخیر کی بنا پر ۲۵ نومبر ۸۳ء کی شام کو میں نے طے کیا کہ کل نماز فجر کے بعد ہی انہیں ٹیلی فون کر دوں گا لیکن صبح کو جب اخبار کھولا تو معلوم ہوا کہ اب اُن سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور گزشتہ شام ہی ایک ناہنجار سوزوکی ڈرائیور کی سفاکی نے تمام دنیاوی وسائل و روابط سے اُن کا رشتہ منقطع کر دیا تھا۔ دوسرے دن یہ خبر بھی نظر سے گزری کہ اس قاتل کو گرفتار کر لیا گیا ہے لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ اسے کچھ مدت کے لئے بند کر دیا جائے گا اور شاید کچھ جرمانہ بھی کر دیا جائے مگر اس سے نہ تو دنیائے علم و ادب کے اس عظیم نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے جو مرحوم کی اس ناگہانی دردناک موت سے ہوا اور نہ ان کے اہل و عیال کی معاشی کفالت کے لئے کوئی متبادل ذریعہ ہی پیدا ہو سکتا ہے اگر حکومت نے جیسا کہ ایسے جان لیوا حادثات میں ہوتا ہے، دس بیس ہزار روپیہ بطور معاوضہ دے بھی دیا تو صرف ایک دفعہ ملنے والی وہ رقم اس روز افزوں گرانی کے دور میں مرحوم کے پانچ زیرِ تعلیم بچوں اور بیوہ ماں اور بیوی کے لئے کتنے دن کفایت کر سکے گی؟ کاش صوبائی اور مرکزی حکومتیں مرحوم کے محققانہ کارناموں اور مؤرخانہ کاوشوں کے اعتراف اور صلہ میں ان کے پس ماندگان کی کفالت کے لئے کوئی مستقل انتظام کر دیں پانچوں لڑکے اپنی تعلیم مکمل کر لیں اور معاشی طور پر خود کفیل ہو جائیں اور بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ زندگی بسر کرنے کے لئے انہیں اپنا یہ واحد رہائشی مکان ہی فروخت کرنا پڑ جائے،

جسے مرحوم نے بڑے چاؤ سے نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیل کر ایک ایک پیسہ جوڑ کر تعمیر کیا تھا۔ مرحوم نے نہ معلوم کیسی کیسی تگ و دو کر کے پاکستان اور ہندوستان میں نہ جانے کہاں کہاں سے علمی، ادبی، تاریخی و دینی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نوادرات ہزاروں کی تعداد میں جمع کئے تھے یہ نہ ہو کہ معاشی بدحالی سے تنگ آکر ان کے پس ماندگان بسر اوقات کے لئے انہیں کوڑیوں کے مول لٹا دیں۔ مرحوم جیسے علمی دیوانے ورثہ میں کوئی بنک بیلنس یا جائداد تو چھوڑ نہیں جاتے جو پس ماندگان کو فکر معاش سے آزاد رکھ سکے۔ ہزاروں مطبوعات و مخطوطات پر مشتمل ان کے اس ذخیرہ کو نہ صرف بطور ان کی یادگار کے بلکہ مستقبل کے محققین کے استفادہ کے لئے بھی محفوظ رکھنا ضروری ہے اس لئے ان کے ورثاء کی رضامندی سے) حکومت یا تو اسے جامعۂ کراچی کے کتب خانہ یا لیاقت نیشنل لائبریری کے لئے فراخدلانہ قیمت پر حاصل کرلے تو مناسب ہوگا اس طرح ان کی عمر بھر کی محنت و سرمایہ کے اس حاصل کی مستقل حفاظت کا بند و بست بھی ہو جائے گا اور ان کے بے بس اور بے سہارا پس ماندگان کو بھی کم از کم وقتی سہارا مل جائیگا۔

اس سلسلہ میں یہ تجویز بے محل نہ ہوگی کہ ٹریفک کے چھوٹے بڑے ہر قسم کے حادثات میں اگر مروجہ سزا دہی (جس کی شاذ ہی نوبت آتی ہے) کی بجائے یہ مقدمات شرعی عدالت میں فیصلہ کے لئے پیش کئے جایا کریں تو چھوٹے سے چھوٹے جسمانی نقصانات سے لے کر قتل خطا تک پر اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان کے اجراء سے ان حوادث کی روک تھام زیادہ موثر طریقہ پر ممکن ہو جائے گی۔

مجھے جب بھی کبھی کوئی تاریخی الجھن ہوتی تو سب سے پہلے انہیں سے

رجوع کرتا تھا اور مرحوم بحد امکان اس کے سلجھانے میں مدد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ۷ ر نومبر ۸۳ء کے عریضہ میں بھی ایک اسی نوعیت کی عقدہ کشائی میں مدد طلب کی تھی مگر افسوس ہے کہ اس الجھن کو سلجھانے سے پہلے ہی اُن کا دنیاوی عقدہ حیات کھل گیا۔ جس سلسلہ میں ان سے درخواست کی تھی وہ یہ ہے کہ مچھلی شہر (ضلع جونپور) کے ایک معروف بزرگ شیخ فیض اللہ ابن شکر اللہ جعفری الزینبی کے اخلاف میں ایک صاحب مولوی عبدالرحیم ابن شاہ رفعت اللہ تھے۔ مجھے ان کا سلسلۂ نسب حضرۃ جعفر طیار رض تک کا مطلوب ہے نیز یہ معلوم کرنا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ نیازیہ مسکینیہ میں انہیں کس سے خلافت ملی تھی؟ آیا اپنے والد شاہ رفعت اللہ سے ہی جو حضرت سکندر علی شاہ الہ آبادی کے خلفاء میں تھے یا اسی سلسلہ کے کسی اور بزرگ سے؟
عبدالرحیم صاحب مرحوم ہادی مچھلی شہری کے ماموں تھے اس طرح ہادی مرحوم کا مادری شجرۂ نسب ہی عبدالرحیم صاحب کا پدری شجرۂ نسب ہے۔ ہادی مرحوم کا ددھیالی شجرہ تو مطبوعہ موجود ہے لیکن ان کا ننھیالی شجرہ ایس۔ ایم وسیم صاحب (خلف ہادیؔ صاحب مرحوم) کو بھی نہیں معلوم۔ اس لیے میں نے قادری صاحب سے درخواست کی تھی کہ اگر ان کے یا ان کے احباب کے علم میں مطلوبہ معلومات ہوں تو مدد فرمائیں یا پھر پاکستان یا ہندوستان میں کسی ایسے شخص کی نشاندہی فرمادیں جو مچھلی شہری کے اس زینبی خانوادہ کے متعلق مستند و معتبر ماخذ کے حوالہ جات سے تفصیل فراہم کر سکے۔ اب یہی سوال میں ان سطور کے قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔
اسی سلسلہ میں مجھے ہادی مرحوم کے بھائی سید مصطفیٰ مچھلی شہری مرحوم

کی اولاد کا بھی پتہ مطلوب ہے کیونکہ عبد الرحیم صاحب اولاد سے محروم ہونے کے باعث اخیر عمر میں سید مصطفیٰ صاحب کے پاس ہی ریاست جے پور کے ایک قصبہ میں) رہنے لگے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا یہی سبب ہے کہ مستند و معتبر آخذ سے ماخوذ ان کی تالیف کردہ سیرت نبوی موسومہ "مخزن الاسرار فی احوال النبی المختار" کا ضخیم (تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل خود ان کا تحریر کردہ خوش خط مخطوطہ بھی سید مصطفیٰ مرحوم کے پاس ہی رہ گیا جسے وہ یقیناً کراچی لے آئے ہوں گے۔ اسی مخطوطہ کا سراغ لگانے کے لئے سید مصطفیٰ مرحوم کے اخلاف اور ورثاء کی تلاش ہے اور اسی جستجو میں میں قارئین ہذا سے مدد کا خواہاں ہوں۔ ان کی دو مطبوعہ کتابیں بھی میرے علم میں ہیں جو ان کے خانوادۂ طریقت کے بزرگ حضرۃ غلام محمد عرف مسکین جے پوری (خلیفہ حضرۃ شاہ نیاز بریلوی) سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک تو "کشف المسکین علی اصحاب الیقین" ہے، جو ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء کو جادو پریس، جونپور میں چھپی تھی اور خوش قسمتی سے جس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ دوسری مطبوعہ کتاب "تحفۃ المسکین" ہے جس کا حوالہ اسی سلسلہ مسکینیہ کے ایک بزرگ سید اکرام حسین شاہ صاحب نے اپنی تالیف "گلزار مناقب" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) کے صفحہ ۱۵ پر دیا ہے۔ لیکن میں نے جب ۴ ۲ مئی ۸۳ء کو بذریعہ مراسلہ ان سے استفادہ کیا کہ وہ کتاب کس کے پاس ہے تو انہوں نے (جب ۷ جون ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد سے تشریف لائے تھے) زبانی بتایا کہ وہ کتاب انہوں نے حضرۃ مسکین شاہ کے خاندان کے ایک بزرگ قطب الدین شاہ صاحب کے پاس دیکھی تھی جن کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کے صاحبزادے کراچی میں کہیں رہتے ہیں

جن کا پتہ معلوم نہیں۔ اگر اس کتاب "تحفتہ المسکین" کا کوئی نسخہ کسی کے پاس ہو تو وہ براہِ کرم مطلع فرمائیں، تاکہ اس کی عکسی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ مرحوم قطب الدین شاہ صاحب جے پوری کے ورثاء کا بھی پتہ راقم کو مطلوب ہے۔

افسوس کہ قادری صاحب کی اچانک اور اندوہناک وفات سے ہیں محروم ہوگیا ورنہ کسی اور سے استمداد کی ضرورت پیش نہ آتی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

فکر و نظر کی شمع اچانک جو بجھ گئی ؞ علم و خبر کی راہ پہ مدھم ہے روشنی
تحقیق کا جو نور تھا مرحوم ہی سے تھا ؞ بے شک "چراغِ علم" تھے ایوب قادری

سحر انصاری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

چند تاثرات

تن آسانی اور شہرت طلبی کے اس دور میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی ذات کئی اعتبار سے منفرد اور مختلف تھی۔ میں ذاتی طور پر انہیں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ طلبِ علم کے ساتھ ساتھ طلبِ اسناد کی لگن لئے زندگی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ معاشرے میں جب روزگار اور شخصی تعارف کا مرحلہ آتا ہے تو اسناد ہی کے بل پر قابلیت اور شخصیت کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ گریجویٹ ہوئے۔ ایم۔ اے ہوئے اور پھر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرلی۔ انہیں قریب سے جاننے والے کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام اسناد سے قبل بھی وہ ایک عالم تھے اور ان کے ۵۶ اور ۵۷ء کے مقالات حقیقی ریسرچ اور سنجیدہ علمی شغف کے آئینہ دار تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری سادہ مزاج، خوش اخلاق اور بہت گہرے انسان تھے۔ گہرے میں نے ان تمام معنوں میں استعمال کیا ہے جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ان سے اکثر ادبی تقاریب، کتابوں کی

دکانوں، پرانی کتابوں کے ٹھیلوں اور فٹ پاتھ پر فروخت ہونے والے علمی وادبی سرمائے کے جھرمٹ میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ العلم، قومی زبان، بصائر اور اردو نامہ اور بعض دیگر علمی وادبی جریدوں میں ان کے مقالات نظر سے گزرتے تھے۔ انھوں نے تاریخ اور تصوف کی کئی کتابوں کے ترجمے کئے اور کئی کتابیں خود انہی کی کاوشوں کا آئینہ ہیں۔ تاریخ، تصوف، ادب، مذہب، زبان اور تہذیب سے مرحوم ایوب قادری کو خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے علمائے سلف کی علمی خدمات پر بہت کام کیا ہے۔

جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری ایک جز وقتی استاد کی حیثیت سے آتے تھے۔ ویسے مستقل طور پر ان کا تدریسی تعلق اردو کالج سے تھا۔ جامعہ کراچی سے وابستگی کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ زیادہ ہوگیا۔ اسلام آباد جاتے وقت ہم، وہ اور حمایت علی شاعر ساتھ تھے۔ سفر میں اُن کی شخصیت اور نکھر گئی وہ بڑے مخلص اور دوست نواز انسان تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا ذاتی کتب خانہ بلاشبہ ایک قابل ذکر ذخیرۂ کتب ہے، وہ بڑی کاوش اور لگن سے کتابیں جمع کرتے تھے۔ اپنے کتب خانہ کے علاوہ انہیں شاید پاکستان کے بیشتر نجی کتب خانوں تک رسائی حاصل تھی۔

مرحوم ایوب قادری سے جب بھی گفتگو ہوتی، خوش مزاجی اور خوش مذاقی کے ماحول میں ہوتی لیکن یہ محض گپ شپ ہرگز نہ ہوتی تھی، گھوم پھر کر بات کسی ادبی شخصیت، کسی کتاب، کسی مقالے،

کسی علمی یا ادبی نکتے تک آجاتی تھی۔ گفتگو سنجیدہ ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں یبوست نام کو نہیں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری اپنے اساتذہ میں پروفیسر حبیب اللہ غضنفر مرحوم کا تذکرہ بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ غضنفر صاحب کے غیر مطبوعہ مقالات اور دوسری تمام تحریریں شائع ہوجائیں۔ انہوں نے روہیل کھنڈ کو بھی اپنا موضوع بنایا اور یہاں کی شخصیات اور تہذیب کے ضمن میں یادگار کام کیا ہے۔

قادری صاحب مرحوم ہر سال کے آخر میں ایک وفات نامہ شائع کرتے تھے جس میں سال کے دوران رخصت ہوجانے والی اہم شخصیتوں کی تاریخ وفات اور مختصر حالات درج ہوتے تھے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ابھی فیض احمد فیض کے انتقال کو ایک سال ہوا ہے لیکن ان کی ایسی مشہور اور ہر دلعزیز شخصیت کی تاریخ وفات بھی کسی نے ۱۹ر نومبر لکھی ہے اور کسی نے ۲۰ر نومبر۔ قادری صاحب کی اس محنت کا اندازہ ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے۔ اب جب کہ ۱۹۸۵ء کا سال اختتام کو پہنچ رہا ہے ایوب قادری کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری ایک خود ساختہ شخصیت تھے۔ انہوں بڑی جد و جہد کے بعد یہ مقام حاصل کیا تھا۔ ان کی موت جس انداز سے ہوئی وہ ہم سب کے لئے درسِ عبرت بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی۔ اہلِ علم اور اربابِ فن کی جانب ہمارا ایسی کا یہ رویّہ بجائے اس معاشرے کو کہاں پہنچائے گا۔ ان کی زندگی میں ایوب قادری

کے دوست بھی ہوں گے اور دشمن بھی لیکن ان کی موت جس طرح ہوئی، اس کے بعد کیفیت کچھ یہی رہی ہوگی :۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہوگئے

—— : ——

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ڈاکٹر قادری صاحب پاکستان کے نامور محقق، مشہور مورخ ممتاز مترجم، گورنمنٹ اردو کالج کراچی کے شعبۂ اردو کے صدر تھے اور کالج کے مجلہ "برگ گل" کے نگراں تھے۔ آپ قلم و قرطاس کے آدمی تھے۔ جہاں جاتے معلومات حاصل کرنے میں مصروف رہتے۔ یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی ان کی دلچسپیوں کا محور تھا تذکرۃ الرجال آپ کا خاص موضوع تھا۔ "تذکرہ علماء ہند" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس پر حواشی لکھے۔ "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" کے عنوان پر آپ نے مقالہ لکھ کر ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

دو تین سال قبل ۱۸۵۷ء کے حالات و شخصیات سے متعلق آپ کی ایک بہترین تصنیف "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء" شائع ہوئی جو آپ

بطورِ خاص سفرِ حضرو میں والدِ گرامی خواجہ محمد خاں اسدؔ کے لئے ہمراہ لائے تھے اور اس پر وہ تاریخی الفاظ تحریر فرمائے جو قارئین کرام رسالہ سماج میں دیکھ اور پڑھ چکے ہیں۔

راقم السطور کو مخدومی ڈاکٹر صاحب سے پہلی دفعہ اس وقت شرفِ ملاقات حاصل ہوا جب آپ نے اپنے ایک مکتوب (محررہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۵ء) میں والدِ گرامی کو تحریر فرمایا تھا کہ "میں لاہور آرہا ہوں اور وہاں میرا قیام حکیم محمد موسیٰ خاں امرتسری و پروفیسر محمد اقبال مجددی کے ہاں ہوگا اگر آپ بھی تشریف لے آئیں تو ملاقات ہوجائے گی۔ والدِ گرامی نے مکتوب ملتے ہی رختِ سفر باندھا اور مجھے ساتھ لے کر عازمِ سفر ہوئے۔ لاہور پہنچنے کے دوسرے دن حکیم صاحب کے مطب جانا ہوا۔ وہاں مخدومی ڈاکٹر صاحب و مجددی صاحب اور حکیم صاحب تشریف رکھتے تھے۔ کافی دیر تک وہاں علمی صحبت میسر رہی وقت رخصت ڈاکٹر صاحب نے برادرِ اکبر صالح محمد خاں صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جو کہ ان دنوں لاہور ہی میں مقیم تھے اور ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور میں مدیر معاون کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ دوسرے دن جب بھیا ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تھے تو واپسی پر انھوں نے اپنے دستخطوں سے مزین کراچی کالج کا مجلہ سالنامہ "برگِ گل" عنایت فرمایا اور "خدام الدین" میں تبصرے کے لئے بھی کہا۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک دن اچانک حضرو آئے۔ آپ کے ہمراہ پروفیسر اقبال مجددی صاحب بھی تھے ایک رات اور دن قیام فرمایا

بقول آپ کے "ہم کچھ دن یہاں رہ کر کتب خانہ کی اچھی طرح تلاشی لیں گے۔" مگر افسوس کہ آپ کو خواہش کے مطابق یہاں زیادہ دن رہنے کی مہلت نہ مل سکی۔ کیونکہ دوسرے ہی دن پاکستانی تاریخ نے عظیم پلٹا کھایا اور بھٹو صاحب کو معزول کر کے پورے ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس لئے ملکی انقلاب کے پیش نظر آپ جلد ہی واپس تشریف لے گئے۔

والد گرامی کے ۱۹۸۰ء میں مکہ مکرمہ کے انتقال پر آپ نے تعزیت نامے میں فرمایا کہ "میں آپ لوگوں کے لئے اب بھی وہی ہوں اور تادم زیست آپ لوگوں سے رابطہ قائم رکھوں گا۔" آپ نے اپنے اس وعدہ کو واقعی تادم زیست نبھایا۔ آپ کا آخری مکتوب گرامی وفات سے کچھ روز قبل ہی مجھے موصول ہوا جس کا میں جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ سنا آپ ایک حادثے میں انتقال فرما گئے ہیں یہ خبر میرے قلب وسکون پر برق بن کر گری اور بے اختیار زبان سے نکلا ؎

وے لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

پچھلے سال اسی ماہ کے آخر میں آپ ہم سے جدا ہوئے تھے۔ آج آپکو ہم سے بچھڑے ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ آپ کی پہلی برسی کے موقع پر آپ کے دو آخری مکتوب نذر قارئین ہیں۔

مکتوب نمبر ۱

۱/ ۱۷۴/ ۱ بی
شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳

عزیز مکرم سلام و رحمتہ

آپ کا محبت بھرا خط موصول ہوا۔ مرحوم خاں[1] صاحب کی یاد تازہ ہو گئی آپ اُن کے لائق فرزند ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش و خرم رکھے اور دارین کی نیکیوں سے نوازے۔

سب سے زیادہ مسرت اس بات سے ہوئی کہ آپ اُن کے مشن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ علم و ادب سے آپ کو تعلقِ خاطر ہے آپ، دوستوں کے خطوط جو انہوں نے خاں صاحب مرحوم کو لکھے تھے، مرتب کرکے شائع کر رہے ہیں۔ یہ علم و تاریخ و ادب کی خدمت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس ارادہ میں کامیابی بخشے۔ آمین!

'سماج' کا پہلا شمارہ ملا۔ نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس کے مقاصد نہایت اعلیٰ ہیں۔ زبان و بیان، ترتیب و تنظیم ہر اعتبار سے یہ مجلہ قابلِ ستائش ہے۔ میری طرف سے تمام کارکنان کو دلی مبارکباد دیجیئے۔ عزیزان کو بہت بہت دعائیں۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام حاجی سکندر خاں صاحب سے خاص طور سے سلام کہئے۔ ان کا سفرنامہ میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔ آج کل وہ کیا علمی کام کر رہے ہیں۔ میں خاں صاحب مرحوم پہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا اطمینان فرمایئے۔

نوٹ: مجھے آپ کا خط کل ۱۱ اپریل کو ملا تھا۔

آج ۱۲ اپریل ۸۲ء بروز شنبہ جواب دے رہا ہوں۔

فقط والسلام

[1] والد گرامی خواجہ محمد خاں اسد

خاکسار محمد ایوب قادری

مکتوب نمبر۲

عزیز مکرم سلام ورحمتہ

آپ کا گرامی نامہ اور پھر سماج کا دوسرا شمارہ ہمدست ہوا۔ ہر دو کے لئے دلی شکر گزار ہوں۔ آپ نے اپنے خط میں جس خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے اس کے لئے ممنون ہوں۔ بھائیوں کے حالات معلوم ہوکر مسرت ہوئی۔ مولوی صالح محمد صاحب کس جگہ ہیں اور اُن کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ چھوٹے بھائی اور آپ کی تعلیمی کیفیات معلوم ہوکر اطمینان ہوا۔ آپ کے ادبی ذوق کا بھی اندازہ ہوا خوب ترقی کر رہا ہے۔ میں نے آپ کی غزل پڑھی۔ یہ شعر حاصل غزل ہے ؎

بدلے ہوئے حالات کا اصرار یہی ہے
کرگس کو نگہبان گلستاں کا بنادے

سماج کا نقشِ ثانی نقش اوّل سے بہتر ہے۔ مضامین، نظمیں اور تاثرات خاصے کی چیزیں ہیں۔ سکندر خاں صاحب کا سفرنامہ معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ خدا کرے جلد کتابی صورت اختیار کرلے رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول اور 'سماج' کا آئینہ دار ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔ تمام احباب کو سلام۔ توقیر علی زئی سے سلام کہئے۔

اپنے مرحوم والد صاحب کی زندگی کا خاکہ باعتبارِ سنین لکھ کر بھیجئے کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے تعلیم کے کن کن مراحل سے گزرے وغیرہ وغیرہ بھائیوں کو سلام۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری

محمد صادق قصوری

ڈاکٹر محمدؐ ایوب قادری

پیاروں کی موت نے مری دنیا اجاڑ دی یاروں تے دور جا کے بسائی ہیں بستیاں

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی رحلت کو ایک سال ہونے والا ہے مگر میرے دل و دماغ نے ابھی تک ان کی موت کو قبول نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ استاذی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ کے مطب میں جلوہ افروز ہیں۔ علم و ادب، تحقیق و جستجو، اور تاریخ و تذکرہ کے پھول ان کے منہ سے جھڑ رہے ہیں۔ اور مجھ جیسے کتنے طالب علم اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں۔ اپنے دل و دماغ کو نور علم سے منور کر رہے ہیں ؎

وہ کبھی کے جاچکے مگر نظروں میں اب تک سما رہے ہیں
وہ مسکرا رہے ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔ وہ جا رہے ہیں

قادری صاحب ایک درویش صفت عالم تھے۔ انھیں مذہب، تاریخ، تذکرہ، سیاست، سیر و سوانح، غرض سب ہی علوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ برصغیر کی تاریخ پر تو انھیں اتھارٹی کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس میدان میں اکیلے جتنا کام کیا قیام پاکستان سے لے کر کوئی ادارہ یا سب ادارے بھی نہیں کر سکے۔ وہ مورخ بے مثال اور محقق باکمال تھے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ درویش باجمال بھی تھے ان میں انکساری تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ملک کے سب سے بڑے مورخ تھے مگر کیا مجال کہ غرور و تکبر کبھی پاس سے بھی گزرا ہو، وہ سیکڑوں کتابوں کے مصنف و

مترجم تھے مگر کبھی فخر کی بات نہ کی وہ میدانِ تحقیق کے شہسوار تھے مگر کبھی اپنی کاوش و محنت کا شہرہ نہیں کیا۔ درحقیقت وہ لسان الہند نواب بہادر یار جنگ رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ کی سچی تصویر تھے۔

"ہمیں ان کی ضرورت نہیں جو شجر ملت پر پھول بن کر چمکنا چاہتے ہیں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بنیں، جو زمین میں جذب ہوتی ہے اور جڑوں کو مضبوط بناتی ہے۔ جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتی ہے جو خود فنا ہوتی ہے اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتی ہے۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نظارہ بین نگاہوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں"۔

قادری صاحب نے نواب بہادر یار جنگ کے متذکرہ بالا ارشاد کے مطابق زندگی بسر کی۔ جاہ و جلال، شان و شوکت اور آرائش و زیبائش سے انھیں نفرت رہی۔ قومی خدمت ان کا وظیفۂ حیات تھی، نثرادِنو کی رہنمائی ان کا مطمعِ نظر تھی مشاہیر کی خدمات کو منظرِ عام پر لانا ان کا مشن تھا۔ مسلمان سلاطین، امراء اور والیانِ ریاست کی اسلام دوستی اور انگریز دشمنی کے واقعات کو تاریخ کے سینے میں محفوظ کرنا ان کا وہ عظیم کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ انگریز کے پٹھو مورخین نے مسلمان اکابر کے کردار کو جس بھونڈے اور ناشائستہ انداز میں پیش کر کے تاریخ کو مسخ کیا تھا، قادری صاحب نے بڑے احسن انداز میں حقائق کی روشنی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا۔ حق و صداقت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا جس چیز کو وہ درست اور صحیح سمجھتے، بلا چوں و چرا احاطۂ تحریر میں لے آتے تھے۔ ان کی زندگی "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کی آئینہ دار تھی۔ انھیں کسی سے دشمنی نہ تھی بلکہ

ہر ایک کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی سے ملتے تو یوں معلوم ہوتا کہ خلوص و محبت اور مہر و وفا کے مجسّمہ ہیں۔ وہ نرم دمِ جستجو اور گرم دمِ گفتگو کے حامل تھے۔ غلط بات کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ حقائق کو منظرِ عام پر لانے میں انھیں کسی کی دوستی اور دشمنی کا غم دامن گیر نہ رہا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

علمی خدمت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ بڑی سے بڑی مصیبت بھی انھیں اس راہ سے نہ ہٹا سکی۔ کئی سال قبل جوان بیٹے زبیر حسن قادری کی موت نے انھیں بہت نڈھال کر دیا تھا۔ ان کی صحت اور بینائی پر بہت اثر پڑا۔ ان کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ جوان بیٹے کی مرگ اور پھر باپ کو سکون۔ بھلا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؎

اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا
بہہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

اور پھر بقول میر انیسؔ ؎ دولت کوئی بہتر نہیں دنیا میں پسر سے

کے مصداق قادری صاحب کی متاعِ بے بہا لٹ گئی تھی۔ ان کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ خیال تھا کہ اب وہ نوشت و خواند کا کام نہیں کر سکیں گے مگر قربان جاؤں کہ انھوں نے بیٹے کے غم کو بھلا دیا اور پورے قوم کے بچوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے قدم پیچھے نہ ہٹا اور یہ سمجھتے تھے کہ میرا بیٹا تو فوت ہو گیا ہے، قوم کے بچّے بھی میرے بچّے ہیں مجھے ان کو "ادب برائے زندگی" دینا ہے۔ انھیں نشانِ منزل بتانا ہے۔ انھیں مشعلِ راہ مہیّا کرنی ہے۔ چنانچہ انھوں نے قوم کے غم میں اپنے جواں سال بیٹے کی موت کے غم کو مدغم کر دیا۔ ؎

آرامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

قادری صاحب سے میرے تعلقات کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ اور الحمدللہ کہ ان کے تادمِ آخریں ان تعلقات میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑا بلکہ مزید مستحکم ہوتے گئے۔ انھوں نے مجھ پر بے پہا نوازشات کیں۔ میری ادبی رہنمائی فرمائی۔ میرے شوق کو جلا بخشنے کے لئے مختلف پرچوں میں میری تعریف فرماتے۔ یہ ان کے بزرگانہ شفقت و محبت تھی ورنہ من آنم کہ من دانم۔

۱۹۷۶ء میں میری پہلی کتاب اکابر تحریک پاکستان جلد اول منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی تو انھوں نے بکمال مہربانی یوں تبصرہ فرمایا:

"صوری و معنوی دونوں اعتبار سے قصوری صاحب کی یہ تالیف نہایت قابلِ قدر ہے اور تحریر پاکستان کے لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔"

اسی سال اردو کالج کراچی کے مجلہ "برگِ گل" کے قائداعظم نمبر کے شائع کرنے کا پروگرام بنا تو قادری صاحب سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم قائداعظم اور امیر ملت کے عنوان سے مضمون لکھ کر جلد ارسال کرو۔ تعمیل ارشاد کی گئی۔ میرا مضمون تزک و احتشام سے شائع ہوا۔ اور اس قدر مقبولِ خاص و عام ہوا کہ بعد میں کئی اخبارات و پرچوں نے اسے نقل کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر نمبر کے لئے بھی مضمون لکھوایا جو پوری شان و شوکت سے چھپا۔ نواب بہادر یار جنگ نمبر کی تیاری کا مرحلہ آیا تو پھر مضمون کے لئے ارشاد ہوا۔ میں نے ایک تفصیلی اور تحقیقی مضمون بھیج دیا۔ مگر افسوس کہ یہ نمبر ان کی زندگی میں ظہور پذیر نہ ہو سکا بلکہ کارپردازانِ مجلہ نے اسے اپنے نام سے کتابی صورت میں شائع کر لیا جو مرحوم قادری صاحب کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے بلکہ ان کی روح کو مستقل اور مسلسل ایذا رسانی کے مترادف ہے۔

نیرنگئی سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

۱۹۷۹ء میں میرے بڑے بیٹے اعظم فاروق کا انتقال ہو تو قادری صاحب یہ خبر جس اثر سن کر خون کے آنسو روئے۔ انھیں اپنا مرحوم بچہ بھی یاد آگیا۔ تعزیتی خط میں انھوں نے بڑے

درد انگیز انداز میں مجھے تسلی و تشفی دی۔ میں خط پڑھ کر رو دیتا ہ۔ اور یقین کامل ہے کہ خط لکھتے وقت قادری صاحب بھی آنسو ضبط نہ کر سکے ہوں گے کیوں کہ ہم دونوں کا درد ایک ہی تھا ؎

عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

ان کے دل و دماغ پر میرے بچے کی رحلت کا اثر ہوا کئی خطوط میں مجھے صبر و سکون کی تلقین فرماتے رہے اور یہ مادۂ تاریخ وفات نکال کر ارسال کیا۔ "بوئے غم فرزند"

۱۳۹۹ھ

۱۹۸۲ء میں میری ایک اور کتاب "حضرت امیر ملت اور ان کے خلفاء" مطلعِ ادب پر جلوہ گر ہوئی تو دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس پر قادری صاحب مرحوم نے نہایت محققانہ، فاضلانہ اور مورخانہ مقدمہ لکھ کر کتاب کی حیثیت و افادیت کو چار چاند لگا دئے تھے۔ مقدمہ میں قادری صاحب مرحوم نے نظریۂ پاکستان اور تحریک پاکستان کے مخالفین پر بڑے شستہ انداز میں تنقید بھی کی تھی جو بعض دوستوں کو ناگوار گزری، مگر وہ ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ وہ تو حق و صداقت کے علمبردار تھے، مگر ہائے ؎

افسوس ہم سے چھینے بے مہریٔ قضا نے
وہ علم کے خزینے وہ فضل کے دفینے

میری ایک اور اہم کتاب "اساتذہ امیر ملت"، مکمل ہوئی تو میں نے مقدمہ کے لئے عرض کیا، جسے انھوں نے شرفِ پذیرائی بخشا۔ میں نے مسودہ ارسال کر دیا مگر انھیں عوارضات نے گھیر لیا۔ کچھ افاقہ ہوا تو انھوں نے مجھے لکھا کہ کتاب پر ایک نظر ڈال لی ہے۔ چند دنوں تک مقدمہ لکھ کر واپس کر دی جائے گی مگر افسوس کہ وہ اپنا یہ آخری وعدہ ایفا کرنے سے قبل ہی ٹریفک کے حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اک چہکتے ہوئے بلبل کا گلا گھونٹ دیا
ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

ان کی وفات پر دنیائے علم وادب میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر دل بے قرار اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اپنے تو خیر اپنے تھے مخالفوں کو بھی یہ کہتے سنا گیا کہ

"ایوب قادری خواہ کچھ بھی تھے، بحیثیت مجموعی اچھے آدمی تھے"

سامنے اس کے نہ کہتے تھے جو اب کہتے ہیں

لذت عشق گئی میر کے مرجانے سے

حکومتی ذرائع ابلاغ کا جتنا بھی ماتم کیا جائے اتنا ہی کم ہے کہ ملک کے نامور ماہر تعلیم ممتاز مورخ اور صف اول کے دانش ور کی موت کی خبر ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں میں جگہ نہ پا سکی قومی اخبارات نے بھی سخت بے حسی کا ثبوت دیا۔ صرف چند لفظوں میں موت کی خبر دیدی اور بس۔ کیا مرحوم قادری صاحب کا یہ قصور اور جرم تھا کہ انھوں نے حکام کی آستان بوسی نہیں کی، قصیدہ خوانی نہیں کی، مدح سرائی نہیں کی۔ آج اگر کوئی گویا، بھانڈ اور ثقافت کے نام پر بے راہ روی پھیلانے کے مرتکب ہونے والے مرجائیں تو ہمارے ذرائع ابلاغ شب و روز مرثیہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔ اور اخبارات خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں حکومت کی طرف سے خدمات کا اعتراف کر کے ایوارڈ، تمغے اور انعامات دئے جاتے ہیں مگر مرحوم قادری صاحب کی موت پر کسی کو زبانی تعزیتی کلمات کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

قادری صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے مجھ میں یہ سکت نہیں ہے کہ بیان کر سکوں ان کی موت نے مجھ پر جو اثر ڈالا ہے، ناقابل تحریر ہے۔ ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ پوری دنیائے علم و ادب کی موت ہے، تاریخ و تذکرہ کی موت ہے۔ شرافت و دیانت کی موت ہے اخلاق و مروت کی موت ہے، خلوص و محبت اور مہر و وفا کی موت ہے بلکہ تہذیب و شائستگی کی موت ہے۔

نوشل حسین قدوائی

چند اشکہائے خونیں

موت اگرچہ ایک اٹل حقیقت ہے اور اس فنا پذیر عالم کی ہر شے کا ایک وقت موعود ہے جس میں نہ ایک لمحہ کی تقدیم ہوسکتی ہے اور نہ تاخیر۔ اس لئے کوئی موت بے وقت نہیں آتی تاہم بعض موتیں ایسی ناگہانی اور کربناک طور پر وارد ہوتی ہیں کہ اپنے پیچھے درد و غم کے ناقابلِ اندمال ناسور اور رنج والم کے انمٹ اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ ان میں اس وقت بہت اضافہ ہوجاتا ہے جب بچھڑ جانے والا حسنِ سیرت، جمال، کردار اور اخلاق فاضلہ کا مرقع اور علم و تحقیق کا گوہر کمیاب ہو۔

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی ذات میں ان ہی اوصاف کی نمود تھی۔ وہ فکر و عمل میں سچے مسلمان علمی و تحقیقی کارناموں کے علی الرغم غرورِ علمی سے کوسوں دور۔ متواضع اور سادہ منش۔ خود شعوری کے باوصف فخر و ریا اور نمائشِ ذات سے متنفر اور محترز۔ آج کے دور میں جب آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا وہ انسانیت کے ایسے پیکر لطیف تھے جو ہمہ وقت پر انس و محبت

نچھاور کرتے اور شائستہ اطواری کی عطر بیزیوں سے مشام جان معطر کرتے۔ اپنی تحریر و تقریر۔ دل آویز گفتگو۔ علمی موشگافیوں اور تحقیق کاوشوں سے بڑے بڑے عقدہ ہائے سربستہ کھول دیتے۔ انہوں نے بڑی غواص فطرت پائی تھی جو گہرائی میں اتر کر لآلی تحقیق ڈھونڈ ڈھونڈ کر لے آتی۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب نے بہت کچھ لکھا۔ تراجم کئے۔ مقدمے وپیش لفظ تحریر کئے۔ مستقل کتابیں لکھیں۔ ہر ایک میں تصنیفی رنگ ہے۔ محض تالیف نہیں۔ علمی تحقیق ہے نقل نہیں۔ عمق ہے سطحیت نہیں۔ استدلال ہے بے وزن نہیں۔ وہ چاہتے تو اپنی تصنیفات کی تعداد بہت بڑھا لیتے کیونکہ علمی مشغلہ ہی ان کا واحد ذوق تھا اور ہر وقت اسی فکر میں وہ کھوئے رہتے مگر ان کی علمیت ان کا تحقیقی مزاج اس بات سے ابا کرتا تھا کہ عام انداز کے مطابق اخذ و اقتباس کتب سے ایک کتاب ترتیب دے لیں۔ وہ کسی کی بات اور رائے کو چھلنے پھٹکے اور تنقید کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول کرنے کے قائل نہ تھے۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب کی تحریروں پر اظہارِ خیال مجھ جیسے لوگوں کے لئے چھوٹا منہ بڑی بات کے مماثل ہے۔ یہ کام ان کے قریبی صاحبانِ علم کے کرنے کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسے بہ حسن و خوبی انجام دیں گے۔

یوں بھی مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کے باعث ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور سے زیادہ قربت کی سعادت حاصل نہ رہی اس لئے ان کی علمی کاوشوں سے مجھے زیادہ واقفیت بھی نہیں ہے۔ تاہم ان کی تصنیفات میں سے جو کچھ میری نظر سے گزری ہیں میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ اعلیٰ پایہ کی یادگار زمانہ ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ انسانی محاسن اور علمی کمالات کا کوئی شخص جامع ہو۔ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم انسانی لحاظ سے بڑے مخلص باوضع

مرقع شرافت اور فضائلِ اخلاق سے آراستہ تھے اور اس اعتبار سے میری نگاہ میں ان کی ہستی بڑی قابل قدر تھی۔ ان کی موت سے انسانی حلقہ میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ مشکل ہی سے پر ہو سکے گا۔ جہاں تک میدانِ علم و تحقیق کا تعلق ہے وہ تو "موت العالِم، موت العَالَم" کے مصداق ہے صاحبان علم بہت ہیں۔ ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے مگر ایسے جنہوں نے اپنی خواہشات اپنے تمام ذوق اور اپنی تمام مرغوبات کو علم و تحقیق میں مرتکز کر دیا ہو اور من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی بن گئے ہوں کتنے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔

کاش قضائے الٰہی انہیں کچھ اور موقع دیتی کہ یہ علمی غنچہ جو کھل گیا تھا پوری طرح کھل کر چمنِ علم کو اپنی جانفزا مہک سے معطر کرتا رہتا مگر مشیت ایزدی کے سامنے ہم کیا اور ہماری خواہش کیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات قبول فرمائے اور انہیں اپنی رحمت و مغفرت کی چادر میں ڈھانک لے۔

منور الاسلام صدیقی

پیکرِ علم و عمل ـــ ایوّب قادری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے میری شناسائی تو بہت عرصہ پہلے سے تھی لیکن ان سے قرب
"ادارۂ تحقیق و تصنیف" کے تعلق سے حاصل ہوا۔ ایوب قادری کا جسم علمیت تھا اور
روح "تحقیق" تھی جبکہ میں ایک بے مایہ انسان جس کا نہ علم سے تعلق نہ تحقیق سے کوئی واسطہ
پھر وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں تھے اس کا علم سوائے خدا کے اور ان کے کسی کو نہیں۔ البتہ اس کا
عملی اظہار اس طرح ہوا کہ جب انھیں "ادارۂ تحقیق و تصنیف" کا معتمد عمومی بنایا گیا تو انھوں نے
مجھے میری تمام کوتاہیوں کے باوصف "معاون معتمد" بنا کر اپنے اور قریب کر لیا۔

میں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں چھ سال گزارے اور اس مدّت میں ان متعدد
علمی شخصیتوں سے واقفیت حاصل کی جو تحقیق میں مصروف تھے۔ ان کو دیکھ کر میں محققین
کے بارے میں یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ وہ سطور کا مطالعہ کرتے رہنے اور بین السطور کو
اپنی گرفت میں لیتے رہنے کے سوا زندگی کے دوسرے کاموں کے لئے قطعاً نا اہل ہوتے ہیں۔
لیکن ایوب قادری مرحوم کے طرزِ زندگی نے مجھے یہ رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کو
اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ میں ایک محقق اور مصنّف ہونے کے علاوہ ایک بیٹا،
ایک بھائی، ایک شوہر اور ایک باپ بھی ہوں۔ اس احساس نے ان کو کبھی بھی گھریلو
زندگی سے لاتعلق نہیں ہونے دیا۔ ان کی علمی سرگرمیاں کبھی بھی گھر والوں کے لئے مایوسی
کا سبب نہیں بنیں۔ وہ دوستی کو بھی نبھانا جانتے تھے۔ اور استاد ہونے کی حیثیت سے
وہ اپنے شاگردوں کی مدد اور رہبری کرنا بھی اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ طلبہ بھی دل کی

گہرائیوں سے اُن کی عزت کرتے تھے۔

قادری صاحب مرحوم سے ملاقات ادارہ تحقیق و تصنیف کی ماہانہ نشستوں میں ہی ہو پاتی تھی۔ نجی ملاقاتوں کے مواقع کم ملتے تھے۔ کبھی کبھی وہ جناب ثناء الحق صدیقی کی معیت میں غریب خانے پر بھی تشریف لے آتے تھے۔ میں بھی بھاگتے دوڑتے کبھی کبھی ان کے دولت خانہ پر حاضری دے آتا تھا۔ کسی قدر اطمینان کے ساتھ اُن سے تبادلۂ خیالات کا موقع اُس وقت ملا جب انھوں نے اپنے صاحبزادے کو میرے اسکول میں داخل کرایا۔ اُس کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے ہفتہ عشرہ میں وہ میرے دفتر آجاتے تھے اور وہاں اُن سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو ہو جاتی تھی۔

ایوب قادری مرحوم کے علمی کارنامے اَن گنت ہیں لیکن جس قدر قلیل مدت میں انھوں نے یہ کارنامے انجام دئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر زندگی اُن سے اور کچھ دن وفا کرتی تو وہ ملک و ملت کے لئے اور بھی بہت کچھ کر جاتے۔

آج ایوب قادری کی تواضع کے لئے نہ تو چائے کی پیالی ہے اور نہ اُن کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے کوئی تحفہ۔ صرف چند آنسو ہیں وہ بھی ایسے جنھیں پلکوں پر آنے کا یارا نہیں ہے۔ آہ! اے دوست!!

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

سیّد مصطفٰے علی بریلوی:

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کی یادیں

اچانک معلوم ہوا کہ مشہور محقق اور مورخ ڈاکٹر پروفیسر محمد ایوب قادری ٹریفک کے حادثہ میں وفات پاگئے۔ دل دھک سے رہ گیا اور کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ کراچی کی علمی صحبتوں کی جان دوستوں کے دوست اور زبردست قومی درد رکھنے والے پروفیسر ایوب قادری مرحوم ہوگئے۔ تصویر دیکھی تو شک یقین میں بدل گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ پروفیسر قادری حقیقی معنوں میں علمی شخصیت تھے ان کو اپنے کام اور مقصد سے گہرا لگاؤ تھا۔ ابھی ڈھائی سال قبل ان کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ قادری کا جوان العمری میں ٹریفک ہی کے حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ اسی طرح چند سال قبل ان کے جوان صاحبزادے زبیر میاں کی اچانک رحلت ہوئی لیکن ان جان کاہ حادثات کے باوجود ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ لیکن موت کے آگے بے بس ہوگئے اور بے شمار علمی، تعلیمی منصوبوں اور پروگراموں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ عم محترم سید الطاف علی

بریلوی' قادری صاحب کی زمانۂ طالب علمی سے قدر کرتے چلے آئے تھے۔

قادری صاحب نے مجلس ترقی ادب کی فرمائش پر مآثر الامرار کا ترجمہ کئی جلدوں میں کر کے اہل علم سے داد و تحسین حاصل کی انہوں نے ایک مجلس تحقیق کراچی میں اپنے مخصوص احباب کے تعاون سے قائم کی تھی جس کی رکنیت کا راقم السطور کو بھی شرف حاصل تھا۔ اس جماعت کی جانب سے" میر و سودا کا دور' اور بزم انجم' حضرت جہانیاں جہاں گشت اور متعدد کتابیں شائع ہوئیں جن میں میرا ایک کتابچہ" غلام قادر روہیلہ" بھی شامل تھا۔ قادری صاحب کی وہ معرکتہ الآرا کتابیں ماسوا ہیں جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نیز بعض دیگر اداروں نے شائع کیں۔

پروفیسر ایوب قادری ذاتی سواری نہ ہونے کے باوصف اہل علم سے مسلسل رابطہ رکھتے تھے۔ شب و روز ان کو ایک ہی دُھن رہتی تھی کہ کسی نامور مگر گم نام ہستی کا تعارف کرائیں۔ کسی معرکہ کی کتاب کی ترتیب نو کریں۔ یا اپنی متعدد زیر تصنیف کتابوں کے واسطے مواد مہیا کریں۔ اس دوران وہ ریسرچ اسکالروں اور ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی رہنمائی و معاونت بھی چلتے پھرتے کرتے رہتے تھے۔ خطوط کا جواب بڑے اہتمام سے دیتے تھے۔ میرا ان کا چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ ساتھ رہا۔ اسلام آباد میں تین چار کانفرنسوں میں شرکت کے دوران اکثر ایک ہی کمرہ میں ساتھ رہے۔

پروفیسر ایوب قادری کا حلقۂ احباب انتہائی وسیع تھا۔ اس میں بڑی بزرگ ہستیوں کے علاوہ نئی نسل کے طالبانِ علم کا بھی ایک

بڑا طبقہ شامل تھا۔

قادری صاحب ایک سیلف میڈ آدمی تھے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے کافی محنت و ریاضت کی اپنی تعلیم کی تکمیل کے ساتھ روزی روزگار اور خاندان کی پرورش و نگہداشت کے فرائض بھی انجام دیتے تقریباً سات سال مرکزی حکومت کے محکمہ سول سپلائیز کے دفتر سے منسلک رہے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے آرگن "العلم" سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ محترم سید الطاف علی بریلوی صاحب ان کی محنت و لیاقت کے دل سے معترف تھے چنانچہ اب سے تیس سال قبل انہوں نے قادری صاحب کے ایک معرکتہ الآرا مقالے "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا"، "روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات" "العلم" میں شائع کرتے ہوئے لکھا تھا!

لائق مضمون نگار نے اپنے مقالہ کی تیاری میں جیسی محنت شاقہ کی ہے اس کی داد وہ تمام حضرات دیں گے جن کو کبھی اس قسم کی تحقیقی چیز لکھنے یا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے ۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر ایوب قادری کو غریق رحمت فرمائے۔ آمین۔

مسرور احمد توقیر صدیقی

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم

ڈاکٹر ایوب قادری کی موت دراصل ایک سدا بہار شخصیت، ایک منفرد انداز فکر اور ایک مخصوص دور کی موت ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بااصول انسان تھے۔ تعلقات نبھانے والے اور بڑے رکھ رکھاؤ کے مالک تھے۔ میری اُن کی ملاقات پہلی مرتبہ کتب خانہ خاص میں ۱۹۷۶ء میں ہوئی جب میں انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ مرحوم افسر امروہوی صاحب نے میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے یہ کہہ کر کرائی "توقیر صاحب یہ ڈاکٹر ایوب قادری ہیں۔ فنافی العلم، تحقیق کے مرد میدان اور معلومات کا چلتا پھرتا خزانہ" میری گفتگو صرف چند منٹ ہی ہوئی لیکن ان کی شخصیت کے انمٹ نقوش دل پر مرتسم ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ تقریباً روز کاظمی صاحب مرحوم کے پاس آتے تھے اور دوسرے تیسرے دن کتب خانہ میں ضرور تشریف لاتے۔ یہ تشریف آوری صرف مطالعہ ہی کی غرض سے نہ ہوتی تھی بلکہ احباب سے تبادلۂ خیالات بھی مقصود ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ ان کے شب و روز کا بیشتر حصہ مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔ ان کا مطمح نظر وقت کی ضروریات کے مطابق طالبانِ علم کے لئے آسانیاں فراہم کرنا تھا۔ ان کی طبیعت دقت پسندی کی طرف مائل تھی یہی وجہ تھی کہ تحقیق ان کا خاص موضوع تھا۔ جس جانفشانی اور محنت کے ساتھ وہ اس مشکل کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے اور اُن کی محنت کے جو نتائج منظرِ عام پر آتے رہتے تھے اُن کو دیکھتے ہوئے اکثر و بیشتر یہ خیال ذہن میں آتا تھا کہ اپنے فرائضِ منصبی اور دیگر مصروفیات کے بارِ گراں کے ساتھ ساتھ ادبی مشاغل کے لئے وقت کیسے نکال لیتے تھے۔ چنانچہ ایک ملاقات میں یہی سوال میں ڈاکٹر صاحب سے کر بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور فرمایا " جو شے انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اس کے لئے وقت نکال لینا کوئی مسئلہ نہیں "۔ امرِ واقعہ ہے کہ آدمی جو کرنا چاہتا ہے کسی نہ کسی طرح اس کے لئے وقت نکال ہی لیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تعلقات نبھانا خوب جانتے تھے اور وعدے کے بڑے پکے اور سچے تھے۔ جب کبھی میں نے کوئی درخواست کی اور انہوں نے وعدہ کیا پورا کیا صاف گوئی ان کی فطرت کا بڑا روشن پہلو تھا۔ جو کچھ ممکن نہیں سمجھتے تھے اسی وقت انکار کر دیا کرتے تھے اور یہی بات تھی جس نے مجھے ان کے زیادہ قریب کر دیا تھا۔

جب کتب خانہ میں تشریف لاتے یہی کہتے " تو قیر صاحب کونسا نیا کام شروع کیا ہے۔ میں تو آجکل فلاں کتاب کی تکمیل میں لگا ہوا ہوں "۔ ایک خاص خوبی ڈاکٹر صاحب میں یہ تھی کہ اگر کوئی بات دریافت طلب ہوتی تو چھوٹے اور کم پایہ لوگوں سے دریافت کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور اگر کچھ دریافت کیا جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے بتاتے اور اس پر تفصیلی

روشنی ڈالتے۔

گو آج ڈاکٹر صاحب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اُن کے ادب پارے جن کی اچھی خاصی تعداد ہے اُن کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ طالبانِ علم اُن سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور یوں وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

محمد مبین

آہ استاذی!

محترم ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مورخہ ۲۶ نومبر کے روزنامہ "جنگ" میں یہ خبر پڑھ کر دھچکا لگا کہ "ممتاز اسکالر اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری ٹریفک کے حادثے میں انتقال کر گئے۔ مرحوم بڑے وضع دار انسان تھے اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔"

یہ میری بدقسمتی کہ ان کی وفات پر کراچی میں نہیں تھا، آخری رسومات میں شرکت سے محرومی کا قلق مجھے تا زندگی رہے گا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ راقم ان کا شاگرد ہی نہیں بلکہ ان کے بیٹے کا دوست بھی ہے جس کے باعث مرحوم میرے ساتھ بیٹوں اور چھوٹے بھائیوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ قادری صاحب پر کچھ لکھنے سے قبل کئی دنوں تک یہ سوچتا رہا کہ مرحوم پر کیا لکھوں ہماری ملاقات کچھ زیادہ پرانی نہیں صرف ۵ سال کی ہے مگر استاذی مرحوم کی شخصیت نے حافظے پر ان گنت لافانی نقوش چھوڑے جن کو دہرانے کو چند اوراق کیسے؟ ذہن و قلم کسی طور پر ان کو مرحوم

ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔ ہم تہی دامن سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پر مختلف اخبارات میں مختلف اوقات میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے یہ اس غم کا احاطہ تو نہیں محض روایتی طور پر نیک تمنائیں اور دلی جذبات کے ساتھ مرحوم کے وارثوں کے ساتھ شامل ہیں۔ وقت بہت ویران اور اداس ہے اور ہم ان لمحات کی بازگشت ہی کیا سے کیا ہو جائیں گے۔ وقت کے ریلے بہت ظالم ہوتے ہیں سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں اور اس میں ہم جیسے لوگ بچھڑنے کے لئے رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب رہ۔ ساکن ضلع کے قصبہ آنولہ میں بروز چہار شنبہ ۲۸ رجولائی ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے ۱۹۳۹ء میں پرائمری اچھے نمبروں سے پاس کیا اور وظیفہ کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ تین سال بعد ۱۹۴۲ء میں اردو مڈل کا امتحان درجہ اول سے پاس کیا ۱۹۴۷ء میں یوپی بورڈ سے ہائی اسکول کا امتحان درجہ اوّل سے پاس کیا۔ اس زمانہ میں آنولہ میں کوئی قابل ذکر کالج موجود نہ تھا لہٰذا قادری صاحب بدایوں تشریف لے گئے اور اسلامیہ کالج سے انٹر کا امتحان ۱۹۵۰ء میں پاس کیا اسی سال ترکِ وطن کیا اور پاکستان تشریف لائے ابتدائی چند ماہ ضلع دادو میں قیام پذیر رہے پھر کراچی آگئے اور ۱۲ر ستمبر کو وزارت صنعت میں سپلائی اینڈ ڈولپمنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو کر عملی زندگی کا آغاز کیا اس کے ساتھ ساتھ ان کا علمی ذوق کتب بینی سے لعلِ بے بہا سمیٹنے لگا۔ چنانچہ جب سید الطاف علی بریلوی نے بھارت سے ہجرت کر کے کراچی میں توطن اختیار کیا اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

قائم کی اور ساتھ ہی اس کا ترجمان سہ ماہی "العلم" جاری کیا۔ اس سہارے نے ان کو مہمیز کیا اور قادری صاحب کے مضامین سہ ماہی 'العلم' میں شائع ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ برقرار رہا۔ ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ پھر ۱۹۶۲ء میں جامعہ کراچی سے ایم۔ اے درجہ اوّل میں پاس کیا اس ہی زمانے میں ان کی پہلی تصنیف "فیض احمد بدایونی" شائع ہوئی یہ اگرچہ ۴۰ صفحات پر مشتمل کتابچہ ہے مگر تحقیقی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

قادری صاحب ۱۹۵۷ء تک سرکاری ملازمت میں رہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے باعث ہسٹاریکل سوسائٹی کے معتمد جناب معین الحق صاحب نے مرحوم کو اپنے ادارے میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت دی، تقریباً آٹھ سال اس ادارے سے منسلک رہے یہ زمانہ ادارہ کے عروج کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ستمبر ۶۲ء سے مارچ ۶۳ء تک اردو کالج میں جز وقتی استاد شعبۂ اُردو کی حیثیت سے منسلک رہے۔ مگر ۵ مارچ ۶۳ء سے یہ تعلق مستقل ہوا اور آخر دم تک رہا۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۵ء میں اردو کالج کی جانب سے ہلال اردو تمغہ کالج ٹیچر ایسوسی ایشن کی طرف سے ۷۶ء میں اکیڈمک ایوارڈ اور اسی سال اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے قائد اعظم کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے تمغۂ قائد اعظم حاصل کیا اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی تاریخی اور ادبی کانفرسوں میں

ممتحن کی حیثیت سے شرکت کی۔

قادری صاحب نے ایم۔ اے کے فوراً بعد ہی ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرالیا تھا۔ مگر مشغولیات کے باعث اپنے موضوع پر کام جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۷۸ء میں دوبارہ متوجہ ہوئے اور حافظے کو قرطاس پہ "اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک)" کے عنوان سے ترتیب دے کر جامعہ کراچی میں پیش کیا، مشہور ادیب و محقق استاذی محترم جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نگراں اور محترم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے مشاہیر ان کے ممتحن تھے۔ انہوں نے مقالہ کو بے حد پسند فرمایا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے منظور کئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ جامعہ کراچی نے ۱۹۸۰ء میں استاذی مرحوم کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دینے کا اعلان کیا۔

قادری صاحب کو مطالعہ کا شوق طالب علموں جیسا تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ دیکھنے کے قابل ہے جس میں نادر و نایاب نسخوں سے لے کر تازہ ترین تصانیف سب ہی ملیں گی۔ اس خطے میں ایسے باذوق کم ہی ملیں گے جن کے پاس کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہوگا۔ مطالعے کے شوق تحقیقی انہماک اور علمی مصروفیت کے ساتھ قدرت نے حافظہ بھی غضب کا دیا تھا۔ دقت نظر اور تعمق فکر کے علاوہ قوت استدلال بھی ایسی ہے کہ جو دلیل ہے اٹل جو جواب ہے مسکت۔

قادری صاحب کا معمول تھا کہ کالج سے واپسی پر ردّی فروخت کرنے والوں کے ٹھیلوں خاص طور سے ناظم آباد چورنگی اور لیاقت آباد چلے جاتے تھے اور گھنٹوں اپنے مطلب کی کتابیں چھانٹتے رہتے کالج سے تعلق کی بنا پر

ہماری اکثر ملاقاتیں وہیں ہوتی تھیں اس طرح مرحوم نے اپنے پاس نایاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ کتب کا اس ذوق و شوق سے جمع کرنا ان کے علمی ذوق کی تسکین کا باعث تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے تقریباً دو[۲] درجن کتابوں کا ادبی ورثہ چھوڑا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(تالیفات)

۱۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ ۱۹۶۳ء
۲۔ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ ۱۹۶۶ء
۳۔ ارباب فضل و کمال۔ ۱۹۷۰ء
۴۔ تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ۔ ۱۹۷۱ء
۵۔ جنگ آزادی۔ ۱۸۵۷ء پر جامع تصنیف ۱۹۷۶ء

تراجم۔

۶۔ مجموعہ وصایا اربعہ۔ ۶۴ء
۷۔ فرحت الناظرین
۸۔ مآثر الامراء جلد اول، جلد دوم اور جلد سوم ۷۰ء
۹۔ سیر العارفین ۱۹۷۶ء
۱۰۔ طبقات اکبری جو مرکزی اردو بورڈ شائع کرے گا۔

ترتیب و حواشی۔

۱۱۔ وقائع عبدالقادر خانی المعروف علم و عمل ۲ جلد ۱۹۶۰ء
۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند ۱۹۶۱ء
۱۳۔ تواریخ عجیب عرف کالا پانی۔ ۶۵ء

۱۴۔ عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ ۶۶۵ء

۱۵۔ مقالات یوم عالمگیر۔ ۶۶۶ء

۱۶۔ تذکرہ نوری۔ ۶۶۸ء

۱۷۔ مرقع شہابی ۶۷۹ء

۱۸۔ جنگ نامہ آصف الدولہ۔ ۶۱۹۸۰ء

۱۹۔ غالبؔ اور عصر غالب۔ آخری کتاب ہے جو فروری ۶۸۲ء میں لکھی۔

ان کتب کے علاوہ پی۔ ایچ ڈی مقالہ اشاعت کے لئے تیار تھا مگر مرحوم کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ مذکورۂ بالا تمام کتب اپنی جگہ اہم ہیں۔ مگر سب سے قابل ذکر کتاب مآثر الامرا ہے جس میں مرحوم کی جانفشانی، محنت اور ترجمہ کی صلاحیت اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ مرحوم اگر کچھ اور بھی نہ لکھتے تو دنیائے ادب میں مآثر کے باعث امر ہو جاتے۔

ڈاکٹر صاحب نے پاک و ہند کے تحقیقی مجلّوں اور رسالوں میں مستقل اہمیت کے حامل مضامین لکھے تقریباً ۳۵ کتابوں پر مقدمات اور دیباچے تحریر کیے۔ علمی اور ادبی صحافت میں بھی دخل رہا۔ ماہنامہ سرحد کراچی کے اعزازی نگران، سہ ماہی "بصائر" کراچی کے اعزازی نائب مدیر اور اردو آرٹس کالج کے مجلہ "برگ گل" کے ایک عرصہ تک نگراں رہے۔ ان کے زیر نگرانی سرسید نمبر (نقش ثانی) تعلیمی پالیسی نمبر اور قائداعظم نمبر شائع ہوئے۔ اسی طرح سہ ماہی "العلم" کراچی کا غالبؔ نمبر انھوں نے مرتب کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو زور بیان پر قدرت دی تھی۔ بآواز بلند جب وہ درس و تدریس میں مشغول ہوتے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر

ہو جاتے تھے۔ مزاجاً کھرے اور کھرے انسان تھے یہی وجہ ہے کہ زمانے کی منافقت سے صلح نہ کر سکے سچائی کا علم بلند کئے تمام عمر زمانے سے ٹکراتے رہے اور اسی طرح وفات پا گئے۔

تحقیق و تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک اچھے تنقید نگار کے لئے تحقیق و مطالعہ کا ذوق بھی اس کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے ڈاکٹر صاحب کے ہاں اس کا حسین امتزاج نظر آتا ہے انہوں نے تحقیق و تنقید میں توازن رکھا۔ تحقیق کے ساتھ ان کا تنقیدی شعور اتنا بالیدہ ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کے تحقیقی مضامین لکھتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض بڑے محققین کے تحقیقی مضامین واقعات کی کھتونی بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کو ادب میں مقام تو حاصل ہے مگر عوام الناس میں وہ منزلت حاصل نہیں مگر ڈاکٹر صاحب تحقیق و تنقید جیسے خشک موضوع کو بھی اپنے اندازِ بیان سے دلکش بنا دیتے ہیں انہوں نے اپنے تنقیدی شعور و تجربے کے سہارے ادب کی صحیح راہیں متعین کی ہیں۔ تحریر میں ڈھیلا پن، ابہام، اہمال یا ژولیدگی کا شائبہ بھی نہیں، متانت و سنجیدگی صاف گوئی اور بے باکی نمایاں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی محقق و نقاد، تخلیقی تنقید و تراجم پر اسی وقت عمل پیرا ہو سکتا ہے جب وہ خود بھی تخلیق کار کی ذہنی کیفیات کو خود پر مسلط کر کے ان کی قلب و روح کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ ایسا کام وہی انجام دے سکتا ہے جو خود بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ یہ سب باتیں ہم کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں نمایاں نظر آتی ہیں۔

طلباء کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی طور پر مشفقانہ تھا۔ وہ طلباء کا بہت احترام کرتے تھے ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ دوسرے اساتذہ بھی

طلباء کا احترام کریں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ راقم الحروف اپنا ایک مضمون لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گرمیوں کے دن تھے مرحوم چاندنی رات سے لطف اندوز ہو رہے تھے سعید (بڑے بیٹے) سے کہنے لگے مبین کو اوپر لے آؤ۔ میں اوپر پہنچا۔ دیکھا کہ ملک کا مایۂ ناز دانشور محقق و نقاد مجسم صوفی منش دھوتی اور بنیان پہنے چارپائی پر لیٹے تھے مجھے قریب ہی بٹھالیا۔ آمد کا مقصد پوچھا میں نے مضمون دکھایا۔ پڑھ کر کہنے لگے اچھا ہے قومی زبان میں دیدو۔ ہاں تمہارا مقالہ (بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ادبی کارنامے) پڑھا اچھا ہے مگر کچھ خامیاں بھی ہیں۔ کچھ موضوعات تشریح طلب ہیں ان کو درست کر دو اس کے بعد شائع کرانا اس کا دیباچہ میں لکھوں گا۔ یہ مولوی صاحب سے عقیدت تھی جس کا اظہار مرحوم نے کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے میں سعید سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور کھرے لہجے میں کہا "نعیم (شاگرد) سے کہنا لاپروائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اتنا عرصہ ہو گیا اور تم نے اپنا مقالہ جمع نہیں کرایا۔ میں گھر بھی آیا تھا مگر صاحب گھر پر موجود نہیں تھے"۔ یہ مرحوم کا ایک خاص انداز تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا " مجھے غصہ نعیم پر نہیں بلکہ اس بدتمیز کنڈکٹر پر ہے جس نے مجھے برا بھلا بھی کہا اور ساتھ ہی اوپر کی طرف دھکا بھی دیا اسی دوران میری گھڑی بھی گر گئی، افسوس یہ نہیں کہ گھڑی کھو گئی بلکہ یہ ہے کہ کنڈکٹر حد درجہ بدمزاج تھا۔

ڈاکٹر صاحب تمام عمر کتابوں میں کھوئے رہے۔ وہ ایک محقق بھی تھے اور معلم بھی اور ایک اچھے معلم کی پہچان یہی ہے کہ وہ یکسو

اور یک گیر ہو۔ انہوں نے ۴۲ برس سے قلم کاری کی جو مرتے دم تک جاری رہی، وہ ایک اچھے طالب علم اور درس و تصنیف میں اچھے معلم اور صاحبِ طرز مصنف تھے۔ ان کی صلاحیت کا اندازہ حقیقی معنوں میں تحقیق و تصنیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ان کی یاد مدتوں ان کے احباب، ان کے اعزا اور شاگردوں کو ستایا کرے گی۔

سیّد اوصاف علی واحدی

پروفیسر ایوّب قادری مرحوم

جمعہ کی صبح کو "نقاشِ فطرت" ایم۔ اسلم کے انتقال پرُ ملال کی خبر پڑھی تھی۔ ان کے مرنے کا بڑا افسوس تھا۔ کیونکہ ایم۔ اسلم میرے پسندیدہ ناول نگار تھے۔ کچھ عرصے تک اُن سے میری خط وکتابت بھی رہی تھی۔ اگلے دن اخبار جنگ میں جب یہ خبر میں نے پڑھی کہ "ممتاز اسکالر اور نقّاد پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے تو دل نے دوسرا بڑا صدمہ محسوس کیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تفصیل دیکھی تو بہت افسوس ہوا کہ ایک نامعلوم سفید سوزوکی نے ان کی پیشانی پر سخت ٹکر ماری اور شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر، سوزوکی موقع سے فرار ہوگئی! دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اہلِ علم کو اس بے دردی سے مرتے دیکھ کر حرکت میں نہ آئے اور عبرت ناک سزا نہ دے! کیونکہ اس طرح علمی دنیا کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا ہے۔ علمی اثاثہ کی بربادی دراصل قوم کی تباہی کے ہم معنی اقدام ہے۔

یہ کس قدر الم ناک اور انسانیت سوز واقعہ ہے کہ قوم کو ایک نظریاتی اور علمی شخصیت سے محروم کر دیا جائے اور پھر بھی نظام معاشرت متاثر نہ ہو۔ یہ کیسی بے حسی ہے کہ ممتاز علماء وحکماء کے مرنے پر ملّت صرف آنسو بہا کر خاموش ہو جائے اور حادثاتی موت سے بچانے کا صحیح پروگرام مرتّب ہو کر "عمل" میں نہ آئے۔ اس اہم پہلو کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ خاص کر اس لئے بھی شہر کراچی میں حادثات روزمرّہ

زندگی کا معمول بن چکے ہیں۔ ہم سب کو غور کرنا چاہیئے کہ اس طرح کتنے گھرانے آن واحد میں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور اہلِ فکر و نظر کے مرجانے سے کتنا زبردست علمی و ادبی اور قومی نقصان ہوتا رہتا ہے۔

پروفیسر ایوب قادری مرحوم کے بارے میں واحدی صاحبؒ کی زبانی غائبانہ تعریفی کلمات سن چکا تھا اور اس سے بھی باخبر تھا کہ ایوب قادری ایک بڑے محقق، ادیب اور اردو کالج کراچی میں اردو کے استاد ہیں۔ ادب اور ادیبوں دونوں سے شغف رکھتے ہیں۔ کثیر المعلومات، جامع العلوم شخصیت ہیں۔ مگر دیکھنے اور ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۹ء کا ذکر ہے کہ عید کے دوسرے دن واحدی صاحب کی قیام گاہ پر اُن سے ملاقات کی مسرّت بھی حاصل ہوگئی۔ یہ بڑی خوش گوار شام تھی اور اس ملاقات کا دل و دماغ پر بڑا اچھا اثر ہوا تھا وہ وقت ہنسی خوشی سے کٹا۔ مگر اس وقت میں اب بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا یا کوئی افسانہ تھا جو روبرو آگیا تھا حقیقت بن کر۔ مگر ابھی میرا حافظہ جوان اور صحت مند ہے میں نے خواب نہیں زندگی کی حقیقت دیکھی تھی۔ ایک ایسی حقیقت جو افسانے اور خواب دونوں سے زیادہ پُر کیف اور پُر کشش ہوتی ہے!

ایک اچھے انسان سے ملاقات کا تاثر دیرپا اور گہرا ہوتا ہے۔ دل کش انسانوں کی باتیں بھی بڑی دل کش ہوتی ہیں۔ اُن کے سننے میں وہی لطف و سرور آتا ہے جو کسی رنگین شعر کو پڑھنے یا سننے کے بعد دل و دماغ پر سرخوشی بن کر چھا جاتا ہے۔ یعنی ہمیں زندگی و شگفتگی کے علاوہ جذباتی زندگی میں وہی سرور و نشاط محسوس ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایوب قادری مرحوم کی مثال ایک ایسے آدمی کی سی تھی۔

ایوب قادری مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے! انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ استاد کی طبیعت میں شفقت نہ ہو تو استادی کیا؟ خود بھی خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ممتاز عالم تھے مگر شخصیت میں بڑی سادگی اور وقار تھا۔ محقق اور عالم اس رتبے کے تھے کہ بقول ملّا واحدی ایک مرتبہ ایک مذہبی مسئلے پر نیاز جیسے فاضلِ وقت کو اپنی علمی معلومات سے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بحث عربی لٹریچر کی بابت تھی کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے۔ ایوب قادری نے عربی ادب زبان کی قدیم تاریخ کی روشنی میں، فلسفہ و منطق کی رو سے اور کتابِ الٰہی سے یہ بھی ثابت کر کے دکھلا دیا تھا۔ اور بقول ملّا واحدی مرحوم بحث میں نیاز کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ انھیں پسینہ آگیا۔ چنانچہ نیاز فتحپوری کی موت کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں واحدی صاحب سے کہا تھا کہ "واحدی صاحب! غور فرمائیے۔ نیاز منکرِ قرآن ہو گئے تھے اور معاذ اللہ قرآن کو تصنیفِ رسول بتاتے تھے، مگر اللہ کی شان دیکھئے، لوحِ مزار پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ "لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ"

ایوب قادری مرحوم عربی اور فارسی خوب جانتے تھے۔ خاص کر فارسی میں تو ایسی اچھی بصیرت اور قدرت تھی کہ ضخیم کتب کا اردو زبان میں نہایت جامع اور با محاورہ ترجمہ کیا ہے۔ عہدِ مغلیہ کے دور کی ایک کتاب مآثر الامرا کا ترجمہ اتنا کامیاب اور سلیس کیا ہے کہ ترجمے میں اصل کی شان جھلکتی ہے۔ یہ کتاب میں نے واحدی صاحب کے پاس دیکھی تھی۔ فرماتے تھے، اس ترجمے پر ایوب قادری کو پانچ ہزار روپے انعام ملے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اردو زبان کے مزاج اور فنِ ترجمہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی لئے اُن کے تراجم میں افکار کی پاکیزگی اور زبان اردو کی دل کش اداؤں کی روح سمٹ کر مسکرانے لگتی ہے۔ اور اردو زبان و ادب میں خود بخود قابلِ قدر اضافے ہوتے

جانتے ہیں۔ واحدی صاحب مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "عام طور پر آدمی جو کچھ لکھتا ہے، کچھ عرصے بعد اپنا لکھا ہوا بھول جاتا ہے۔ مگر ایوب قادری کا بڑا وصف یہ ہے کہ اپنا لکھا ہوا یاد رکھتے ہیں۔ ان کا حافظہ ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ وہ بہترین تنقید نگار بھی ہیں۔" مگر دیکھئے! اس ٹھوس لیاقت وقابلیت کے باوجود ان کی سادگی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ انسان جو ہمارے قریب کھڑا تبسم کناں ہے، ایک جامع العلوم پروفیسر ہے۔ یہ دراصل ایک بڑے عالم کی صحیح پہچان ہے کہ وہ سراپا انکسار و تواضع ہو۔

ایوب قادری بہت بڑے ادیب بھی تھے، مگر وہ ہم جیسے عام نیاز مندوں پر دھونس نہیں جماتے تھے بلکہ اُن کو سر آنکھوں پر بیٹھاتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ میری علمی ترقی سے انھیں فطرتاً مسرت ہوتی تھی۔ اس بات کا اندازہ مندرجہ ذیل خط سے لگائیے، جو انھوں نے ۳ر فروری ۱۹۷۴ء کو میرے بی۔ ایڈ کے امتحان میں کامیابی کی اطلاع پا کر لکھا تھا:

"عزیز محترم ۔ سلام و رحمت

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ آپ نے بی۔ ایڈ میں کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں ہر مرحلے میں کامیابی عطا فرمائے۔

اس اطلاع سے اور بھی خوشی ہوئی کہ آپ ایم۔ اے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ محنت اور شوق کامیابی کی ضامن ہے۔ میں شام کو کالج میں پانچ بجے کے بعد ملتا ہوں۔ کسی روز وہیں ملئے۔ باتیں ہوں گی۔"

مخلص ۔ محمد ایوب قادری

یہ مختصر نامہ کس قدر پاکیزہ خیالات اور پُرخلوص جذبات سے بھرپور ہے!

اس موقع پر میں یہ عرض کردوں کہ ایوب قادری مرحوم کی دلی تمنّا تھی کہ اردو میں ایم اے کرنے کے بعد میں پی ایچ ڈی کروں۔ یعنی پہلے کالج پہنچ جاؤں پھر جامعہ کراچی میں، مگر افسوس میرے فسانۂ ہستی کے وہ اوراق محرومیوں سے لبریز ہیں، جب میں نو عمر تھا۔ بی اے کرنے کے بعد زندگی میں پروفیسر بننے کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر پانے کا ارادہ کیا۔ اسی دوران میری والدہ آمنہ خاتون سخت بیمار ہو گئیں۔ میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک میں نے اپنی زندگی میں کسی کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟ پہلی بار کسی کو مرتے ہوئے اور وہ بھی اپنے سامنے دیکھا تو اپنی ماں کو! اس واقعہ نے میری جسمانی اور ذہنی صحت کو حد درجہ متاثر کیا اور مجھ پر قیامت گزر گئی۔ دنیا کی ہر شے بے حلاوت معلوم ہونے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ زندگی سے زیادہ بے اعتبار کوئی شے نہیں ہے۔ قدرتاً فلسفۂ حیات و موت پر مسلسل غور کرنے لگا۔ اور میرے افکار و خیالات صوفیانہ ہو گئے۔ دنیا کی دلفریبیوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگا اور میں نے صرف ۲۵ دن کے مختصر عرصے میں اپنی داستانِ حیات قلم بند کرلی۔ یعنی کرنا کچھ تھا، کرنے کچھ اور لگا کیونکہ میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا اس لئے افسوس کہ ایوب قادری مرحوم کی تمنّا پوری نہ کر سکا ورنہ وہ تو میری ہر طرح امداد کرنے کو تیار تھے۔ اس معاملے میں جب بھی ان سے ملاقات ہوتی بہت ندامت محسوس ہوتی۔ اور آج بھی ان کے مرنے کے بعد اس احساس کی شدت سے شرمندہ ہوں۔ کیونکہ والدہ کے انتقال کے بعد میرے والد نے میری شادی کردی اور میں معاشی چکّروں میں الجھ کر رہ گیا اور ہوش رُبا گرانی نے مجھے اتنی مہلت ہی نہ دی جو میں اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر سکوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد منظرِ حیات بدل چکا ہے۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ لیکن میں ایوب قادری مرحوم کو اپنی پوری

داستان بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور نہ ہی میری غیرت کو گوارا تھا کہ میں کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کروں! بہر حال ایوب قادری مرحوم کی سیرت کا وصف اور کردار کا جوہر تھا کہ وہ میری بھلائی چاہتے تھے۔

ایوب قادری مرحوم کم و بیش چھوٹی بڑی ۲۵ تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں اور حال ہی میں جامعہ کراچی نے انھیں ایک مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ یہ مقالہ ۱۸۵۷ء سے قبل برصغیر ہند و پاک کے علمائے کرام کی تصانیف پر لکھا گیا ہے۔ میں نے میاد کباد کا خط لکھا تو مندرجہ ذیل جواب آیا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۰ء

مکرمی سید اوصاف علی صاحب السلام علیکم!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ آباد و شاد رکھے میں اُردو کالج میں ۲ بجے سے ۵ بجے شام تک بالعموم رہتا ہوں۔ کسی دن گھر آیئے۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری

مختصر یہ کہ ایوب قادری کی وسعتِ نظر، سیر چشمی کا معترف اور قائل ہونا پڑتا ہے اُن کا مطالعہ بہت وسیع، ادبی مذاق پاکیزہ، شستہ اور شائستہ تھا۔ کتابوں کے علاوہ انھوں نے بے شمار مضامین و مقالات مختلف موضوعات پر لکھے ہیں۔ کتب و رسائل کے خاص نمبر ایڈٹ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ افسوس صد افسوس! ایک ایسا عظیم عالم اور ایک ایسی مایہ ناز ہستی پاک صفات کو ٹریفک کے حادثے نے ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ؎

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

ارشاد الحق قدوسی

ڈاکٹر ایوب قادری

ایک مخلص اور ہمدرد انسان

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ میں بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن میں ملازم تھا ان دنوں بورڈ کا دفتر خالد بن ولید روڈ پی ای سی ایچ سوسائٹی میں واقع تھا۔ شام کا وقت تھا، میں چورا ہے پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا ایک ضعیف انسان میرے پاس آکر رکے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیوں میاں بس ابھی تک نہیں آئی؟" میں نے کہا "جی ہاں، ابھی تک نہیں آئی" میں ابھی جواب بھی دینے نہیں پایا تھا کہ بس آگئی۔ میں نے اُن بزرگ کو سہارا دیا اور خود بھی لپک کر بس میں سوار ہوگیا۔ انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہم دونوں قریب ہی بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد پھر انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوکر میرا نام پوچھا۔ اور جب میں نے نام بتایا تو بولے۔ "اچھا تو تم ہی ہو جو جنگ اور مارننگ نیوز وغیرہ میں لکھتے رہتے ہو؟" اور پھر بولے۔ "یہ مولانا اعجاز الحق قدوسی تمہارے کون ہوتے ہیں۔" میں نے کہا میرے عم محترم ہیں۔ "تو بیٹا تم مجھے نہیں جانتے؟" نہیں۔ میں نے قدرے خفیف ہوکر جواب دیا۔ "میاں میرا نام مفتی انتظام اللہ شہابی ہے اور میں یہیں جمشاٹریکل سوسائٹی میں کام کرتا ہوں۔ اتنے میں بس گرومندر پہنچ گئی اور میں ان سے ملنے کا وعدہ کرکے گرومندر پر اتر گیا کیونکہ مجھے یہاں سے دوسری بس لینا تھی۔

دوسرے دن دوپہر کو جب میں ہسٹاریکل سوسائٹی پہنچا تو مفتی انتظام اللہ شہابیؒ نے مجھے جناب ایوب قادری سے ملایا۔ وہ بھی ان دنوں ہسٹاریکل سوسائٹی ہی میں کتاب کی تدوین وتحقیق کا کام کر رہے تھے اور کراچی یونیورسٹی میں ایم۔اے اردو کے امتحان کی بھی تیاری کر رہے تھے۔ بڑے خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔ البتہ ان کے انداز کریمانہ نے مجھے اُن کا گرویدہ بنالیا۔ یہ تھی میری مرحوم محقق ایوب قادری سے پہلی ملاقات۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ میرے دوست منوّر الاسلام صدیقی جو میرے ہم محلہ بھی تھے اور ہم پیشہ بھی، وہ مجھے ایک دن ناظم آباد میں وحید آباد کالونی لے گئے۔ معلوم ہوا وہاں کوئی علمی وادبی سوسائٹی ہے۔ وہاں پہنچا تو دیکھا جناب ثناء الحق صدیقی صاحب مفتی انتظام اللہ شہابی اور جناب نصیب اختر محوِ گفتگو ہیں۔ گفتگو کا موضوع تھا کہ کتابوں کی اشاعت کے لئے مزید فنڈ کیسے مہیّا کیا جائے۔ میں نے ان تمام ذی عقل شخصیتوں میں جناب ایوب قادری کو بھی دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ انہی کا مکان ہے اور وہ اس اکیڈمی کے سکریٹری بھی ہیں۔ اور اسی مجلس میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ذوق علمی باوجود مالی کم مائیگی کے ان سے اب تک دو بائیس کتابوں کی اشاعت کے مرحلے بھی طے کرا چکا ہے۔

جفاکش، محنتی اور ذوقِ تحقیق سے سرشار رہنے والی شخصیت جناب ایوب قادری کی زندگی کے اس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور پھر ان سے کبھی کسی جلسے میں کبھی کسی ادبی نشست میں اور کبھی کسی مشاعرے میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور پھر کچھ عرصے کے بعد ایک دن ایسا بھی اتفاق ہوا کہ میں اپنے چچا مولانا اعجاز الحق قدّوسی کے یہاں گیا تو میں نے ایوب قادری صاحب کو بانوں کی چارپائی پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ بڑی بے تکلفی سے بیٹھے تھے۔ سامنے ایک تھال پر روٹی اور سالن تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھنے

لگے۔ میں نے کہا تشریف رکھیں۔ چچا جان بھی پانی لے کر آ گئے۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ باوجود عمر کے فرق کے دونوں میں ذوقِ علم، تحقیق کی ہم آہنگی کی وجہ سے بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ چچا جان نے بتایا کہ ایوب قادری صاحب علمی اور تحقیقی کاموں میں جنوں کی حد تک مصروف رہتے ہیں۔ بلکہ دنیاوی معاملات سے بڑی حد تک بے نیاز اور مستغنی ہیں۔ مزاج درویشانہ ہے۔ دنیاوی امور سے صرف اسی حد تک شغف رکھتے ہیں کہ زندہ رہیں اور زندہ بھی صرف اس لیے کہ علمی کاموں کو مزید آگے بڑھا کر علم کے فروغ کا کوئی عظیم کارنامہ انجام دے سکیں۔

مجھے آج ان پر مضمون لکھتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے اور میں اس حقیقت کے اعتراف میں اپنی بڑائی محسوس کرتا ہوں کہ فی الحقیقت ایسے ہی سیدھے سادے اور علمی تحقیق کا صحیح حق ادا کرنے والوں کی صحبت اور ہم نشینی کا اثر ہے کہ مجھے بھی لکھنے پڑھنے کے ذوق کو پروان چڑھانے کا حوصلہ ملا۔ اور پھر یوں ہوا کہ ۱۹۶۵ء میں ایم۔ اے اردو کے امتحان کے سلسلے میں کراچی یونیورسٹی پہنچا۔ برآمدے میں ایوب قادری صاحب بھی بیٹھے تھے۔ زبانی امتحان کا دن تھا، میں نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی امتحان دے رہے ہیں؟"، بڑی سادگی سے بولے۔ "ہاں جناب میں بھی امتحان دینے کے لئے آیا ہوں"۔ ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ مجھے اندر بلا لیا گیا جہاں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ساتھ میں نے ایک اور درویش صفت شخصیت کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ نام تھا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ جو سندھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صاحب نے میرا نام بتایا۔ بولے "تو آپ قدوسی ہیں"
میں نے کہا۔ "جی ہاں"۔ اچھا تو پھر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمۃ کے اس شعر کی تشریح کر دیں۔

گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا
خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

جبکہ مجھ سے پہلے امیدوار سے انھوں نے صرف حلوہ لکھوایا تھا اور چشم زدن میں وہ باہر آگیا تھا۔ پتہ لگا کہ غالب کا یہ مصرع حقیقت پر مبنی ہے۔

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب میں نے ڈاکٹر ابواللیث صاحب سے مایوس ہو کر پی ایچ ڈی کے لئے رجوع کیا تو انھوں نے مجھے اردو میں اسلامی فقہ پر تحقیق کا حکم دیا۔ بہرحال موضوعِ گفتگو تھا جناب ڈاکٹر ایوب قادری۔ تو ان کی شخصیت اور ان کے علمی تحقیق کے جنون نے بہتوں کو متاثر کیا۔ کہتے ہیں چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اُن کے تحقیقی کام ان کے ذوقِ علم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے علم کی اشاعت میں نہ صرف مدرس کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں بلکہ تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لئے بہت سی کتابوں پر تحقیقی کام کر کے علم کو عام کرنے اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے کلاسیکی ورثہ کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں جو قابلِ تحسین کام کیا ہے وہ انھیں علمی حلقوں میں مقبولِ عام بنانے اور انھیں شہرتِ دوام بخشنے کے لئے کافی ہے۔

بہ ظاہر وہ روکھی طبیعت کے مالک تھے مگر بہ باطن بڑے مخلص، ہمدرد اور نیک نیت، خوش طبع اور باغ و بہار انسان تھے۔ علمی اور تحقیقی ذوق ایک طرف، دوسری طرف وہ لطائف بھی بیان کیا کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت کے اس پہلو سے صرف وہی لوگ واقف تھے جن سے وہ بے تکلف تھے اور مجھے کسی حد تک یہ شرف بھی حاصل تھا۔ ایک دن ریلوے ڈپلو اسٹیشن پر تشریف لائے، کہنے لگے برگ و گل کا قائداعظم نمبر نکل رہا ہے مضمون دیدو۔ میں نے کہا مہلت چاہیئے۔ فرمایا، "ارے میاں بس ابھی چاہیئے تم تو مشینی صلاحیتوں کے آدمی ہو اور پھر پڑھے لکھے بھی" میں نے کہا۔ ویسے تو یہ مجھ پر الزام ہے مگر آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ میں نے چائے منگوائی اور کہا کہ آپ کم از کم ایک گھنٹے کی تو مہلت ضرور دیں۔ کہنے لگے۔ "اچھا تو میں پروف دیکھتا ہوں۔ تم شروع

ہو جاؤ۔ اور وہ مضمون انھوں نے شائع کر کے میری توقیر میں اضافہ کیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ میری کتابوں کی رونمائی میں انھوں نے شرکت کر کے مجھے ممنون فرمایا۔ اور مجھے بھی اپنی ادبی اور علمی مجلسوں میں باریاب کرتے رہے۔ ایک بار مجھے ایک دعوت نامہ ملا۔ ہوٹل جبیس میں جناب ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے کے سلسلے میں ایک نشست منعقد ہو رہی تھی۔ اور صدارت بھی ڈاکٹر ایوب قادری کی۔ میں نے اس میں شرکت کی۔ اور معلوم ہوا کہ یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "قدوسی صاحب آپ بھی اپنے کام کو جلد آگے بڑھائیے۔ میں حاضر ہوں" میں نے کہا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اعانت بھلا کسے حاصل نہیں۔ صبح کا وقت ہو یا رات کے بارہ بجے ہوں کوئی آدمی کسی بھی وقت آپ کی خدمت میں علمی تحقیق کے سلسلے میں نہ صرف حاضر ہو سکتا ہے بلکہ آپ خود اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ ایک دن جناب تقی عثمانی جو میرے دوست دلی رازی کے برادر خورد ہیں، کہنے لگے کوئی بھی علمی یا ادبی مسئلہ ہو ڈاکٹر ایوب قادری بغیر کسی لالچ کے ہمہ تن حاضر رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب قادری آج ہم میں نہیں ہیں لیکن انھوں نے ذوقِ تحقیق کی جو شمع روشن کی تھی اور اخلاص علم کی جو قندیل جلائی تھی اس میں ان کی درویش صفت شخصیت ہمیشہ اُجاگر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

محمد ذکی دہلوی

فخرِ زمانہ شخصے

۱۹۸۳ء

میرے والد کے ایک محترم دوست مفتی انتظام اللہ شہابی تھے۔ جن کی شفقت، محبت، خلوص اور ہمدردی زندگی بھر یاد رہے گی۔ ان کے ذریعہ بہت سے لوگوں سے تعارف ہوا مگر ان بہت سے لوگوں میں سے دو سے خصوصی تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک محمد ایوب قادری اور دوسرے ثناء الحق صدیقی۔ ان دو میں سے بھی ایوب قادری صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے اور ثناء الحق صاحب مفتی صاحب کی ایک نشانی باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کو تندرست اور خوش و خرّم رکھے۔

ایوب صاحب سے اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ نہ پروفیسر تھے اور نہ ڈاکٹر بلکہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کام کر رہے تھے۔ وہیں سے ان کی شہرت اور علمی حلقوں میں شناسائی شروع ہوئی۔ فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ ملازمت کے دوران پہلے بی اے کیا پھر ایم۔ اے۔ اُس کے بعد اُردو کالج میں جہاں رہتے ہوئے تعلیم مکمل کی تھی، وہ اوّل جز وقتی اور پھر مستقل پروفیسر ہو گئے۔ ہسٹاریکل سوسائٹی سے تعلق منقطع ہو گیا۔

علم دراصل ایوب صاحب کی گھٹی میں پڑا تھا اور تصنیف و تالیف کا شوق انھیں

شروع ہی سے تھا بیجا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ وہ پیدائشی عالم تھے۔ سنا ہے کہ پیدائش کے وقت جن بزرگ نے ان کے کان میں اذان دی تھی انھوں نے ان کا مادۂ تاریخ پیدائش "چراغِ علم" (۱۳۴۴ھ) نکالا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان کے اِس نام کا ہی اثر ہو کہ وہ زندگی میں "علم کے چراغ" بن کر چمکے۔ ستاون سال تک اپنی روشنی پھیلا کر ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو یہ چراغ گُل ہوگیا۔ سچ ہے کُلُّ شَیءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ط

ایوب صاحب کی منجملہ دیگر خوبیوں کے جن کا بڑے بڑے گرامی قدر احباب نے اعتراف کیا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ اُن کا خلوص و محبت اور سادگی تھی۔ ابتدا میں جب میری ملاقات قادری صاحب سے ہوئی میں اپنی کم علمی کے سبب بہت محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ جب ربط و ضبط بڑھا تو اُن کی کرم فرمائیوں سے اندازہ ہوا کہ ایسے خوش خُلق، با مروّت اور وضعدار انسان اس دور میں نایاب ہیں۔ پہلی ملاقات کے بعد جب موصوف بی۔اے کی تیاری میں مصروف تھے اس وقت سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تک ان کا میل ملاقات کا انداز وہی رہا جو پہلے روز تھا۔ علم اور شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی طبیعت میں ذرّہ برابر تمکنت نہ تھی۔ جب کبھی قادری صاحب میرا تعارف اپنے کسی دوست سے کراتے تو فرماتے کہ "یہ ہمارے دوست ہیں ذکی صاحب"، اس وقت خود میری اپنی وقعت میرے دل میں بڑھ جاتی اور مجھے اس اندازِ تعارف پہ ایک لمحہ کے لئے فخر محسوس ہوتا۔

۱۹۷۶ء میں ایوب قادری صاحب کا خیرپور کے ایک سفر میں ساتھ رہا۔ اُس وقت تعلقات اور بے تکلفی میں بے حد اضافہ ہوا۔ سفر کے محرک مشہور ادیب جناب مخمور اکبرآبادی ہوئے۔ وہ اپنے بھانجے سیّد علی مظاہر جعفری ایڈوکیٹ کے اصرار پر تین سال قبل کراچی سے خیرپور منتقل ہو گئے تھے اور وہیں مستقلاً سکونت پذیر

تھے۔ ویسے تو وہ ہمیں کافی عرصے سے خیر پور آنے کی دعوت دے رہے تھے لیکن ۱۹۷۶ء میں ایک ایسا کام نکل آیا جس نے ہمیں سفر کے لئے آمادہ کر دیا۔ محمود صاحب نے نظیر اکبرآبادی کے کلام پر ایک معرکہ آرا کتاب "نظیر نامہ" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اپنے بھانجے سید علی مطاہر جعفری کے اصرار پر وہ اس کے شائع کرنے پر آمادہ ہوئے تو اس سلسلے میں مشورے کے لئے انھوں نے ہمیں خیر پور بلایا۔ غالباً جولائی کی شروع کی تاریخیں تھیں جب میں، قادری صاحب اور ثناء الحق صاحب تینوں اس سفر پر روانہ ہوئے۔ سفر نہایت دلچسپ رہا۔ اس دوران میں ایوب صاحب نے کوئی علمی موضوع درمیان میں نہیں آنے دیا بلکہ پورے سفر میں نہایت بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہی۔ لطائف و ظرائف چلتے رہے اور آٹھ نو گھنٹے کا یہ سفر ہنسی خوشی طے ہو گیا۔

رات کے گیارہ بجے جب خیر پور کے اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں علی مطاہر صاحب کے چھوٹے صاحبزادے علی آدم ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر "عبداللہ منزل" لے گئے۔ وہاں ان حضرات نے ہماری جس قدر تواضع کی اس کا نقش آج تک دل پر ثبت ہے۔

خیر پور پہنچ کر ایوب صاحب نے اپنے علمی مشاغل پھر سے جاری کر دئے۔ دوسرے ہی دن انھوں نے خیر پور کی مرکزی لائبریری کا رخ کیا۔ وہاں کتابوں کو دیکھا بھالا۔ بعض کتابوں سے اخذ و اقتباس کیا۔ لائبریری کے عملہ کو اپنی علمیت سے متاثر کیا اور بعض حضرات سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ غرض تقریباً دو گھنٹے میں انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

تیسرے دن علی آدم ہمیں اپنی گاڑی میں سکھر لے گئے۔ وہاں بھی ایوب صاحب نے اپنی علمی مہم جاری رکھی۔ کالجوں اور شہر میں بعض علمی شخصیتوں سے ملاقات کی اور بعض کے ذخیرۂ کتب کا جائزہ لیا۔ چوتھے دن ہم کراچی واپس آ گئے۔

خیرپور کے سفر کے کچھ عرصہ بعد میں ملازمت کے سلسلہ میں اسلام آباد چلا گیا۔ وہاں سے اکثر و بیشتر قادری صاحب سے فون پر گفتگو ہوتی۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم ہو جاتی لیکن اس ملاقات کا لطف کئی روز تک محسوس ہوتا رہتا اور اسلام آباد میں اپنی تنہائی کا احساس کسی حد تک کم ہو جاتا۔

قادری صاحب کبھی کسی علمی، ادبی یا تاریخی اجلاس میں سرکاری طور پر اسلام آباد بلائے جاتے تو وہاں وہ سرکاری مہمان ہوتے اور طعام و قیام کا اہتمام ان کے لئے سرکاری طور پر ہوتا۔ اجلاس کے اختتام پر اور کبھی دورانِ اجلاس فرصت ملنے پر اپنے اسلام آباد آنے کی اطلاع ضرور دیتے اور ملنے کے لئے غریب خانہ پر تشریف لاتے۔ دو مرتبہ اسلام آباد میں مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشا۔

جمعہ کے روز راولپنڈی میں چھٹی کی وجہ سے تمام کاروبار بند ہوتا ہے لہٰذا بند دکانوں کے آگے وہاں ہر ہفتہ پرانی کتابوں کا بڑا طویل و عریض بازار لگتا۔ جب قادری صاحب جمعہ کے آس پاس وہاں ہوتے تو راولپنڈی کتابوں کے بازار میں ضرور جاتے اور اپنی پسند کی کتابیں وہاں سے خرید لاتے۔

قادری صاحب نے حصولِ تعلیم میں بڑی محنت کی اور اس سے زیادہ جانفشانی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی ڈگریاں بہت جلد حاصل کیں اور تصانیف کی شہرت اور اشاعت بھی کم مدت میں اتنی زیادہ ہوئی کہ دوسرے لوگ کم اتنی سرعت کے ساتھ اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں پہنچ کر قادری صاحب نے اپنے آپ کو منوالیا۔ بعض اوقات غور کرتا تو حیرت ہوتی تھی کہ اتنی تیزی کے ساتھ موصوف نے کس طرح اتنی منازل طے کر کے اپنے لئے ایک اعلیٰ مقام پیدا کر لیا ہے۔

قادری صاحب کے مداحوں میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ ان کی بڑی کمی محسوس کرتے ہیں اور ان کی جدائی کا نقش ہر ایک کے دل پر بہت گہرا ثبت ہوا ہے۔ مجھے کوئی شخص

ایسا نہیں ملا جس نے قادری صاحب کی شکایت کی ہو یا وہ اُن کے کسی قول اور فعل سے نالاں رہا ہو۔ منہ پر تو اکثر و بیشتر لوگ اپنے دوستوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے پیچھے اپنے ایسے مداح چھوڑ جائیں جن کی زبان بعد میں بھی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔ اور ان لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ قادری صاحب یوں یک بیک ہم سے جدا ہو گئے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ایک مرتبہ ایک کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں قادری صاحب کا مشورہ درکار تھا تو آپ نے فرمایا۔ دو تین روز بعد ایک چھٹی آرہی ہے وہ پوری چھٹی آپ کے نام ہوگی۔ اور تمام دن آپ کے مکان پر گزرے گا جب تک وہ کام مکمل نہ ہو جائے۔ چنانچہ حسب وعدہ ایوب قادری صاحب، ثناء الحق صاحب کو ساتھ لے کر غریب خانہ پر تشریف لائے اور واقعی پوری چھٹی اس طرح گزاری کہ دونوں حضرات غریب خانہ کو اپنے وجود باجود سے رونق بخشتے رہے۔ یہ قادری صاحب کا غریب خانہ پر آخری پھیرا تھا۔

⁂ — ⁂ — ⁂ — ⁂ — ⁂ — ⁂ — ⁂ — ⁂

وفات سے دو روز قبل ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر تشریف لائے۔ سیّد الطاف علی بریلوی صاحب سے کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ دیر بیٹھ کر میری عزت افزائی فرمائی اور بڑے اچھے موڈ میں چند دل خوش کن باتیں کیں اور رخصت ہو گئے۔ کیا خبر تھی کہ یہ میری قادری صاحب سے آخری ملاقات ہے، ورنہ کچھ دیر اُن سے اور باتیں کر لیتا۔

جس روز قادری صاحب کے انتقال پُرملال کی خبر مع اُن کی تصویر کے "جنگ" اخبار میں چھپی، تھی صبح ہی صبح میری بچی اخبار لے کر میرے کمرے

میں آئی اور ایسا معلوم ہو کہ بچی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی ہیں تے سمجھا ضرور کسی خاص خبر کی نشاندہی کے لئے اخبار لے کر میرے پاس آئی ہے۔ بغیر زبان سے کوئی لفظ ادا کئے خبر کی طرف اشارہ کر کے خاموش کھڑی رہی۔ خبر پڑھ کر کلیجہ دھک سے رہ گیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ہر چند کہ ہونے والی بات ہو چکی تھی مگر پھر بھی دل نہیں مانتا تھا اور یقین نہ آتا تھا کہ قادری صاحب جو دو روز پہلے بڑے خوش گوار انداز میں ملے تھے آج مرحوم ہو گئے۔

آلامِ روزگار نے چھلنی کیا ہے دل
رکھیں گے آپ زخم پہ مرہم کہاں کہاں
گردِ رہِ حیات میں اظہرؔ نہ پوچھئے
مجھ سے بچھڑ گئے مرے ہمدم کہاں کہاں

سلیم فاروقی

میرے مربّی و محسن ایوب قادری

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو "مرحوم" کہتے ہوئے آج بھی مجھے جھجک سی محسوس ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی علمی دورے پر کراچی سے کہیں باہر گئے ہوئے ہوں۔ قادری صاحب میرے استاد بھی تھے اور محب بھی۔ وہ ہمیشہ میرے علمی وادبی ذوق وشوق کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ امر واقعی ہے کہ میں نے ان کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھا وہ انتہائی سادہ مزاج خوش اخلاق اور دل سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ جو شخص علم وادب کا ذوق رکھتا ہے اسے صحیح مشورہ دیں اور عمل کے میدان میں آگے بڑھنے میں اس کی رہنمائی کریں۔ قادری صاحب کا یہ بہت بڑا وصف تھا کہ وہ اپنے ارادت مند سے کبھی سرسری انداز میں نہ ملتے تھے۔ اسی طرح وہ شخص جو ان سے پہلی بار ملتا تھا۔ وہ بھی اپنے نزدیک یہی خیال کرتا تھا کہ اس کی قادری صاحب سے نہ جانے کتنی پرانی یاد اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وصف ہر انسان میں نہیں ہوتا۔

قادری صاحب کے تحقیقی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے مجلّہ سہ ماہی "العلم" سے شروع ہوا جس کے مدیر سید الطاف علی بریلوی صاحب تھے۔ یہ مجلّہ اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین کی افادیت وجامعیت کے لحاظ سے پاک وہند کے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا کہ "العلم" کے لکھنے والے کی تحریر "معتبر و مستند" سمجھی جاتی ہے۔ قادری صاحب نے "العلم" میں نہ صرف یہ کہ بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین ومقالات لکھے، بلکہ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست میں بھی اضافہ کیا۔ ان کی چند مطبوعات درج ذیل ہیں:

علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں ۔ مرتبہ: سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر ایوب قادری۔

علم و عمل وقائع عبدالقادر خانی ۔ ترتیب و حواشی، پروفیسر محمد ایوب قادری

فرحت الناظرین ۔ مصنفہ: محمد اسلم پسروری، ترجمہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

سید الطاف علی بریلوی (حیات و خدمات)۔ مؤلفہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

اس کے علاوہ جن دوسرے مطابع نے ان کی کتابیں چھاپیں ان میں دو کتابیں خاص ہیں:

تذکرہ علمائے ہند، ترجمہ: محمد ایوب قادری

مآثر الامرا، ترجمہ: محمد ایوب قادری

یہ دونوں کتابیں فارسی زبان میں تھیں جن کا قادری صاحب نے انتہائی سلیس و سادہ اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ دوسری کتاب کی پہلی جلد کے اشاریہ کی ترتیب میں اس ناچیز کا بھی حصہ ہے۔

قادری صاحب کا خاص میدان وقائع نگاری تھا۔ اور اس فن میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ روہیل کھنڈ کی تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات درجۂ استناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قادری صاحب کو قدیم کتب اور مخطوطات کی ہر وقت تلاش رہتی۔ اس کا انھیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ انھوں نے اس کام کے لیئے متعدد بار ہندوستان کا دورہ کیا۔ انھیں جب بھی کسی نایاب کتاب یا مخطوطے کا سراغ ملتا اسے حاصل کرنے کے لیئے وہ سفر کی دشواریوں کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے۔ راقم الحروف نے ایک بار ان سے تین

کتابوں کا ذکر کیا۔ ان میں "تاریخ سندیلہ (مولفہ راجا درگا پرشاد) اور دوسری "مشاہیر سندیلہ"، اور تیسری "ایک نادرۂ روزگار روزنامچہ"۔ دوسری کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قصبہ سندیلہ، ضلع ہردوئی کے مشاہیر کے تذکرہ پر مشتمل ہے لیکن تیسری کتاب مولوی مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ ہے جو تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے میرے چچا ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے اس ضخیم روزنامچہ کا ایک مختصر سا حصہ کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ یہ نادرۂ روزگار روزنامچہ چالیس سال کے احوال و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک اتنا ضخیم روزنامچہ سوائے اردو کے اور کسی زبان میں موجود نہیں۔ قادری صاحب ان تینوں کتابوں کا تذکرہ سن کر انھیں دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ میں اپنی عدیم الفرصتی کے باعث انھیں یہ کتابیں نہ دکھا سکا۔ ان سے جب کبھی ملاقات ہوتی، سب سے پہلے مذکورہ کتابوں کے بارے میں پوچھتے۔ افسوس کہ یہ تمنا اپنے دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

لکھنے لکھانے کے معاملہ میں قادری صاحب خاص طور پر یہ کہا کرتے تھے کہ "پڑھو زیادہ لکھو کم"، کیونکہ لکھنا خواہ کسی موضوع پر ہو بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور اسکے لئے وسیع علم اور ٹھوس معلومات کی ضرورت ہے ورنہ کاغذ کو کالا کرنا کون سا مشکل کام ہے ہمارے اخبارات و جرائد اپنے حسنِ طباعت کے اعتبار سے کتنے اچھے ہوتے ہیں لیکن ان میں جو کچھ چھپتا ہے اس کا کوئی معیار نہیں ہوتا نہ معلومات کے لحاظ سے اور نہ زبان و بیان کے اعتبار سے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ لکھنے والے مطالعہ نہیں کرتے۔ انھیں بس یہ فکر رہتی ہے کہ ان کی لکھی ہوئی چیز ایک بہترین تصویر کے ساتھ اخبار اور رسالہ کی زینت بن جائے۔ اور لوگ انھیں "صحافی" اور "دانشور" سمجھنے لگیں۔

قادری صاحب میں شخصیت سازی کا جوہر بھی تھا۔ وہ ان نوجوانوں سے محبت کرتے تھے جنھیں علم و ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے کا شوق ہوتا۔ وہ ایسے نوجوانوں کو وقت دیتے

ان کے مزاج کے اعتبار سے ان کے لئے موضوعات کا انتخاب کرتے پھرتے۔ کتابوں تک رسائی کے لئے کتب خانوں کی تلاش کرتے پھرتے۔ یہ بھی ہوتا کہ خود کسی موضوع کا انتخاب کر کے اپنے شاگردوں سے کہتے کہ اس پر مضمون لکھو۔ اس سے لکھنے والے میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہوتا اور وہ اس کام میں سرگرم عمل ہو جاتا۔ راقم الحروف نے کئی مضامین قادری صاحب کی فرمائش پر لکھے جو "سہ ماہی التربیر"، بہاولپور اکیڈمی، سہ ماہی "العلم"، اور دوسرے علمی و ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔

قادری صاحب ایک راسخ العقیدہ سنّی مسلمان تھے۔ سنیوں کے فروعی اختلافات کو کبھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے اور نہ اس میں فریق بنتے۔

البتہ یہ ضروری تھا کہ وہ "مہنت گرانہ اسلام" کے سخت مخالف تھے اور اسے دینِ فطرت کی روح کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ مشاجرات صحابہؓ کے سلسلہ میں کسی "خطائے اجتہادی" کے قائل نہ تھے۔ تمام صحابہؓ کا دل سے احترام کرتے تھے کیونکہ ایک سچا مسلمان ہونے کی یہی سب سے بڑی "سند" ہے۔

قادری صاحب سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے کچھ عرصہ بیشتر لاہور کے انارکلی بازار میں سرِ راہے ہو گئی۔ میں مکتبۂ نبویہ میں اقبال احمد فاروقی صاحب سے مل کر آ رہا تھا اور وہ ان سے ملنے جا رہے تھے۔ اس سرسری ملاقات میں ان سے چند باتیں ہوئیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے۔ لیکن میں اب بھی انھیں مرحوم نہیں کہوں گا۔ کیونکہ اس وقت بھی ان کی مسکراتی ہوئی صورت میرے سامنے ہے اور وہ مجھ سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ...... لکھو کم پڑھو زیادہ .....!

سیّد عابد علی

تنہا گئے کیوں....

ایوب صاحب نے جون ۱۹۳۶ء میں شیخ مشیت اللہ کے گھر واقع قصبہ آنولہ (روہیل کھنڈ۔ بریلی) میں آنکھ کھولی۔ ایوب صاحب بتایا کرتے تھے کہ ان کے والد کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ان کے والد زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر انھیں تعلیم سے شغف بہت تھا۔ لہٰذا انھوں نے ایوب صاحب کی تعلیم پر توجہ دی۔ اوّل انھوں نے قرآن مجید اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر پڑھا پھر اردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کرنے کے بعد پرائمری اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور پرائمری سے لے کر ایم اے تک درجہ اوّل میں پاس ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان الٰہ آباد بورڈ سے پاس کر کے پاکستان آگئے اور بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں کراچی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔

ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ میری ایوب صاحب سے سب سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ یہ ضرور خیال پڑتا ہے کہ استاد محترم ثناء الحق صدیقی صاحب کے درِ دولت پر پہلی بار شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ میرا گمان ہے کہ ۱۹۶۶ء رہا ہوگا۔ کیونکہ میرے ان سے روابط تقریباً ۱۷ یا ۱۸ سال پرانے تھے۔ پہلی ملاقات کے بعد آہستہ آہستہ ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ربط اور انسیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی علمی قابلیت دن بدن مجھ پر روشن ہوتی گئی اور اسی طرح ان کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی گئی۔

کچھ عرصے بعد ایک دن فرمانے لگے کہ آپ میرے بچوں کو پڑھا دیں۔ میں نے کہا آپ کو تو معلوم ہے کہ مجھے فرصت نہیں اور میں ٹیوشن نہیں پڑھاتا ہوں۔ کہنے لگے۔ بھائی

ذرا وقت نکالو، یہ بچے فیل ہو جائیں گے۔ ان کے بے حد اصرار پر میں نے کہا کہ اتوار کے اتوار بھیج دیا کریں۔ میں سمجھا تھا کہ بچے سائنس پڑھیں گے، معلوم ہوا کہ وہ انگریزی پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایوب صاحب سے کہا کہ میری انگریزی ایسی ہی ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ انگریزی میں ایم اے ہیں۔ اور زور دے کر کہا کہ بچوں کو TENSES سکھائیں۔ بہرحال بچے آتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے عزت رکھ لی کہ وہ پاس ہو گئے۔

ایوب صاحب کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں یہ بتانے میں کبھی جھجھک محسوس نہیں ہوئی کہ انھوں نے کلرکی سے ترقی کی اور ابتدائی ایام بڑی عسرت سے گزارے۔ اس تنگ دستی کے زمانہ میں انھوں نے تعلیم بھی حاصل کی اور خدا کے فضل سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ استاذ محترم اکثر مجھ سے کہتے کہ ایوب صاحب بہت پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے سکتے تھے مگر دوسرے کاموں میں لگ جانے کی وجہ سے اتنی دیر لگی۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ایم اے کر کے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا تھا۔ مگر پی ایچ ڈی کی سند انھیں ۱۸ سال بعد یعنی ۱۹۸۰ء میں ملی۔

ایک دفعہ ایوب صاحب نے مجھے بتایا کہ ثناء صاحب سے میری پہلی ملاقات جناب مصطفیٰ بریلوی کے ذریعہ ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ثناء صاحب کے پاس امداد اللہ مہاجر مکّی رحمتہ اللہ کے متعدد خطوط ہیں جو انھوں نے ان کے دادا کے نام تحریر کیے تھے۔ ان خطوط کی جو قدر و منزلت اور اہمیت ہے ان سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ ایوب صاحب نے ان کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ثناء صاحب نے فرمایا کہ آپ فلاں دن آجائیں میں نکال رکھوں گا۔ ایوب صاحب کا کہنا تھا کہ میں وقت مقررہ پر ثناء صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ثنا صاحب نے مجھے خوش آمدید کہا اور بڑی خاطر مدارات کی اور اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی مگر انھوں نے خط کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا میں سمجھا کہ شاید یہ بھول گئے یا مجھے دکھانا نہیں چاہتے۔ لہٰذا میں خاموش رہا اور چلنے کی اجازت مانگی تو ثنا صاحب

کہنے لگے، ذرا رکیے گا، اور ایک فائل اٹھا کر مجھے دی جس میں ۱۴ خطوط تھے۔ ایوب صاحب کہنے لگے، میں ان خطوط کو دیکھنے کے لیے دوبارہ بیٹھنے لگا۔ اس پر ثناء صاحب نے فرمایا کہ آپ انھیں گھر لے جا کر اطمینان سے دیکھئے اور جو نوٹ کرنا چاہیں نوٹ کر کے واپس کر دیں۔ وہ یہ واقعہ بیان کر کے کہا کرتے تھے کہ اپنے نادر خطوط کا ایک اجنبی کو جس سے ان کی دوسری ملاقات تھی، دے دینا بڑے اعتبار کی بات تھی ——

اس واقعے کے ضمن میں وہ یہ بات بھی بتاتے تھے کہ جب ثناء صاحب ان کے گھر پہلی مرتبہ گئے تو فرماتے تھے میرے گھر میں بٹھانے تک کا انتظام نہ تھا۔ میں ایک پڑوسی کے یہاں سے کرسی اٹھا کر لایا تاکہ انھیں گھر کے دروازے پر بٹھا سکوں۔ یہ بات اگر وہ نہ بتاتے تو کوئی حرج نہ تھا، مگر وہ بہت صاف گو اور دیندار تھے لہذا کوئی بات چھپاتے نہیں تھے۔

انھیں تصنع اور بناوٹ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ سادگی پسند اور بے تکلفی کے عادی تھے۔ ان کے بیٹھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ ہمیشہ نہ چھپے ہو کر بیٹھتے تھے جیسے گاؤ تکیہ لگا کر لوگ بیٹھتے ہیں۔ اگر گاؤ تکیہ نہ ہوتا تو تکیہ لگا لیتے تھے اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کسی چیز کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ شاید اسی لئے وہ کرسی کے بجائے پلنگ اور تخت پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے —— وہ سیدھے سادے کپڑے پہنتے تھے۔ ہاف شرٹ اور پتلون زیب تن کرتے تھے۔ عوامی سوٹ کے عام ہونے پر اس کو بھی پہننے لگے تھے۔ خاص خاص موقعوں پر پاجامہ قمیص اور شیروانی بھی پہنتے تھے —— یہ ان کی سادگی اور بے تکلفی ہی تھی کہ وہ ہر کس و ناکس کے بلانے پر فوراً چلے جاتے تھے۔ جب وہ کسی محلے سے گزرتے تو وہاں کے زیادہ سے زیادہ شاعروں ادیبوں سے مل لیتے تھے۔

جب میں پی ایچ ڈی کرنے لگا تو لوگوں نے دو افراد کے بارے میں بتایا کہ یہ حضرات بڑی مشکل سے کسی کی مدد کرتے ہیں اور زیادہ تر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ لوگ آپ کی شاید ہی مدد کریں۔ ان دو حضرات میں ایک ایوب قادری صاحب اور دوسرے مشفق خواجہ صاحب تھے۔

مگر اللہ کے فضل سے میرے بارے میں یہ ساری باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ ایوب قادری صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں جناب فرمان فتحپوری صاحب کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کر رہا ہوں تو بے حد خوش ہوئے اور فرمانے لگے، فرمان صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔ وہ ضرور آپ کو پی ایچ ڈی کرا دیں گے اور ہر طرح کی مدد بھی فراہم کریں گے۔ پھر موضوع دریافت کیا اور مجھے اس سلسلے میں بہت سے حضرات کے نام بتائے کہ ان حضرات سے ملئے اور یہ بھی فرمایا کہ میرا حوالہ دیجئے گا۔ اور خود بھی کئی کتابیں فراہم کیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے گھر بیٹھ کر نوٹ لے لوں گا۔ کہنے لگے، ارے میاں گھر لے جاؤ آرام سے کام کرو جب کام ہو جائے تو دے دینا۔ اور ان کی بعض کتابیں میرے پاس چھ ماہ تک رہیں۔ اس کے علاوہ جب بھی ملاقات ہوتی سب سے پہلے پوچھتے، کام کہاں تک پہنچا۔ میری مشکلات کو سن کر ان کے حل کی ترکیب بتاتے۔ غرض ہر طرح کی مدد فرماتے۔ یہی حال مشفق خواجہ صاحب کا رہا۔ ان کے گھر میں نے بیٹھ کر کئی کئی گھنٹے روزانہ کام کیا۔ وہ اگرچہ بڑے مصروف آدمی ہیں مگر میری ہر طرح مدد فرمائی اور خاطر مدارات الگ کی۔

وہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ استاد محترم ثناء الحق مدظلہ کے کہنے پر میں نے دار العلوم کے لئے چند مضامین لکھے۔ اگرچہ میں ان کا اہل نہ تھا۔ وہ مضامین کہیں ایوب صاحب کی نظر سے گزرے، پھر کیا تھا انھوں نے باقاعدہ مجھے مولانا کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ میں اس وقت شکل وصورت سے اور کسی بھی طرح سے مولانا کہلانے کا حقدار نہیں تھا اور نہ آج ہوں۔ اسی طرح جب ادارہ دانش وحکمت کی بنیاد پڑی تو وہ اس کے اولین سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور انھوں نے زبردستی مجھ جیسے شخص کو معاون سکریٹری مقرر کروایا۔ حالانکہ اس مجلس میں مجھ سے قابل اور محنتی حضرات موجود تھے۔

وہ نیک اور سیدھے سادے شخص تھے اور شاید ہی کسی نے ان کو غصہ کرتے ہوئے

دیکھا ہو۔ مگر میں نے ان کو ایک مرتبہ شدید غصے کی حالت میں بھی دیکھا۔ اور میں یہ سمجھا کہ شاید اب وہ ان صاحب سے پھر نہ ملیں گے۔ مگر چند دن بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دونوں حضرات آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو کر گفتگو کر رہے تھے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

انھیں نوادرات اور خاص کر کتب کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بڑے اعلیٰ پائے کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کو انھوں نے بڑی تلاش و جستجو اور صرف کثیر سے جمع کیا تھا۔ اور اسی محنت سے اس کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ اور عام لوگوں کی نگاہ سے چھپا کر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے ایک تصویر کی ضرورت ہوئی جو ایک کلینڈر میں شائع ہو چکی تھی۔ یہ بات ان کے سامنے ہوئی۔ فرمانے لگے۔ میرے گھر آجانا میں دے دوں گا۔ میں سمجھا پرانا کلینڈر ان کے گھر میں رکھا ہوا ہوگا۔ اب جو میں گھر گیا تو دیکھا ان کے پاس بڑی نادر اور اچھی تصاویر کا ایک ذخیرہ ہے۔ میں نے دریافت کیا، آپ کو اس کا شوق ہے۔ فرمانے لگے میں تو کلینڈر زنگ سے تصاویر اور خوش خطی کے نمونے جمع کر لیتا ہوں۔

ان میں میں نے ایک بڑی خوبی یہ دیکھی کہ وہ الٹے ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر کاغذ کو رکھ کر خط اور مضمون لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی طرح خط انھوں نے مجھے لکھ کر دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایک انگلی پر کاغذ کو رکھ کر خط لکھنا کوئی آسان کام نہیں جبکہ خوش خط بھی ہو۔ لیکن اس میں ان کو کمال حاصل تھا۔

ان کا حافظہ بلا کا تھا اور انھیں علم رجال میں مہارت حاصل تھی۔ آپ ان سے صرف ذکر کریں وہ پھر ان کے باپ دادا کے حالات فر فر سنانا شروع کر دیتے تھے ان کے انتقال کے بعد کچھ لوگ سندھ سے آئے تھے ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے ہمارے خاندان کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کی تھیں کہ خود ہم لوگ اس سے ناواقف تھے۔

مگر افسوس وہ بتانے والا اب نہیں۔

ایک بار میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اتنی کتابیں تحریر کیں اور ایک ایک کتاب کئی کئی جلدوں میں ہے، آخر آپ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں، اور کس وقت کرتے ہیں۔ ہنسنے لگے، کہنے لگے۔ ہاں یہ کام معلوم تو مشکل ہوتا ہے مگر میں فجر کی نماز کے بعد آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہوں اور ۸ بجے تک یہ ترجمے کا کام کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد ناشتہ کرتا ہوں اور دیگر معمولات میں لگ جاتا ہوں۔ اس زمانے میں وہ ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ انھوں نے اتنی کم عمری میں کتنے مختلف موضوعات پر کتنی بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ قدرت کو معلوم تھا کہ ان کی زندگی کتنی ہے۔ لہذا اس نے ان سے اتنی کم مدت میں ۲۴۔ ۲۵ کتب تحریر کرا دیں۔

انھیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اور ان میں بقول استاد محترم یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ہی کتاب کے مضمون اور اس کی باریکیوں تک سے واقف ہو جاتے تھے۔

ہندو پاکستان کا شاید ہی کوئی کتب خانہ ایسا ہو جہاں سے وہ فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ کتابوں کی تلاش میں وہ دور دراز مقامات، گاؤں اور دیہات تک جاتے اور کام کی باتیں نقل کر کے لے آتے تھے۔

ٹریفک کے معاملہ میں ایوب قادری صاحب بہت احتیاط برتتے تھے بلکہ جو کوئی ان کے ساتھ ہوتا اس کو بھی محتاط رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مگر قدرت کا یہ قانون اٹل ہے "وَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ" چنانچہ ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کی شام کو جب وہ ایک بس میں سوار ہونے کی جلدی میں ایک سڑک جس کی چوڑائی پندرہ سولہ فٹ سے زیادہ نہ ہوگی، پار کر رہے تھے۔ اس وقت نہ ان کی احتیاط کام آئی

اور نہ ان کی چھٹی حِس نے ان کو خطرے سے آگاہ کیا۔ اور ایک تیز رفتار سوزوکی نے سڑک کے بیچوں بیچ ٹکر مار کر ان کی زندگی کا روشن چراغ گل کر دیا۔ بقول جناب توکل حسین قدوائی "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک الموت نے اپنے لئے بہانہ بنانے کی غرض سے ان کو سوزوکی کے سامنے لا ڈالا اور ان کی روح قبض کر کے جنت کے پر فضا باغوں میں پہنچا دیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

قطعہ تاریخِ وفات

زباں خموش ہے، دل شدّتِ الم سے نڈھال
بیاں کیسے کروں، وجہہ انتہائے ملال
وہ جس کو کہتے تھے ایوب قادری سب لوگ
گیا کلیمؔ وہ "فیروزمند فضل و کمال"

۱۴۰۴ھ

کلیم زیدی

ڈاکٹر ایوب قادری کی شخصیت اور تصانیف

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنم
بہ ایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

مرزا غالب نے ابنائے روزگار کی بے حسی اور اصحاب علم و کمال کی قدر ناشناسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا تھا ؎

دراں دریا کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشادہ ام و قیمتِ گہر گویم

اور غالب سے کئی سو سال قبل حافظ شیرازی بڑے دل گداز و رقت انگیز لہجے میں فرما چکے تھے ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

اگر بہ نظرِ تعمق جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس خاکدانِ عالم میں بیشمار اربابِ علم و فضل کنجِ خمول میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ معدودے چند لوگوں نے تو انھیں سپردِ خاک کرتے ہوئے بہ دیدۂ گریاں زبانِ حال سے کہا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے ؟

موجودہ دور کو علم و دانش اور سائنسی ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں اصحابِ علم و فضل اور اربابِ کمال و ہنر کی توقیر و قدر افزائی متعدد طریقوں سے کی جاتی ہے۔ کسی کو گراں قدر نقد انعام سے نوازا جاتا ہے، کوئی حاکمِ وقت سے تعریفی سند وصول کرتا ہے اور ذرائعِ ابلاغ عامہ اس کی پبلسٹی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں اور کوئی رفیع المنزلت خطاب سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا وطنِ عزیز اس صفت سے اگر یکسر نہیں تو بڑی حد تک محروم ضرور ہے۔ یہاں اربابِ اقتدار کی آنکھوں پر تنگ نظری و تعصب کے علاوہ مصلحت اندیشی و اقربا پروری کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں طائفہ اربابِ نشاط کی پذیرائی تو بڑی وسیع القلبی و فراخ حوصلگی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر کوئی فلمی ہیرو مر جاتا ہے یا ٹی وی کی کوئی نام نہاد فنکارہ متعلقہ لوگوں کی غیر ذمہ داری کی بنا پر ریل (TRAIN) کے ذریعہ کچل کر ہلاک ہو جاتی ہے تو اس کی تعزیت ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ درجے تک سب لوگ کرتے ہیں لیکن اگر ڈاکٹر محمد ایوب قادری جیسا مایۂ ناز محقق، سخت کوش مترجم، قابل قدر حواشی و تعلیقات نگار اور دلدادۂ علم و کمال انتہائی روح فرسا و المناک مرگِ مفاجات کا شکار ہو جاتا ہے تو ذمہ دار حلقوں کو چنداں احساس نہیں ہوتا۔ کسی عالی منصب شخص کی جانب سے پیغامِ تعزیت تک ارسال نہیں کیا جاتا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ مرحوم کے لواحقین کی کفالت کون کرے گا؟ پسماندگان کی دستگیری کس کا فرض ہے؟ صرف حلقۂ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے چند حضرات اظہار ہمدردی و افسوس کر کے دعائے مغفرت کر لیتے ہیں ــــ اور بس ؎

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

ایوب قادری مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات ۱۹۷۸ء میں ہوئی تھی۔

تقریبِ ملاقات یہ تھی کہ یہ خاکسار اپنے دیرینہ کرم فرما اور معروف محقق و ادیب جناب ثناء الحق صاحب صدیقی کے دولت کدہ واقع ناظم آباد پر ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور تشریف لائے اور رسمی تعارف کے بعد علمی و ادبی گفتگو شروع ہوئی۔ اگرچہ ملاقات بہت مختصر تھی لیکن یہ نیازمند نہایت خوشگوار تاثر لے کر واپس آیا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں اور بے تکلفی و یگانگت میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ آخری ملاقات بھی ان کے انتقال سے چند روز قبل جناب ثناء الحق صاحب صدیقی کی موجودہ قیام گاہ واقع فیڈرل بی ایریا، بلاک نمبر ۱۶ کراچی میں ہوئی تھی۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد وہ بہت جلد عازمِ خلدِ بریں ہو جائیں گے ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ایوب قادری مرحوم یوں تو گوناگوں صفات و محاسن کے حامل تھے لیکن میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک "طالب علم" تھے۔ جیسا کہ جناب حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

"ایوب صاحب کی سیرت کے جس پہلو سے میں سب سے زیادہ متاثر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ صرف طالبِ علم تھے۔ بہرحال طالب علم، چوبیس گھنٹے طالب علم، ان سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور گھنٹوں باتیں ہوئیں مگر صرف علمی موضوعات و مسائل پر"۔

حقیقت یہ ہے کہ میدانِ علم و کمال میں صرف وہی شخص گوئے کامیابی و عظمت لے جانے میں طرۂ امتیاز حاصل کرتا ہے جو ہمہ وقت تشنۂ علم و کمال رہتا ہے۔

اور جس کا جذبۂ طلب جام پر جام چڑھانے کے بعد بھی یہی کہتا رہتا ہے ھل من مزید؟
ایوب قادری عہدِ حاضر کی بلند ترین علمی چوٹی پر پہنچے لیکن پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے اور دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی علمی وادبی اور تحقیقی کتابوں کی تصنیف و تالیف، ترجمہ و ترتیب اور حواشی و تعلیقات نیز اشاریہ نگاری (INDEX MAKING) کی جاں کاہ و صبر آزما، گراں قدر خدمات انجام دینے کے بعد بھی ایک "طالب علم" ہی رہے۔ مستقل اور مفصل علمی و تحقیقی کتابوں کے علاوہ انھوں نے بے شمار ایسے مقالات و مضامین بھی لکھے جو برصغیر پاک و ہند کے مقتدر و بلند پایہ رسائل و مجلات میں شائع ہوئے۔ انھوں نے غالباً پچیس کتابوں پر مقدمات اور دیباچے لکھے۔ سہ ماہی "بصیرت" (کراچی) کے اعزازی نائب مدیر، ماہنامہ "سرحد" کے اعزازی نگراں اور اردو کالج کے مجلّے "برگِ گل" کے ایک مدت تک نگراں رہے۔ ان کی "برگِ گل" سے وابستگی کے دور میں بلکہ انھیں کی ادارت میں مجلّۂ مذکور کے سرسیّد نمبر (نقش ثانی) تعلیمی پالیسی نمبر اور قائدِ اعظم نمبر شائع ہوئے۔ "العلم" (کراچی) کا غالب نمبر بھی انھیں کا مرہونِ منت تھا۔ وہ بہ قول پروفیسر شبیر علی کاظمی:

> "علم کے جویا اور کامی آدمی تھے۔ مرحوم وقت کو ضائع کرنا برا سمجھتے تھے۔ وہ ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکھا کر اٹھتے تھے۔ ان میں عامانہ سادگی اور بزرگانہ مروّت تھی۔ وہ تحقیق کے رسیا تھے۔"

علاوہ ازیں وہ ریاکاری و منافقت اور زمانہ سازی جیسی مذموم صفات سے کوسوں دور تھے۔ کسی کی جھوٹی تعریف یا خوشامد کرنا ان کے خمیر میں شامل ہی نہ تھا۔ وہ علّامہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

صاف گوئی ان کا مسلک تھا۔ وہ جادۂ راست بازی کے شہ سوار تھے۔ نمود و نمائش کی آلودگی سے ان کی قبائے حیات یکسر پاک تھی۔ وہ تصنع و تکلف کی جھاڑیوں سے ہمیشہ دامن بچا کر چلنے کے عادی تھے۔ کینہ و بغض کی گرد ان کے آئینۂ دل پر کبھی نہیں پڑی۔ جس بات کو صحیح سمجھتے، برملا اور بلا پس و پیش کہہ دیتے۔ عصر حاضر کے ممتاز محقق و ادیب جناب ثناء الحق صاحب صدیقی، قادری مرحوم کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں رقم طراز ہیں:

"ایوب صاحب میں دل و دماغ کی کئی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انتہائی سادہ مزاج تھے۔ نمود و نمائش نام کی کوئی چیز ان میں نہیں تھی۔ صاف دل اور صاف گو تھے۔ جس سے ملتے صاف دلی اور خلوص کے ساتھ۔ کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو برملا اس کا اظہار کر دیتے۔ بعض حضرات کو ان کی صاف گوئی کھل جاتی۔ لیکن ایوب صاحب اپنی عادت سے مجبور تھے۔ وہ مصلحت کوشی اور زمانہ سازی نام کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے اور نہ ان باتوں پر عمل کر سکتے تھے۔"

کاش یہ غواصِ بحرِ علم و ہنر کچھ مدت اور غوطہ زنی کرتا رہتا تاکہ ہم جیسے خزف چینیان لبِ ساحل اس کے تلاشِ بسیار کے بعد حاصل کئے ہوئے گہر ہائے گراں مایہ سے مزید متمتع ہو سکتے ؎

بہار رفت نچیدم گل از پری روے
گزشت عید و ندیدم ہلالِ ابروے

کسی کتاب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ دشوار ہے۔ اس میں مترجم کے لئے جہاں دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھنا اور ان کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے وہاں یہ کام بڑی جگر کاوی

وجاں کاہی بھی چاہتا ہے۔ پھر ترجمہ اس طرح کرنا کہ عبارت سلیس و شگفتہ اور بامحاورہ بھی ہو نفسِ مضمون بھی بخوبی ادا ہوا ہو اور قارئین کو ترجمے پر اصل کتاب کا گمان ہوتا ہو، ایک ادبی معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کو قاسم ازل نے اس صفت سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے متعدد گراں قدر کتابوں کے ترجمے کئے ہیں لیکن اس خلوص و تندہی کے ساتھ کہ باید و شاید۔ سطورِ ذیل میں ہم ان کی تصانیف و تالیفات، مرتبات اور ترجمہ کردہ کتابوں پر اجمالاً تبصرہ کرتے ہیں تاکہ قارئین کو مرحوم کی علم و ادب سے گہری دلچسپی، صلاحیت کار، دقتِ نظر اور سخت کوشی کا کسی قدر اندازہ ہو سکے ؎

ہاں! اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل؟
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

مولانا فیض احمد بدایونی

از

محمد ایوب قادری بی۔ اے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ دیانت داری کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی۔ بالخصوص ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات تو اس قدر مسخ کئے گئے کہ جہادِ حریت کو "غدر" کا نام دیا گیا اور مجاہدینِ آزادی کو "غدار" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ بے شمار ایسے مجاہدین جو سر بکف اور کفن بردوش دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ بہت سے لوگ ان کے ناموں تک سے واقف نہیں، کارناموں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن جب حالات کسی قدر پرسکون ہوئے، خوف و ہراس کے بادل چھٹے اور مطلع صاف ہوا تو حقائق بھی جلوہ افگن ہونے شروع ہوئے۔ مجاہدین آزادی اور علمبردارانِ حریت کے احوال و کوائف

کی تلاش شروع ہوئی۔ چنانچہ کتاب زیرِ تبصرہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں ایک ممتاز مجاہد مولانا فیض احمد رسوا بدایونی کے حالات درج ہیں۔ پہلے یہ حالات ایک گراں قدر مقالے کی صورت میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بلند پایہ سہ ماہی علمی مجلے "العلم" میں شائع ہوئے جو نہ صرف پاکستان کے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے بلکہ ہندوستان کے مشہور روزنامے "الجمعیۃ" دہلی نے بھی اسے اپنی مسلسل دو اشاعتوں میں شامل کیا۔ بعد میں یہ مقالہ نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اگرچہ ایوب قادری مرحوم کی یہ پہلی تالیف ہے جو صرف چالیس صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس سے مرحوم کے علمی ذوق، جذبۂ تجسس اور تحقیقی رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا فیض احمد رسوا بدایونی کے حالات کے علاوہ ان کے اکابر کے مختصر حالات بھی تحریر کر دئے ہیں جن سے مولانا موصوف کے علمی و خاندانی پس منظر پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

علاوہ ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ اقتدار میں مذہبِ عیسوی کو فروغ دینے کی جو نامحمود کوششیں کی گئیں ان کی بعض جھلکیاں بھی اس کتاب میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً مذہبِ عیسوی کے مشہور ماہر مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر وغیرہ کے درمیان جو مناظرہ ہوا تھا اور جس میں پادری مذکور کو شرمناک شکست ہوئی تھی، اس کی تفصیل بھی اس کتاب میں ملتی ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے دور میں مذہبی انحطاط کے واقعات، جامع مسجد آگرہ کی زبوں حالی، آگرے میں شاہ احمد اللہ کی آمد اور دوسری دل چسپ تفصیلات بھی اس میں درج ہیں۔ آخر میں مولانا کے عربی، فارسی اور اردو اشعار بھی شامل کر دئے ہیں جو ان کے تبحرِ علمی کے علاوہ عقائد کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ "مولانا فیض احمد بدایونی" اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ و فکر انگیز ہونے کے علاوہ ایوب قادری مرحوم کی ان ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتی ہے جو مرحوم کی تصانیفِ مابعد میں جلوہ گر ہوئیں اور جن کی بدولت وہ صفِ اوّل کے اہلِ قلم میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے۔

تذکرہ علمائے ہند

یہ مولوی رحمان علی مرحوم کی گراں قدر تالیف ہے۔ اس میں مؤلف نے ۴۹۲ علمائے دین کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں تھی لیکن ایوب صاحب نے اسے نہ صرف اردو کا لباس پہنایا بلکہ بیش قیمت حواشی اور حُسنِ ترتیب کے زیور سے اس طرح آراستہ و مزین کیا کہ ہر خوش ذوق قاری نے اس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ ترجمہ میں اس بات کا لحاظ بڑی حد تک رکھا کہ مؤلف کے منشا و مفہوم کی پوری طرح عکاسی ہو اور زبان سلیس اور شگفتہ ہونے کے ساتھ بامحاورہ بھی ہو۔ اس کے علاوہ عیسوی سنین کی ہجری سنین سے مطابقت بھی کی۔ حواشی میں ۴۲ علماء کے حالات کا مزید اضافہ کر کے ان کے اسمائے گرامی فہرست میں علیحدہ درج کئے۔ متن کا ترجمہ جلی قلم سے لکھوایا اور اس کے تحت حاشئے یا مزید مواد کی نشاندہی قدرے خفی قلم سے کرائی۔ خفی قلم کے تمام حواشی اور حوالے مترجم مرحوم کے اضافہ شدہ ہیں۔ مؤلف مولوی رحمان علی نے اپنے حالات کتاب کے آخر میں درج کئے تھے۔ اس کے علاوہ چند اور علماء کے نام تکملہ کے بعد شامل کئے تھے۔ مترجم مرحوم نے حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے محولۂ بالا حضرات کے نام ان کے نام کی ردیف کے تحت شامل کر دیئے جس سے کتاب میں حسن ترتیب اور باقاعدگی پیدا ہو گئی۔ کتاب کے آخر میں قارئین کی سہولت اور حوالوں کی تلاش میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کتابیات اور

اشاریہ بھی شامل کر دیا۔

کتابیات اور اشاریہ کے ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولوی رحمان علی نے اپنے اکثر معاصرین یا قریب العہد ممتاز و اجل علماء کو قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ بعض کے صرف نام تکملۂ کتاب میں لکھنے کافی سمجھتے تھے۔ ایوب قادری نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے متعدد ضخیم و نایاب کتابوں اور نادر مخطوطات کو امعانِ نظر سے پڑھا اور پھر حواشی، ترتیب اور تعلیقات کے ذریعہ "تذکرۂ علمائے ہند" کو مفید تر بنایا۔

الغرض "تذکرۂ علمائے ہند"، صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو کر اس قدر وقیع و گراں مایہ ہو گئی ہے کہ اسے اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ مرحوم کی کاوشِ تحقیق و ترجمہ نگاری کی ایک بیّن دلیل ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی کتاب مذکور کے تعارف میں رقمطراز ہیں۔

"ہمارے دوستوں میں جناب محترم ایوب قادری کو اس موضوع سے خاص شغف ہے۔ وہ عرصہ سے علمائے روہیل کھنڈ پر کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ متعدد علماء پر ان کی تحقیق اور پُر از معلومات مقالات مجلّہ "العلم"، کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی رحمان علی صاحب کی کتاب تذکرۂ علمائے ہند کا پیشِ نظر ترجمہ بھی ان ہی کے قلم کا رہونِ منّت ہے۔ جس پر جابجا حواشی میں انھوں نے مفید معلومات کا اضافہ کر دیا ہے اور مصنف پر تعقبات بھی کئے ہیں۔ قادری صاحب اپنی اس کوشش پر مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور آئندہ کے لئے زیادہ سے زیادہ اُن کو علمی کام کرنے کا موقع عطا کرے۔ آمین"

ڈاکٹر سید معین الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اس کتاب پر جو مبسوط

وگراں قدر مقدمہ تحریر فرمایا ہے' اس میں نہ صرف کتاب کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ایوب قادری مرحوم کی انتھک کوشش کو بے حد سراہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"تذکرہ علمائے ہند" ۱۳۰۵-۸ھ میں مرتب ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ تذکرہ دوسری مرتبہ ۱۹۱۴ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپا۔ بڑا مستند اول اور مشہور تذکرہ ہے۔ دور آخر کی ثقافتی تاریخ کے لئے اس میں بہت مفید اور اکثر نادر معلومات مل جاتی ہیں۔ عرصہ سے تقریباً نایاب تھا۔ میری تحریک پر محمد ایوب قادری صاحب کو اس کے اردو ترجمہ، ترتیب اور حواشی کا کام پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے سپرد کیا گیا۔ قادری صاحب نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ حواشی میں ضروری حالات اور مزید مواد کی نشان دہی کر دی ہے۔ تکملۂ کتاب میں علماء کی اچھی خاصی تعداد کے حالات فراہم کر دئے ہیں جن کو مؤلفِ تذکرہ نے چھوڑ دیا تھا۔ کتاب میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل کر دیا ہے۔ ان خصوصیات کی بناء پر ترجمہ کی افادیت بہت بڑھ گئی۔"

حواشی و تعلیقات کے ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اگر انھیں اصل کتاب سے یکسر خارج کر دیا جائے تو نہ صرف افادیت و اہمیت کے لحاظ سے کتاب کی علمی و تاریخی حیثیت فروتر ہو جائے گی بلکہ ضخامت کے اعتبار سے بھی وہ نصف سے زیادہ باقی نہ رہے گی۔

علم وعمل

(جلد اول)

(وقائع عبد القادر خانی)

اس کتاب کی تقریب میں سید الطاف علی بریلوی فرماتے ہیں:

"آخر الذکر کتابوں میں "وقائع عبد القادر خانی" ہے جس کو باضافۂ نام "علم وعمل" جناب مولوی معین الدین صاحب افضل گڑھی نے میرے لئے فارسی سے اردو میں ترجمہ فرمایا $\frac{30 \times 20}{4}$ کے بڑے سائز پر یہ کتاب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔"

کتاب مذکو کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن شیروانی مرحوم کے تعارف سے ماخوذ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"یہ تذکرہ اس زمانے کا وقائع نامہ ہے جبکہ انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ہو رہا تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ پرانے آئین ورسوم مٹ رہی تھیں جدید قائم ہو رہی تھیں۔ زبان بہت صاف اور چست فارسی ہے۔ طرزِ تحریر سادہ، محققانہ اور آزادانہ۔ بہت سے چشم دید واقعات ومعاملات ایسے ہیں جو ہر چند کہ خواب وخیال ہو چکے تاہم سننے اور سمجھنے کے قابل ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بہت سے خیال درست ہو سکتے ہیں تذکرہ اتنا دلچسپ ہے کہ میں نے تین بار پڑھا ہے تاہم چوتھی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس تبصرے کے ذریعے سے بعض خاص خاص حصے اس تذکرے کے عام نگاہوں کے سامنے لاؤں۔ بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس وقت کی سوسائٹی کے حالات ہو بہو بیان کئے ہیں۔ خصوصی علمی و اخلاقی پہلو سے ترقی کر رہے ہیں یا تنزل۔ یہ نہ ہو کہ اس خیال باطل میں

کہ گزشتہ زمانہ جہالت و تاریکی کا تھا۔ اب علم و روشنی کا ہے۔ ہم کسی تباہی کے غار میں جا پڑیں۔ ہم کو کشادہ دلی سے واقعات پر نظر کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اسلاف میں کیا خوبیاں تھیں۔ ہم میں کیا ہیں۔ ان میں جو بیاں ہوں، لے لیں۔ ہم میں جو خامیاں ہوں ان کی اصلاح کریں۔

عموماً خیال ہے کہ یہ زمانہ علم کا ہے، گزشتہ جہل کا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ صورتِ حال بر عکس ہے۔ وہ علم کے حقیقی شیفتہ تھے، ہم نام کے۔ جملۂ بالا میں "یہ زمانہ" آپ کو لندن اور پیرس نہ لے جائے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ہم اپنے گھر کا جائزہ لیں۔ لندن اور پیرس کی شاہراہیں جگمگا رہی ہوں اور ہم اپنی تنگ گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں تو یہی کہیں گے بڑا اندھیرا ہے۔ ع "کجا بود اشہب کجا تاختم"

مسطورۂ بالا اقتباس ہم نے اس لئے پیش کیا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ ایوب قادری مرحوم نے جس کتاب کی ترتیب و حواشی نگاری میں اس قدر عرق ریزی و جگر کاوی کی ہے وہ اصحاب علم و کمال کی نظر میں کیا اہمیت رکھتی ہے اور خود مرتب و حاشیہ نگار کس تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔

کسی قدیم طرز پر لکھی ہوئی کتاب کو طرزِ جدید کے مطابق ترتیب دینا اور مفید معلومات افزا حواشی و تعلیقات سے آراستہ کر کے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرنا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ اس قسم کے امور میں "عشق نورد پیشہ" ہمیشہ سے "طلب گار مرد" رہا ہے اور ایوب قادری مرحوم نے اپنے آپ کو یہ حسن و خوبی "بابِ نبرد" ثابت کیا ہے۔

ایوب قادری مرحوم نے "علم و عمل" پر ایک طویل و مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔ انھوں نے نہ صرف وقائع کے حسن و قبح سے بحث کی ہے بلکہ مؤلف وقائع مولوی عبد القادر

رامپوری کی عالمانہ حیثیت وشخصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خاندان اور زندگی کے تفصیلی حالات بھی درج کئے ہیں۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:

"پہلی جلد کو ہم نے چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب مؤلف کے خاندان تعلیم، ابتدائی ملازمت اور رام پور کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں سفر بنگال کا بیان ہے اور بقیہ چار ابواب میں دہلی اور مضافات دہلی کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔"

چونکہ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) طرز قدیم میں لکھی ہوئی تھی اور مترجم مولوی محی الدین افضل گڑھی نے تمام ترجمہ ایک دفتر میں لکھا تھا اس لئے اس میں نہ کوئی عنوان تھا نہ پیراگراف۔ ابواب کی تقسیم، پراگرافوں کی پابندی اور عنوانات کا تعین وغیرہ۔ سب کام مرتب مرحوم نے اپنی صوابدید کے مطابق کئے ہیں۔ مترجم نے لفظی ترجمے پر زور دیا تھا۔ مرتب نے اسے بڑی حد تک بامحاورہ بنانے کی کوشش کی ہے مگر اس میں بھی احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اصل کتاب جابجا کرم خوردہ تھی اس لئے ترجمے میں بھی وہ مقامات چھوٹے ہوئے تھے۔ خاص طور سے انگریز حکام کے نام نہایت غلط تحریر ہوئے تھے۔ مرتب نے حتی الوسع ان ناموں کی صحت بھی کر دی ہے۔ اگرچہ بعض نام اب بھی مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ ترتیب و حواشی کے سلسلے میں مرتب نے سب سے زیادہ مدد اپنے ذاتی کتب خانے سے لی ہے۔ البتہ بعض اہم کتابیں مولانا محمد عبدالرشید نعمانی اور جناب مولوی سلیمان بدایونی کے ذخائرِ علمی سے بھی بغرض استفادہ حاصل کیں۔ جن کتابوں کا حواشی میں حوالہ دیا ان میں مؤلف کا نام، مطبع، مقام اور سنِ طباعت ضرور لکھا۔ لیکن جو کتابیں ایسی تھیں کہ ان میں سنِ طباعت یا مقامِ طباعت درج نہیں تھا انھیں قوسین میں مطبوعہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

جلد اول کے خاتمۂ کتاب میں نوابانِ رام پور اور دہلی کے ریذیڈنٹ وایجنٹ

سے متعلق دو ضمیمے بھی شامل کر دئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیات کے سلسلے میں ۲۵۳ اردو فارسی کتابوں، ۱۹ مختلف رسائل اور ۳۶ انگریزی کتابوں کی فہرست بھی درج کردی گئی ہے۔ حروف تہجی کے لحاظ سے سیکڑوں علماء وکتب کے اسماء پر مشتمل ایک اشاریہ بھی منسلک کیا گیا ہے۔

جلد اول میں مولوی عبدالقادر رام پوری کے ۱۸۳۱ء تک کے تفصیلی حالات درج تھے۔ اس لئے کہ حالاتِ مابعد معلوم نہ ہوسکے تھے لیکن حُسنِ اتفاق سے مرتّب مرحوم کو بعد میں مولوی عبدالقادر کے پوتے مرزا نصیر الدین (ابن مرزا عبدالبہاری) کے وہ خود نوشت حالات بھی مل گئے جو انھوں نے "نگینۂ انگشتری سلیمانی" کے تاریخی نام سے ۱۳۱۷ھ/۱۹۰۰ء میں فارسی میں لکھے تھے اور جس میں انھوں نے اپنے حالات کے علاوہ اپنے خاندان کے قابلِ ذکر بزرگوں کے حالات بھی درج کر دئے تھے۔ مرتّب مرحوم نے ان بقیہ حالات کو علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) کی جلد دوم میں بطور "پیش لفظ" شامل کر دیا تاکہ اسے جلد اوّل کے مقدمہ کا تتمہ سمجھا جائے۔ اس طرح کتابِ مذکور کی علمی و تاریخی حیثیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ نیز کتاب کے آخر میں مرزا نصیر الدین علیل کے کلام کو بہ عنوان "کلام علیل" شامل کر کے کتاب کو خوب سے خوب تر بنا دیا۔ جلد اوّل کی طرح جلد ثانی میں بھی کتبِ حوالہ جات کی فہرست اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ مختصر یہ کہ مرتّب مرحوم کی حسنِ سعی سے یہ کتاب وقیع سے وقیع تر ہو گئی ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

مؤلفہ

پروفیسر محمد ایوب قادری

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا اسم گرامی جلال الدین تھا لیکن عام طور پر مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۴ر شعبان المعظم

۷۰۷ھ مطابق ۱۹ر جنوری ۱۳۰۸ء میں بروز جمعرات اوچ میں ہوئی۔ اور وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی۔ اس کے بعد ملتان پہنچے اور ایک سال تک تحصیل علم کرتے رہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر مختلف دیار و امصار کی سیاحت کی اور اکابر شیوخ و علما سے اکتسابِ فیض کرنے کے بعد علماء حرمین شریفین سے استفادۂ علمی فرمایا اور سات سال تک مکۂ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد عراق پہنچ کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ شرف الدین ابوالفتح ملتانی کی طرف رجوع کیا۔ بیعت و ارادت کے بعد اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت مخدوم نے اپنے ملفوظات میں بیس بزرگوں سے خرقہ پوشی کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مخدوم کی زندگی رشد و ہدایت سے عبارت ہے۔ اوچ کی خانقاہ میں عوام، خواص، امراء، وزراء اور سلاطین ہر درجے کے لوگ حاضر ہو کر اکتسابِ فیض کرتے تھے۔ آپ کی مبارک مجلس میں علوم و معارف کے رموز و غوامض حل فرمائے جاتے تھے۔ درس و تدریس کا باقاعدہ انتظام تھا۔ آپ کے آثار و ملفوظات بھی بہت مشہور اور گنج گراں مایہ ہیں۔ حضرت مخدوم کی عمر شریف ۷۸ سال کی ہوئی۔ سالِ وفات ۷۸۵ھ، ۱۳۸۴ء ہے۔ مزار مبارک اوچ سابق ریاست بھاولپور میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

سطور بالا میں آپ نے جن محترم بزرگ کا مختصر ترین تذکرہ ملاحظہ فرمایا۔ کتاب محولۂ بالا ان کے تفصیلی احوال و آثار پر مشتمل ہے اور راقم الحروف کے نزدیک ایک ایسی کتاب ہے جسے ایوب قادری مرحوم کی تحقیق و تدقیق اور تلاش و تفحص کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں موصوف نے ہند و پاک کے مختلف شہروں کے صبر آزما سفر کیے اور بعض جگہ حوصلہ شکن حالات پیش آنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ یہاں تک کہ گلہائے مراد سے دامانِ آرزو بھرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ایوب قادری کا ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ حسن عقیدت سے زیادہ حقیقت پسندی پر زور دیتے

تھے اور ادب و احترام کے باوجود بھی کسی بزرگ کو مافوق الفطرت یا ماوراء بشریت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو بھی جلیل القدر اولیاء و علماء کے زمرے میں شامل کرنے کے باوصف انھیں بہ حیثیت انسان ہی پیش کیا ہے اور ان سے متعلق بعض چیزوں کو من و عن قبول نہیں کیا۔ میری رائے میں حضرت مخدوم سے منسوب سفرنامہ جعلی اور وضعی ہے۔ اسی طرح فیروز شاہ کے عہد میں قدم شریف لانے کا واقعہ محض بے بنیاد ہے۔

اس کتاب کے پہلے دو باب ہند و پاک کے سیاسی و ثقافتی پس منظر پر مشتمل ہیں۔ جو تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور ان میں ثقافتی و علمی تاریخ کو صحیح طور سے اجاگر کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مخدوم سے قبل اور خود ان کے دور کے تاریخی و سیاسی حالات نیز ان کی شخصیت اور کردار پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے باب میں پیدائش، تعلیم و تربیت اور بیعت و خلافت کا تذکرہ ہے۔ چوتھے باب میں سیر و سیاحت کی تفصیل اور فیروز شاہ کی اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے۔ باب ہشتم میں رشد و ہدایت، پیروی شریعت و اتباع سنت اور اوصاف مرید وغیرہ بیان کئے ہیں۔ اسی طرح بقیہ ابواب میں دیگر ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

جناب ثناء الحق صدیقی نے اس کتاب پر ایک بصیرت افروز مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس سے وہ اقتباس سطور ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو مؤلف مرحوم کی کد و کاوش سے متعلق ہے۔ مقدمہ نگار موصوف فرماتے ہیں:

> ”ملتان کے تین بزرگوں بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، صدر الدین عارفؒ اور رکن الدین ابو الفتح کے تفصیلی حالات شائع ہو چکے ہیں۔ اوچ جو سہروردی سلسلے کا دوسرا مرکز تھا اس کے اہم ترین بزرگ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے حالات اور کارنامے ابھی تک پوری طرح منظر عام پر نہیں

آئے تھے۔ اور اس عظیم شخصیت کو وہ خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا گیا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ غالباً اس وقت تک زمانہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"، کی عملی تفسیر کا منتظر تھا۔ چنانچہ محمد ایوب قادری کے ہاتھوں یہ کام سرانجام کو پہنچا۔ اور انھوں نے نہایت کوشش و کاوش سے اس بلند پایہ ہستی کے حالات اور کارناموں کی چھان بین کر کے ان کو قلمبند کیا اور زیبِ نظر کتاب کی شکل میں اردو داں طبقے کے ہاتھوں میں پہنچایا۔"

راقم الحروف کے نزدیک مندرجۂ بالا انتہائی جامع و برمحل تبصرے کے بعد کتابِ زیر تبصرہ کی بابت کچھ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
(واقعات و شخصیات)

محمد ایوب قادری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے اجمالاً یا جزدی طور پر ہر تعلیم یافتہ شخص باخبر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانانِ ہند بعض ناگزیر اسباب اور نامساعد حالات کی بنا پر حصولِ آزادی کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں کو اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے مسلمانوں سے جو لرزہ خیز و روح فرسا انتقام لیا اس کی المناک تفصیلات تاحال منظرِ عام پر نہیں آسکی ہیں۔ تاہم واقعات کے چہرے سے پردہ اٹھانے کا سلسلہ اسی وقت شروع ہو گیا تھا۔ اہلِ قلم، شعراء، علماء وغیرہ علی الاعلان نہ سہی اشارۃً و کنایتہً کچھ نہ کچھ اظہار ضرور کر دیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی سیاسی آزادی کے بعد جب مُہرِ سکوت ٹوٹی اور قلمِ حقیقت رقم صفحاتِ قرطاس پر متحرک ہوا تو مصلحت کوشی اور حق پوشی کی جگہ حق گوئی و بیباکی نے لینی شروع کی اور حقائق و واقعات

بے نقاب ہونا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے راز سربستہ سینوں سے سفینوں میں اور مسودات سے مطبوعہ کتب میں منتقل ہو گئے۔ لیکن چونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ یہ آزادی کی نعمت غیر قبہ سے محروم ہونے والے کروڑوں مظلوم و مقہور لوگوں کا بدترین ظالم و مستبد حکمرانوں کے خلاف ایک جہادِ عظیم تھا۔ اس لیئے بہت کچھ آشکار ہونے کے باوجود بھی واقعات کا ایک بڑا حصّہ ہنوز پردہٗ خفا میں ہے لیکن بعض موّرخین و اہلِ قلم اپنے فرائضِ منصبی خلوص وجاں فشانی کے ساتھ انجام دینے میں مصروف ہیں اور ایسی گراں قدر کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن میں اصل واقعات اور حقائق کو افراط و تفریط کے بغیر پیش کیا جارہا ہے۔ ایوب قادری مرحوم کی "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی تالیف کے لئے حسبِ معمول انتہائی عرق ریزی وجاں فشانی سے کام کیا ممکنہ حد تک مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں، رپورٹوں، ڈائریوں، یادداشتوں، خطوط اور دوسرے کاغذات کی چھان بین کی۔ برصغیر پاک وہند کے بعض مشہور و غیر مشہور، سرکاری و غیر سرکاری اور ذاتی کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا اور کتاب کے ہر حصّے میں ایک یا زیادہ ایسے مرقعے پیش کیے جنھیں چشم دید بیانات کہنا مناسب ہوگا چنانچہ مولانا غلام رسول مہر تعارف میں رقم طراز ہیں:

"کتاب بجائے خود بھی ہر اعتبار سے اہم اور مفید معلومات کا ایک بصیرت افروز گنجینہ ہے۔ لیکن ان متعدد چشم دید مرقعوں اور دستاویزوں نے اس کی اہمیت میں دوچند اضافہ کر دیا ہے۔"

ایوب قادری مرحوم کے دل میں علمی نوادر کی تلاش و جستجو کا ایک ایسا پاکیزہ ذوق تھا جو انھیں قارئین کی خدمت میں ہمیشہ خوب سے خوب تر اور لذیذ سے لذیذ تر الوانِ نعمت پیش کرنے پر آمادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ کتاب زیرِ تبصرہ اسی قسم کی ایک کامیاب

کوشش ہے۔ اس میں انھوں نے ایسے واقعات و شخصیات کو بر افگندہ نقاب پیش کیا ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرحوم، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی اس کتاب کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"انھوں نے اپنی اس کتاب میں بعض ایسے مسئلوں کو اجاگر کیا ہے جن کی ابھی تک کسی کی جانب سے خاطر خواہ وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ خاص کر موصوف نے بعض ایسی شخصیتوں سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں جن کا جنگِ آزادی میں اہم رول رہا ہے لیکن جن کے کارنامے اب تک پردۂ خفا میں تھے۔"

سیر العارفین

تالیف

حامد بن فضل اللہ جمالی

مترجمہ و مرتبہ

محمد ایوب قادری

تمام اربابِ علم و دانش کو معلوم ہے کہ برصغیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت بڑی حد تک اجل مشائخ و رفیع القدر صوفیا کی مرہونِ منت ہے۔ ان نفوس قدسیہ نے ظلمت کدۂ پاک و ہند میں وہ مصابیحِ ایمان و معرفت روشن کئے کہ گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا اور بے شمار اصنام پرست اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر بہ سجود ہو گئے۔ مولانا حالی نے اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں فرمایا تھا؎

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

لیکن اس شعر کا اطلاق مذکورہ بالا بزرگانِ دین و اولیا کرام کی مساعی جمیلہ پر بھی

بہ احسن وجوہ ہو سکتا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان محترم المقام مشائخ وصوفیا کے حالات وکوائف کو زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو تاکہ اس مادہ پرستی کے دور میں گم شدگان بادیۂ ضلالت کا رخ منزلِ حق وصداقت کی طرف موڑا جا سکے۔ چنانچہ ایوب قادری مرحوم نے "سیر العارفین" کے ترجمہ وترتیب کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے کر بزرگانِ دین کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک اہم تبلیغی فریضہ بھی انجام دیدیا۔

سیر العارفین میں عہدِ سلاطین کے جن مشائخ وصوفیاء کے حالات وواقعات درج ہیں اُن کا تعلق چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں سے تھا اور یہ حضرات ہندوستان کی کفروشرک سے معمور فضا میں کلمۂ حق بلند کرنے اور اسلامی معاشرے کی تعمیر وتہذیب میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اُن کا دائرۂ کار لاہور وملتان سے بنگال وبہار تک وسیع تھا۔

سیر العارفین میں چشتیہ سلسلے کے چھ اور سہروردی سلسلے کے سات اکابر کے حالات درج ہیں۔ اگرچہ ان تیرہ مشائخ کے حالات مستقل ابواب کے تحت ہیں لیکن ضمناً بعض دیگر بزرگانِ دین کے حالات وواقعات بھی آگئے ہیں۔ مترجم مرحوم نے اس کتاب پر ایک مفید ابتدائیہ بھی لکھا ہے جس میں مولف کتاب حامد بن فضل اللہ جمالی (متوفی ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۶ء) کے مختصر حالات اور کتاب کے ماخذ وغیرہ بھی درج کئے ہیں۔ مؤلف مرحوم کے بارے میں مترجم مرحوم لکھتے ہیں:

> "جمالی، قلندروں اور حیدری وطوسی درویشوں کا بالخصوص ذکر کرتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ لوگ باطنیوں اور قرامطیوں کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔"

ہمارے نزدیک یہ اشارے نہایت اہم ہیں اور علمائے تاریخ کو مستقل دعوتِ

فکر دیتے ہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شیخ علاؤ الدین صابر کلیری جن کا عرس ہر سال بڑے اہتمام سے منعقد ہوتا ہے، کی شخصیت اکثر اہلِ علم کے نزدیک مشتبہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض پیر پرست و خوش عقیدہ لوگوں نے اپنے مخصوص مفادات کے پیشِ نظر یہ افسانہ طرازی کی ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ مستند تاریخی ماخذ میں اُن کا ذکر کہیں موجود نہیں ہے۔ ایوب قادری مرحوم کی نظر سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ وہ سیر العارفین کے ابتدائیے میں رقم طراز ہیں:

"سیر العارفین میں چشتیہ سلسلے کی صابری شاخ کے شیوخ کا ذکر مطلق نہیں ہے۔ تاریخِ تصوّف کا یہ المیہ ہے کہ عہدِ سلطنت کے تاریخی ماخذ یا بعض دوسرے سوانحی ادب و ملفوظات میں صابر صاحب اور اُن کی شاخ کا مطلق ذکر نہیں ملتا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں یہ شاخ برگ و بار لاتی ہے۔ جمالی پر تعصب کا الزام عائد نہیں ہوتا کیونکہ وہ سہروردی سلسلے سے منسلک ہیں۔ اور ایک باخبر اور غیر جانبدار تذکرہ نویس اور وقائع نگار ہیں۔"

کیا علمائے تاریخ مترجم مرحوم کے اس بیان کا نوٹس لیں گے؟

سیر العارفین کا فارسی متن صرف ایک مرتبہ ۱۳۱۱ھ میں دہلی میں طبع ہوا تھا۔ ایوب قادری مرحوم نے اسی نسخے سے ترجمہ کیا ہے۔ مطبوعہ نسخے کے اصل صفحے کا حوالہ دیا ہے اور ترجمے میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اصل متن کی پوری پوری ترجمانی ہو۔ کتاب کی افادیت بڑھانے کے لیے زبان سادہ و سلیس اختیار کی ہے اور حسب ضرورت مختصر حواشی دینے کے ساتھ ساتھ پیراگراف اور سرخیاں بھی قائم کی ہیں۔ سیر العارفین کا اردو ترجمہ ۱۳۱۹ھ میں شیخ غلام احمد (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ولد غلام محمد سنبھلی نے ایک فارسی نسخے سے کیا تھا۔ ایوب قادری مرحوم نے مقابلے کے وقت اسے بھی سامنے رکھا ہے اور بعض اختلافِ نسخ اس ترجمے سے بھی دئے ہیں۔ ایک فارسی نسخہ

نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی میں موجود ہے۔ اس سے بھی مرحوم نے استفادہ کیا ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کے تحریر کردہ مفصل مقدمے نے کتاب کو مزید گراں مایہ بنا دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مترجم نے عہدِ سلطنت کے بادشاہوں کی تخت نشینی کی ایک جدول بطورِ ضمیمہ اور کتابیات و اشاریہ بھی شامل کر دیا ہے۔

تواریخ عجیب
یعنی
کالا پانی
(تالیف مولوی جعفر تھانیسری)

مرتبہ
محمد ایوب ایم۔ اے

اسلام ایک دینِ کامل ہے۔ اس کی بنیادی تعلیمات کے مآخذ کتاب و سنت ہیں۔ تمام دنیا کے مسلمان انھیں دونوں مآخذ سے رہنمائی حاصل کرنے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کو ہی ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ بقول سعدیؒ ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا توان یافت جز در پئے مصطفٰےؐ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

لیکن مرورِ ایام سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ انھوں نے غیر محسوس طور پر اپنے گرد و پیش کے اثرات قبول کرنے شروع کر دئے۔ شرک، بدعت، قبر پرستی اور بہت سے غیر اسلامی مراسم کو اپنے عقائد و اعمال میں شامل کر لیا۔ جس سے دین دار اور حساس طبقہ تڑپ اٹھا۔ یہاں تک کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جیسے لائق فرزندانِ اسلام عملی اقدام کے لئے تیار ہو گئے۔ اور انھوں نے ایک زبردست تحریکِ جہاد شروع کی لیکن ناسازگار حالات، یگانوں کی بیگانگی اور دوستوں کی

دشمنی کی وجہ سے فائز المرام نہ ہو سکے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

تاہم انھوں نے جو صور پھونکا اس کی صدائے بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ چنانچہ مذکورۂ بالا قائدین کے بعد ان کے قابلِ فخر جانشین ان کے قائم کردہ مشن کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ لیکن مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد تحریک جہاد کا ایک نیا موڑ شروع ہو گیا۔ اب تک مقابلہ سکھاشاہی سے تھا لیکن اب انگریزی حکومت بھی بالمقابل آ گئی تھی اور ان سے نبرد آزما ہونا صاحبانِ تحریک کے لئے دشوار تر ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اُن مردانِ حریت پسند نے ہمت نہ ہاری اور تا حتی المقدور حصولِ مقصد کے لئے پوری دل جمعی اور سچی لگن کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ معرکۂ امبیلا (۱۸۶۳ء) ہے اس معرکے میں سرمستانِ بادۂ توحید نے جس پامردی اور عزم و استقلال کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کا مستحق ہے۔ جنگ امبیلا کے انبالے کا مشہور مقدمہ (۱۸۶۴ء) شروع ہوا جس میں دس دیگر افراد کے ساتھ مؤلف کتاب "تواریخ عجیب" مولوی جعفر تھانیسری بھی شامل تھے۔ جن کے بارے میں ایوب قادری مرحوم لکھتے ہیں:

"مولوی جعفر تھانیسری سید احمد شہید کی تحریک کے خاص اراکین میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقاصد کے تحت جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں۔ معرکۂ امبیلا کے بعد ۱۸۶۴ء میں اُن پر بغاوت اور سازش کے الزام میں مقدمہ چلا۔ جائیداد ضبط اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی مگر انھوں نے فرنگی استبداد کے باوجود استقامت کا پورا پورا ثبوت دیا اور ابتلا و آزمائش میں پورے اترے۔"

"تواریخ عجیب" میں انھیں مولوی محمد جعفر تھانیسری کے ذاتی۔ خاندانی، تحریکی

سے متعلق اور جزائر انڈمان میں اٹھارہ سالہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے تفصیلی حالات ہیں۔ ایوب قادری مرحوم نے جناب ثناء الحق صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) کی فرمائش پر اس تاریخی دستاویز کو بڑی خوش اسلوبی سے مرتب کیا۔ ایک مبسوط مقدمے میں تحریک کا پس منظر اور مولوی جعفر تھانیسری کے حالات لکھے۔ ضرورت کے مطابق حواشی و تعلیقات تحریر کئے۔ متنِ عبارت مختلف پیراگرافوں میں تقسیم کر کے ذیلی عنوانات قائم کئے۔ کتاب میں جن اشخاص کے نام آئے ان کے حالات "تذکرۂ رجال" کے عنوان سے علیحدہ سپردِ قلم کئے اور متنِ عبارت میں ایسے اسماء کو خط کشیدہ کر کے نمایاں بھی کیا۔ اس کے علاوہ آخر کتاب میں قارئین کی سہولت و دلچسپی کے لیے دو ضمیمے اور کتابیات و اشاریہ بھی شامل کئے۔ اگرچہ یہ سارا کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا لیکن ایوب قادری مرحوم اس کی گراں بار ذمہ داری سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

"تواریخِ عجیب" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کا پیش لفظ ڈاکٹر محمود حسین صاحب (مرحوم) سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے لکھا ہے جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"یوں تو "کالا پانی" کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ خود میری نظر سے کم از کم تین ایڈیشن گزر چکے ہیں مگر محمد ایوب قادری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس پر حواشی اور مقدمہ لکھ کر نہایت سلیقے کے ساتھ کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا ہے اور اس طرح تاریخ کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔"

پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی موجودہ وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کا تحریر کردہ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ جہاں یہ کتاب قارئین کے دلوں پر ایثار و قربانی کے بے مثل نقش چھوڑے گی وہیں قارئین ایوب صاحب کی اس علمی کاوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

فضائلِ صحابہ واہلِ بیت

(مع مکتوبات شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین دہلوی)

از

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (ف۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۴ء)

مرتبہ محمد ایوب قادری ایم۔ اے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے ایسے نامور و یگانۂ روزگار اور مرجع علماء و مشائخ فرزند ارجمند تھے جن پر صرف انھیں (شاہ ولی اللہؒ) یا ان کے دیگر افرادِ خاندان کو ہی ناز نہیں ہو سکتا بلکہ شاہ عبدالعزیز کی ذات جامع الکمالات تمام عالمِ اسلام کے لیے باعثِ صد فخر و مباہات ہے۔ ان کی تمام تصانیف و تالیفاتِ جوہر یانِ علم و کمال کے نزدیک گنج ہائے گراں مایہ سے زیادہ وقیع و قابلِ قدر ہیں۔ جس قدر کتابیں ان کی مرہونِ قلم ہیں وہ علم و تحقیق کا عدیم المثال شاہکار ہیں۔ قاسم ازل نے انھیں دل و دماغ کی بہترین صلاحتیں عطا کی تھیں۔ انھوں نے اگرچہ متعدد اعلیٰ پائے کی کتابیں تالیف فرمائیں لیکن اگر وہ دیگر کتب سے قطع نظر صرف ایک کتاب تحفۂ اثناء عشری ہی تحریر فرماتے اور کسی دوسرے موضوع پر قلم نہ بھی اٹھاتے تو بھی دنیا کے عظیم ترین محققوں اور قابلِ صد احترام مصنفین کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہوتے زیرِ تبصرہ کتاب "فضائلِ صحابہ و اہلِ بیت" بھی انھیں کے کلکِ جواہر سلک کا شاہکار ہے۔ جب موصوفؒ "تحفۂ اثنا عشری" کی تالیف سے فارغ ہوگئے تو ان کے "بعض دوستانِ صادق و یارانِ موافق" نے بصد اشتیاق و اصرار ایک رسالہ "سر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل"

لکھوایا جو فتاویٰ عزیزیہ کی جلد دوم میں شامل ہے۔ اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے کتب خانے میں مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم کو دستیاب ہوا تھا۔ جس کا اُردو ترجمہ انھوں نے ۱۳۴۹ھ میں کیا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کے اسی اُردو ترجمے کو فارسی متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک دوسرا رسالہ "عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس"، تحریر فرمایا اور ان احادیث کو جمع کیا جن سے خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم کے فضائل ثابت ہوتے ہیں۔ اسی رسالے کے آخری حصے میں وہ احادیث درج ہیں جو اہلِ بیت کے فضائل میں ہیں۔ اس کا فارسی ترجمہ مرزا حسن علی لکھنوی نے کیا تھا۔ بعد میں اس کا اُردو ترجمہ مولانا نظام الدین کیرانوی نے کیا اور تہذیب و نظرِ ثانی مولوی عبدالغفور نے کی یہ رسالہ بھی اسی مجموعے میں شامل ہے۔ اسی موضوع پر شاہ صاحب کا ایک اور رسالہ "وسیلۃ النجات"، ہے جس میں شاہ صاحب نے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ فرقۂ ناجیہ "اہلِ سنت والجماعت"، ہے۔ ایوب قادری مرحوم نے مذکورۂ بالا تینوں رسائل یعنی

(۱) سر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل

(۲) عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس

(۳) وسیلۃ النجات

کے علاوہ کتاب ھٰذا کے آخر میں شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین رحؒ (ف: ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) کے مکتوبات بھی شامل کر دئیے ہیں۔ یہ مکتوبات مختلف رسائل اور کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ ان کا ترجمہ مولوی محمد سلیمان بدایونی مرحوم (ف: ۱۹۶۲ء) اور مولوی جمیل الدین بدایونی نے کیا ہے۔ اس مکمل مجموعے کا مبارک نام "فضائلِ صحابہ و اہلِ بیت"، رکھا ہے۔

ایوب قادری مرحوم نے اس کتاب پر، اٹھاسی صفحات پر مشتمل جو مبسوط و مفصل

مقدمہ تحریر کیا ہے وہ بجائے خود ایک مختصر مگر قابلِ قدر کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقدمہ اتنا تحقیقی اور پُر از معلومات ہے کہ اسے اب بجا طور پر "فضائل صحابہ واہلِ بیت" کا ایک جزو لاینفک کہا جاسکتا ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز کے تبحر علمی وعمیق بصیرت اور دینی وملی خدمات کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے انحطاط پذیر دور کے بہت سے واقعات بھی اجمالاً بیان کر دئے ہیں۔ مثلاً مغل متاخرین کے دور میں ایرانیوں (شیعوں) نے جس طرح اپنی ریشہ دوانیوں اور گھناؤنی سازشوں سے مسلمانانِ ہند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا، مرہٹوں اور سکھوں نے جو بے پناہ مظالم کئے، سیّد برادران قطب الملک عبداللہ خاں (ف ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء) اور امیر الامراء حسین علی خاں (ف ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۰ء) "بادشاہ گر" نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ملکی سیاست پر غلبہ حاصل کر کے استبداد و دہشت گردی کا جو بازار گرم کیا۔ دہلی میں "شاہ مرداں" اور "پنجہ شریف" وغیرہ کی جو فرضی زیارات گاہیں قائم ہوئیں۔ نوابانِ اودھ کی دسیسہ کاریوں سے جس طرح تشیع کو فروغ حاصل ہوا، ان سب کا تذکرہ ان کے مقدمے میں موجود ہے۔ مقدمے میں متعدد کتابوں کے اقتباسات اور ان کے تفصیلی حوالے بھی موجود ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ "فضائل صحابہ واہلِ بیت" بھی ایوب قادری مرحوم کی علم دوستی، ذوقِ تحقیق اور وسعت مطالعہ کا ایک ایسا نادر شاہکار ہے۔ جو بار بار پڑھنے اور سننے کے لائق ہے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مرقّعِ یوسفی

مقدمہ

محمد ایوب قادری ایم۔ اے

"مرقع یوسفی"، مولانا محمد یوسف دہلوئ کے مجموعۂ تقاریر و مکتوبات اور ان کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ اس کا مقدمہ محمد ایوب قادری کا مرہونِ قلم ہے، جو ۲۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ مولانا محمد یوسف کی تقاریر اور مکاتیب اپنی افادیت و جامعیت کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ ان سے تبلیغ کے مقاصد، طریقِ کار، متوقع منافع و برکات وغیرہ کے فہم و حصول میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن قادری مرحوم کا مقدمہ بھی اپنی جگہ خاصے کی چیز ہے۔ اس میں مرحوم نے ۹۳ھ میں محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد سے لے کر علاقۂ میوات میں تبلیغ اسلام تک سلاطین و مشائخ کی عہد بہ عہد تبلیغی کوششوں اور قابلِ تحسین خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اندازِ تحریر ہر جگہ محققانہ ہے اور کتب کے حوالے بھی درج ہیں۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ ظالم و سفاک اور بے رحم حکمراں تھا۔ لیکن ایوب قادری مرحوم نے "چچ نامہ"، از علی بن حامد کوفی کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اسے تبلیغ اسلام سے بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ صفحہ ۶ پر یہ عبارت ملتی ہے:

> "ہریک را بکلمۂ اسلام استدعا کیند وہر کہ بعزّ اسلام مشرف گردد، اورا تربیت کیند"،

دربارِ خلافت سے پاک و ہند کے راجاؤں کو جو تبلیغی خطوط ارسال کئے گئے ان کے ضمن میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور خلیفہ مہدی کے نام ملتے ہیں۔ کئی راجہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ذریعہ اور بیشتر مہدی کے تبلیغی خطوط کے جواب میں

مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح سلطان معز الدین محمد بن سام غوری، اس کے سپہ سالار محمد بن بختیار خلجی، قطب الدین ایبک، مشائخ و صوفیاء میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ، بابا فرید گنج شکر، خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی وغیرہ کی خدمات کا تذکرہ بھی بالاجمال ملتا ہے۔ البتہ علاقۂ میوات کا تفصیلی ذکر، میواتی قوم کے ماضی کے حالات، تاریخی پس منظر، ان کی بدعقیدگی و گمراہی جہالت کے سبب ہندوانہ رسموں میں عملی دلچسپی و شرکت اور بعض علماء کی تبلیغی کوششوں کے نتائج وغیرہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے "نفوس ثلاثہ" یعنی مولانا محمد اسماعیلؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور مولانا محمد یوسفؒ کے حالات و سوانح نہایت عقیدت کے ساتھ اور بڑے شگفتہ و دلکش انداز میں لکھے ہیں۔

المختصر ایوب قادری مرحوم کے مقدمے نے "مرقع یوسفی" کو ایک ایسا آئینۂ جمال یوسفی بنا دیا ہے جس میں ان کے تمام خدوخال اپنی پوری دلکشی و جاذبیت کے ساتھ جلوہ گر ہو گئے ہیں اور دیدۂ شوق کو تابِ رخِ یار دیکھ کر مزید حسرتِ دیدار باقی نہیں رہتی۔

تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ

مؤلفہ

محمد ایوب قادری

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کے انتقال کے بعد مکتبہ معاویہ کراچی نے[۱۹] ان کی تقاریر و مکتوبات کو "مرقع یوسفی" کے نام سے شائع کیا تھا۔ ایوب قادری مرحوم نے اس پر ۶۴ صفحات کا مقدمہ لکھ کر تبلیغ اسلام کا جائزہ پیش کیا تھا۔ لیکن چونکہ تبلیغ اسلام کا موضوع اپنی نوعیت کے لحاظ سے مزید شرح و بسط کا متقاضی تھا اس لئے اس میں تفصیل کے باوجود اجمال محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ بعض

اہل الرائے حضرات نے مرحوم پر زور دیا کہ مقدمہ بعد نظرِ ثانی ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے اس لئے مرحوم نے یہ سوچ کر۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مقدمۂ مذکور پہ نظر ثانی کا ارادہ کر لیا اور جب اشہبِ خامہ منزلِ مقصود پہ پہنچا تو معلوم ہوا ایک مستقل نئی کتاب عدم سے وجود میں آگئی ہے۔

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں تاریخی پس منظر ہے۔ دوسرے باب میں میوات میں اسلام کے داخلے کا ذکر ہے۔ تیسرا باب مسلم حکومت کے استحکام سے تعلق رکھتا ہے۔ چوتھے باب میں میوات میں دینی انحطاط کی تفصیلات ہیں۔ پانچواں باب میوات میں علماء کی تبلیغی کوششوں پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں عیسائیت اور آریہ سماج کی تحریکوں کا بیان ہے۔ ساتویں باب میں مولوی محمد اسماعیل کاندھلوی کے میوات سے تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ آٹھواں باب مولانا محمد الیاس اور تحریک دعوت و تبلیغ کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتا ہے۔ نویں اور دسویں ابواب مولانا محمد یوسف اور تحریک کی وسعت کے بیان کے ساتھ ساتھ پاکستان میں تبلیغی جماعت کے کام کی تفصیلات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی علمی و دینی شخصیتوں اور اُن کی خدمات کے بارے میں ایوب قادری مرحوم کو قابلِ رشک معلومات حاصل تھیں۔ اس پر مستزاد اُن کا جذبہ تلاش و جستجو تھا۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ممکنہ حد تک اس کے لئے قیمتی سرمایہ فراہم کر لیتے تھے۔ اس لئے اُن کی اکثر قلمی کاوشیں علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھی گئیں۔ کتاب زیرِ تبصرہ کے بارے میں مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم رقم طراز ہیں:

"کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مگر جستہ جستہ مختلف مقامات سے دیکھا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف نے کتنی محنت اور جستجو کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے۔ نام کے اعتبار سے تو یہ صرف ایک تبلیغی جماعت کی تاریخ ہے لیکن دراصل اس میں مسلمانوں کی ان تمام تبلیغی کوششوں کا تذکرہ آگیا ہے جو حضرت محمد بن قاسم علیہ الرحمہ کے وقت سے آج تک برصغیر میں کی گئی ہیں۔"

یہ کتاب تحریکِ تبلیغ کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کی بھی تاریخ ہے۔ اس میں ایسے قیمتی اور مفید حوالے بھی موجود ہیں جو اس موضوع پر لکھنے والے دوسرے حضرات کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں موجودہ مادہ پرستی اور تن آسانی کے دور میں نئی نسل کو عملِ صالح کی طرف راغب کرنے اور ان کے دلوں میں جذبۂ بیداری پیدا کرنے میں بھی یہ کتاب سنگ میل کا کام دے سکتی ہے۔

کاروانِ رفتہ

مؤلف
پروفیسر محمد ایوب قادری

اردو زبان میں جہاں متعدد قابلِ قدر و لائق تحسین سوانح عمریاں لکھی گئیں وہاں بعض ممتاز اہلِ قلم نے معروف ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے بھی لکھے۔ اس سلسلے میں پہلی قابلِ ذکر کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" ہے جو اپنی ہمہ گیر مقبولیت اور بے پناہ شہرت کے باعث مزید کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ اس کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" ہے جس کی عظمت کے لئے صرف مؤلفِ علام کا نام ہی کافی ہے۔ عبدالمجید سالک کی "یارانِ کہن" بھی پسند کی گئی ہے۔ چوتھی کتاب "گنجینۂ گوہر" ہے جو شاہد احمد دہلوی مرحوم کی مرہونِ قلم ہے اور زبان و بیان

نیز صداقت و خلوص کے اعتبار سے منفرد ہے۔ مالک رام کی "تذکرۂ معاصرین" ایک سلسلہ دار کتاب ہے جسے ایک گراں قدر تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی نوع کی ایک اہم کتاب ایوب قادری مرحوم کی "کاروانِ رفتہ" ہے۔ اس میں انھوں نے ۲۶ ممتاز و معروف اہلِ قلم، انشاپرداز، شعراء اور علماء کے مختصر لیکن دل چسپ خاکے پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب دراصل اُن سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوکر قارئین تک پہنچے۔ یہ تمام مضامین اُن حضرات کے بارے میں ہیں جو راہیِ ملکِ عدم ہوچکے ہیں۔ اُن میں سے اکثر مضامین ایسے ہیں جو متعلقہ افراد کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے ہیں۔ اور کچھ مضامین کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جن کا انتقال ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۴ء کے دوران ہوا۔ لیکن جن افراد پر بھی قلم اٹھایا ہے اُن کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن حضرات سے مرحوم کے ذاتی تعلقات تھے ان کی مختصر روداد بھی بیان کر دی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضامین شخصی خاکے ہونے کے علاوہ مختصر سوانح عمریوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ گویا ایوب قادری مرحوم نے خاکہ نگاری و سوانح نویسی کا ایک البحاسین امتزاج پیش کیا ہے جو دل چسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ مشہور اہلِ قلم مشفق خواجہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آتے ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسائشوں سے بے نیاز ہوکر خدمتِ علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا۔ قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً ۲۶ برسوں سے ہیں۔ میں نے اس دوران میں انھیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی لگن میں سرشار ملے۔ کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے تو کبھی کسی مخطوطے کا۔ کبھی کسی

گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے تو کبھی کسی معروف مصنف کے

کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ خدا انھیں تادیر سلامت

رکھے کہ ان سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ ان "دیوانوں" سے

ابھی خالی نہیں ہوا جو ہمیشہ "بکارِ علم" ہشیار رہتے ہیں۔"

ایوب قادری مرحوم بذاتِ خود ہی ایک عظیم ادیب اور انشا پرداز نہیں تھے بلکہ بے شمار مایۂ ناز اہلِ قلم، علماء اور دانشوروں سے بھی ان کے قریبی تعلقات و مراسم تھے اس لئے انھوں نے اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر جو شخصی اور سوانحی خاکے لکھے ہیں اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جلد اوّل میں صرف ۲۶ علماء، ادباء اور شعراء کے احوال درج ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کوئی اہلِ دل بقیہ غیر مطبوعہ مضامین بھی خوش مذاقی و نفاست کے ساتھ شائع کر دے اور اُن میں ایک ایسا مضمون بھی شامل ہو جو "کاروانِ رفتہ" کے مؤلف کی باغ و بہار شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے علمی و ادبی شہ پاروں پر تبصرے کو بھی اپنے گوشۂ دامن میں سمیٹے ہوئے ہو ے

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است

تو بدیں آرزو مرا بہ رساں ٭٭٭٭٭

مولانا محمد احسن نانوتوی

مؤلفہ

محمد ایوب قادری ایم۔اے

مولانا محمد احسن نانوتوی انیسویں صدی عیسوی کی ایک انتہائی قابلِ احترام علمی و ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ صرف ایک جلیل القدر عالمِ دین ہی نہیں تھے بلکہ بلند پایہ مصنف، مترجم اور تابع و ناشر بھی تھے۔ انھوں نے مطبعِ صدیقی قائم کر کے علوم اسلامی کی گراں قدر و قابلِ ستائش خدمات انجام دی تھیں لیکن امتدادِ زمانہ سے ان کی خدمات

زینتِ طاقِ نسیاں ہو کر رہ گئی تھیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی انھیں تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ حالانکہ وہ گزشتہ صدی کے نامور اور باکمال علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک طرف شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی گراں مایہ کتابوں کو جو قلمی صورت میں پڑی تھیں، اپنے مطبع صدیقی کے ذریعہ زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا اور دوسری طرف درِّ مختار اور احیاء العلوم جیسی قابلِ قدر و بیش بہا کتابوں کا ترجمہ کر کے فقہ و تصوف کے ذخائر میں متعدبہ اضافہ فرمایا۔ علاوہ ازیں ان کی دیگر تصانیف و تراجم بھی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۲۹ ہے۔ یہ تمام کتابیں اہلِ نظر کے نزدیک بے حد وقیع ہیں۔ لیکن حیرت و افسوس کی بات ہے کہ ایسی عظیم المرتبت شخصیت گوشۂ گمنامی میں پڑی تھی۔ اور کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ موجودہ زمانے کے کسی مستقل تذکرے میں ان کا ذکر تک موجود نہیں تھا۔ حسنِ اتفاق سے جب ایوب قادری مرحوم نے روہیل کھنڈ کے علماء پر کام کا آغاز کیا تو انھیں مولانا کے دینی و علمی کارناموں کا علم ہوا۔ اور انھوں نے ان کے حالات سوانح کی تلاش شروع کی۔ پھر ایک طویل اور صبر آزما کد و کاوش کے بعد مولانا مرحوم کے کوائف پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ تیار کر لیا جو "العلم"، کراچی کی تین مختلف اشاعتوں میں شائع ہو کر برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعد میں مقالۂ مذکور پر نظرِ ثانی کی اور کتابی صورت میں شائع کیا۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں مولف مرحوم نے جس عرق ریزی و جاں فشانی سے کام کیا اس کا کچھ اندازہ کتاب پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مولانا احسن نانوتوی مرحوم کے صرف شخصی و خاندانی حالات ہی درج نہیں ہیں بلکہ ان کی تصانیف و تراجم پر مختصر مگر دلچسپ تبصرہ بھی ہے۔ علاوہ بریں مولانا مرحوم کے حقیقی بھائیوں، مولانا محمد مظہر نانوتوی و مولانا محمد منیر نانوتوی اور صاحبزادے

مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی کے مختصر حالات بھی شامل کر دئیے ہیں۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حالات وسوانح پر مشتمل ایک ضمیمہ بھی منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح نانوتے کے متعدد مشاہیر علماء واہلِ قلم کے حالات وکوائف یکجا ہو گئے ہیں جو ایک طرف ریسرچ اسکالرز کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں اور دوسری طرف مؤلف مرحوم کی علماءِ دین سے گہری عقیدت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہیں۔

سیّد الطاف علی بریلوی

(حیات وخدمات)

مؤلفہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

سید الطاف علی بریلوی ایک مشہور ماہرِ تعلیم، اہلِ قلم اور کئی قابلِ قدر کتابوں کے مصنّف ہونے کی بناء پر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے علمی، تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں منہمک ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ لائقِ تحسین وآفرین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے دل میں مسلمانوں کی اصلاحی وعلمی تحریک کو آگے بڑھانے کا جذبہ شروع سے موجود تھا۔ انھوں نے اپنے قیامِ ہند کے دوران متعدد قومی نوعیت کے کام کئے۔ مثلاً بریلی میں "انجمنِ نوجوانانِ اسلام" قائم کی جس نے بہت سی مفید خدمات انجام دیں۔ ایک مڈل اسکول کو انٹر کالج کے درجے تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قوم میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کرنے کے لئے بڑی جانکاہی وجگر پاشی سے چارسو صفحات پر مشتمل تاریخی کتاب "حیات حافظ رحمت خاں" تالیف کی جو ۱۹۳۴ء میں بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو کر اصحابِ علم وفضل سے زبردست خراجِ تحسین وصول

کرنے کی مستحق قرار پائی ۱۹۴۱ء میں بریلوی صاحب نے ایک "مجلسِ مصنفین" قائم کی جس میں ملک کے مشاہیر اہلِ قلم اور دانشور علمی و تحقیقی مقالے پڑھتے تھے اور جو مجلس ہی کے سہ ماہی آرگن "مصنف" میں شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں بریلوی صاحب پاکستان آگئے اور آتے ہی اپنے ذوق و طبعِ سلیم کے تقاضے کے تحت تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی تجدید کی۔ ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" جاری کیا، سرسید گرلز کالج اور ادارۂ تصنیف و تالیف کا قیام عمل میں لائے۔ ایک شاندار کتب خانہ، پبلک ریڈنگ روم اور بخت خاں میوزیم جیسے ادارے قائم کئے۔

علاوہ ازیں بریلوی صاحب نے کم و بیش ڈیڑھ درجن کتابیں تالیف کیں اور بہت سے پمفلٹ وغیرہ شائع کئے۔ "العلم" کے متعدد گراں قدر خاص نمبر پیش کئے جو علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گئے۔

مندرجۂ بالا بے لوث اور قابلِ ستائش خدمات کا تقاضا یہ تھا کہ الطاف علی صاحب بریلوی کی حیات و خدمات کا کم سے کم ایک اجمالی خاکہ ضرور پیش کیا جائے اور نئی نسل کو اس سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم نے وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا اور ایک کتابچے کی صورت میں بریلوی صاحب کے مختصر سوانح و خدمات سے اپنے قارئین کو آگاہ کیا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتابچہ جناب بریلوی صاحب کی ادب پرور شخصیت اور اُنکی گوناگوں خدمات کو سمجھنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

مجموعۂ وصایاءِ اربعہ

مرتبہ و مترجمہ
محمد ایوب قادری ایم اے

یہ اگرچہ بظاہر ایک کتاب ہے لیکن دراصل اس میں چار مختلف رسائل شامل کئے گئے

ہیں۔ ان میں سب سے پہلا رسالہ "المقالۃ الوضیہ فی النصیحت والوصیہ"، ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ کا وہ مشہور و معروف رسالہ ہے جو کئی بار طبع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے۔ اس رسالے میں آٹھ وصیتیں ہیں جو عقائد و اعمال سے متعلق مختلف مضامین پر مشتمل ہیں۔

دوسرا رسالہ "تصنیفِ رنگین"، ہے۔ یہ بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تصنیف ہے جسے سعادت یار خاں رنگین نے منظوم اردو ترجمے کی صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "تصنیفِ رنگین"، رکھا۔ رنگینؔ کا منظوم ترجمہ خوب رواں ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر شاعرانہ رنگین پیرائیہ بیان کسی قدر کھٹکتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر قابلِ تعریف ہے۔

تیسرا رسالہ "وصیت نامہ"، ہے جو قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے مرتب فرمایا تھا۔ اس میں تجہیز و تکفین، چہلم و ششماہی، قرضے کا ادا کرنا اور تقسیم ترکہ، منصبِ قضا کی ذمہ داری وغیرہ مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا رسالہ بھی ایک "نصیحت نامہ"، ہی ہے جو شاہ اہل اللہ بن شاہ عبدالرحیمؒ کی تالیف ہے اور مختلف دینی و اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے۔

ایوب قادری مرحوم نے مذکورہ بالا چاروں رسائل کو یکجا کر کے "مجموعۂ وصایاء اربعہ"، کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اس میں بھی انھوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق بڑی کد و کاوش کی ہے۔ متعدد اصحاب علم و فضل سے رابطہ قائم کر کے ان کے ذخائرِ علمی سے استفادہ کیا۔ اور چالیس صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ سپردِ قلم کر کے قارئین کو مصنفین اور ان کی تالیفات کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کیں۔ اس دور میں جبکہ لوگوں کے رجحانات میں تبدیلی آچکی ہے دینی علوم پر خالص دنیوی علوم کے حصول کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ مادیت پسندی کا غلبہ اور روحانیت کا فقدان ہے۔ ایوب قادری مرحوم کا اس کتاب کو مرتب کرنا اور اس پر ایک طویل مقدمہ لکھنا نہ صرف انکی

علوم دین و علمائے دین سے گہری عقیدت کا غماز ہے۔ بلکہ بجائے خود ایک عظیم دینی و مذہبی خدمت بھی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں

مرتبہ

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے

یہ کتاب سید الطاف علی بریلوی اور پروفیسر محمد ایوب قادری کی مشترکہ ادبی مساعی جمیلہ کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ کتاب کے شروع میں بریلوی صاحب نے ایک گراں قدر مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ دراصل بریلوی صاحب کو سر سید احمد خاں، علیگڑھ یونیورسٹی اور اس کی عظیم الشان سیاسی و علمی اور تعلیمی و ثقافتی خدمات سے والہانہ لگاؤ ہے۔ چنانچہ یہ والہانہ پن کبھی "ایجوکیشنل کانفرنس" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو کبھی "العلم" کے ذریعہ اس کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں" بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہے جس میں وہ منظومات ضروری صراحت کے ساتھ شائع کی گئی ہیں جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) میں وقتاً فوقتاً پڑھی گئی تھیں۔ اور جو علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، فضل حق، آزاد، ڈاکٹر اقبال اور مولانا محمد علی جوہر جیسے عظیم المرتبت شعرا کی کاوشِ فکر کا نتیجہ تھیں۔ ان نظموں کی وجہِ اشاعت بقول بریلوی صاحب یہ ہے کہ وہ یہ نادر الوجود نظمیں آج بھی اتنی ہی کارآمد ہیں جتنی پہلے تھیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کی اشاعت کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ اس وقت حصولِ منزل کا مرحلہ درپیش تھا اور اب بقائے منزل کا معاملہ ہے۔ پاکستان بفضلہ تعالیٰ حاصل ہو چکا ہے لیکن اس کا استحکام، آزادی کا تحفظ، دینِ اسلام کا نفاذ اور اتحادِ ملی اس

امر کی متقاضی ہیں کہ مذکورہ نظموں کی نہ صرف بار بار اشاعت ہو بلکہ انھیں مختلف کلاسوں کے نصاب میں بھی شامل کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے محترم اسلاف کی انتھک کوشش جذبۂ حریت پسندی اور جد و جہدِ آزادی کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے آگاہ ہو سکیں۔

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم نے اپنے ذوقِ تحقیق و تجسس اور جذبۂ تلاش و تفحص کو اس میں بھی بدرجۂ کمال برقرار رکھا ہے۔ جیسا کہ خود بریلوی صاحب فرماتے ہیں:

"وہ شعراء کرام جن کی نظمیں ہیں ان کے حالات میرے شریکِ تالیف عزیز گرامی قدر پروفیسر محمد ایوب قادری نے کافی تلاش و جستجو سے جمع کیے تھے جن کا انھیں بدرجۂ اتم ملکہ ہے۔ عزیز موصوف جس عزم و ہمت سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں میرا حقِ رفاقت ادا کرتے ہیں وہ میرے لیے حد درجہ لائقِ تشکر و امتنان ہے۔"

جنگ نامہ
آصف الدولہ و نواب رامپور

۱۹۷۲ء

خلیفہ محمد معظم عباسی

مرتبہ

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے

"جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور"، خلیفہ محمد معظم عباسی کی رزمیہ مثنوی ہے جس کی تدوین محمد ایوب قادری مرحوم کی رہین منت ہے۔ قادری صاحب نے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ مثنوی مذکور اس سے پہلے انجمن ترقی اردو، کراچی کے علمی مجلہ "اردو"، کی دو اشاعتوں میں شامل ہو چکی تھی۔ لیکن بعد میں

انجمن ترقی اردو پاکستان نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا اور اس طرح اردو ادب کی ایک قابلِ تعریف خدمت انجام دی۔

ایوب قادری کو یہ "جنگ نامہ" خطی صورت میں مولانا حکیم الٰہی بخش قادری (ف ۱۹۰۲ء) کے ذخیرۂ علمی سے ملا تھا جو ۱۲۲۵ھ میں لکھا گیا تھا اس نسخے کو انھوں نے بنیاد قرار دیا۔ لیکن نسخۂ مذکور کے علاوہ انھیں مندرجہ ذیل چار نسخے اور بھی ملے۔

(۱) نسخۂ مملوکہ حکیم معظم علی خاں عرف مکہ میاں (ف ۱۹۵۳ء) رئیس آنولہ۔ مکتبہ ۱۹۸۷ء۔

(۲) نسخۂ رضا لائبریری رام پور جس کا ترقیمہ درج ذیل ہے۔

"بدست بدخط ازلی قدرت علی رامپوری"

(۳) نسخہ مولوی نظام الدین نظامی بدایونی۔ مدیر "ذوالقرنین" بدایوں۔ (ف ۱۹۷۴ء)

(۴) نسخۂ مملوکہ حکیم فضل الرحمٰن عرف حکیم پالکی بدایونی (ف ۱۹۵۰ء)

ایوب قادری مرحوم نے ان نسخوں کا مطالعہ کر کے اختلاف نسخ اور بعض دوسری تصریحات حواشی میں نقل کر دی ہیں۔ حل لغات اور تشریح الفاظ کے لئے آخر میں ایک فرہنگ بھی شامل کی ہے اور شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے مقدمے کے تین حصے اہم قرار دئے جا سکتے ہیں۔

(۱) واقعہ کا تاریخی پس منظر

(۲) مصنف کے نامکمل حالات (نامکمل اس لئے کہ پورے حالات دستیاب ہی نہ ہو سکے)

(۳) زبان و بیان پر تبصرہ۔

آخر میں اغلاط نامہ بھی شائع کیا ہے جو نہایت ضروری تھا۔

چونکہ آصف الدولہ و نواب رام پور کے درمیان جنگ کا واقعہ بہت اہم تھا اس لئے اکثر ہم عصر شعراء نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا اور اپنے جذبات و واردات قلبی کو اشعار کا جامہ پہنایا۔ میر تقی میر نے جو نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھے، ایک مختصر مثنوی قلمبند کی۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء مثلاً عبدو اور رستم وغیرہ نے بھی نظمیں لکھیں۔ ایوب قادری مرحوم نے مختلف نسخوں کی روشنی میں "مثنوی معظم" کو "جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور" کے عنوان کے تحت مرتب کیا اور میر تقی میر، عبدو اور امیر اللہ تسلیم کی منظومات کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب اردو ادب میں ایک لائقِ تحسین اضافے کا باعث بن گئی۔

مرقعِ شہابی

مرتبہ

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم ایک جلیل القدر دانشور، مایۂ ناز ادیب اور برصغیر پاک و ہند کے ممتاز قلمکار تھے۔ انھوں نے بہت سے اصحابِ علم و فن کو اپنے قلم کی وساطت سے حیاتِ جاوید بخشی۔ وہ تقریباً نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

شہابی مرحوم کی جامع الصفات اور دلکش شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ممتاز اہلِ قلم اور انشاپردازوں نے انھیں "صاحبِ علم و فضل، مجسم نمونۂ عمل، تاریخی معلومات کا خزینہ دار، آگرہ کی قابلِ فخر ہستی، ایک متحرک کتب خانہ، بڑا مصنف یا بڑا انسان، اکبرآباد کا ایک درخشاں ستارہ، پیکرِ اخلاق و سادگی اور

مصنفِ شہیر،، جیسے الفاظ و کلمات سے یاد کیا ہے۔ ,, بڑا مصنف یا بڑا انسان،، جناب ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے (علیگ) کا مرہونِ قلم ہے اور خاصے کی چیز ہے۔ اس کے مطالعے سے مفتی شہابی مرحوم کی دل لکش شخصیت کے کئی روشن پہلو سامنے آتے ہیں۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حاجی ریاض الدین صاحب، مفتی شہابی مرحوم کے سب سے زیادہ مداح و معترف ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شہابی مرحوم کے حالات کتابی صورت میں مرتب ہو جائیں۔ چنانچہ ایوب قادری مرحوم نے اس طرف توجہ کی اور ,, مرقع شہابی،، کی صورت میں ایک دل چسپ کتاب عدم سے وجود میں آگئی۔ مرتب مرحوم نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں شہابی مرحوم کے خاندان کا ذکر اور خود نوشت حالات درج ہیں۔ دوسرے باب میں مختلف احباب اور دانشوروں کے لکھے ہوئے حالات و تاثرات ہیں۔ تیسرا باب تعزیتی پیغامات پر مشتمل ہے۔ اور چوتھے باب میں وہ خطوط ہیں جو اربابِ علم و ادب نے انھیں وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔

ایوب قادری مرحوم نے اس کتاب کو بھی بڑے سلیقے اور حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ,, مرقع شہابی،، کی ابتدا میں مفتی مرحوم کا عکسِ تحریر اور چند نایاب تصاویر بھی شامل ہیں ,, مفتی انتظام اللہ شہابی،، کے عنوان سے ان کا اپنا بھی ایک مضمون ہے۔ جو بڑا وقیع، دلچسپ اور ضروری معلومات پر حاوی ہے۔

مآثر الامراء

مؤلف

صمصام الدولہ شاہنواز خاں

مترجم

پروفیسر محمد ایوب قادری

"مآثر الامراء" کے مؤلف صمصام الدولہ مروجہ علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھیں فارسی زبان و ادب اور انشا پردازی میں مہارت تامہ کے علاوہ مصطلحات اور شعر فہمی میں بھی کمال حاصل تھا۔ وہ نظام الدولہ اور صلابت جنگ (فرمانروائے حیدر آباد دکن) کے زمانے میں اعلیٰ مرتبہ و منصب پر فائز رہے۔ نواب صلابت جنگ نے انھیں وزیر مطلق بھی مقرر کیا اور اس حیثیت سے انھوں نے ریاست کے حالات کو بڑی حد تک درست کیا۔ سرکشوں کو تنبیہ کی اور فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکا۔ لیکن جب ناصر جنگ نے اپنے بوڑھے باپ آصف جاہ سے سرکشی کی تو اس کے نتیجے میں شاہنواز خاں بھی معتوب ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اسی گوشہ نشینی کے زمانے میں انھوں نے اپنی گراں قدر علمی و تاریخی کتاب "مآثر الامراء" کی تدوین شروع کی اور پانچ سال تک بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ کام کرتے رہے لیکن جب آصف جاہ نے ان کا سابقہ مرتبہ و منصب بحال کر دیا تو گوناگوں مصروفیات کی بناء پر وہ اس علمی و تاریخی مشغلے کو جاری نہ رکھ سکے اور "مآثر الامراء" کی تدوین کا کام نامکمل ہی رہ گیا۔ کچھ عرصہ بعد حالات پھر دگرگوں ہوئے صمصام الدولہ کی مخالفت دوبارہ شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان کا گھر بار بھی لٹ گیا اور وہ اپنے بیٹوں عبدالحی اور عبدالغنی کے ساتھ قید کر دئے گئے، مستورات کی بے عزتی کی گئی اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مفسدوں نے نواب صمصام الدولہ اور ان کے فرزند عبدالغنی

کو قتل کر دیا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا ؎

رفت صمصام الدولہ زجہاں　　　سیوم ماہِ شریف رمضان

سال ایں واقعہ سید خود　　　گفت "ماکشتۂ عبدالرحمان"

چونکہ نواب صمصام الدولہ حکومت کے کاموں میں مشغول ہونے کی بنا پر اپنی اس کتاب کی تکمیل نہ کر سکے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک بار اپنے فرزند عبدالحی سے کہہ دیا تھا کہ تم اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اگرچہ ان کی شہادت کے بعد گھر کا سارا مال و اسباب لٹ گیا تھا اور کتب خانہ بھی برباد ہو گیا تھا۔ لیکن ان کے مخلص دوست میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس گراں مایہ علمی کتاب کی تلاش جاری رکھی۔ خدا خدا کر کے ایک سال کے بعد کتاب کے مختلف اجزاء دستیاب ہوئے تو بڑی محنت سے انھیں مرتب کیا۔ قطب الملک عبداللہ خاں امیر الامراء حسن علی خاں، نواب آصف جاہ اول اور ان کے فرزند نظام الدولہ کے حالات اپنی تالیف "سرو آزاد" سے لے کر شامل کئے۔ نیز ایک خطبہ و تمہید اور مؤلف کتاب نواب صمصام الدولہ شاہنواز کے حالات بھی خود لکھ کر درج کئے۔

نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں کے لائق فرزند میر عبدالحی نے اپنے والد کی اس شاہکار تالیف پر نہ صرف نظرِ ثانی کی بلکہ مستند تاریخی مآخذ سامنے رکھ کر بارہ سال کی طویل مدت میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور خود یہ قطعۂ تاریخ بھی کہا ؎

قلم حدیقۂ آراست از بہارِ سخن

پسند اہلِ خرد، عیش گاہِ ہر دانا

سوادِ کلکِ بہار آفرینِ راقم آں

شکست نازِ ارم رشکِ جنت الماویٰ

دبیرِ عقل رقم کرد سالِ اتمامش

زہے ادیب مصاحب "ماٰثر الامراء"

۱۱۹۴ھ

اس طرح "مآثر الامراء" اپنی تدوین و تالیف کے لئے صمصام الدولہ شاہنواز خاں کے علاوہ میر غلام علی آزاد بلگرامی اور صمصام الدولہ کے فرزند میر عبدالحیٔ کی بھی مرہونِ منت ہے لیکن یہ گراں قدر علمی و تاریخی سرمایہ ترکی اور فارسی کا آمیختہ ہونے کی بنا پر اردو قارئین کے فہم وادراک سے بالاتر تھا۔ آج کل چونکہ منفعت جوئی اور تموّل پسندی کا دور ہے اس لئے فارسی کی تعلیم لاحاصل خیال کی جاتی ہے اور جہاں تک کہ ترکی زبان کا تعلق ہے اس کے لئے تو مشہور ہی ہے کہ ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس لئے یہ کتاب شاذ و نادر ہی کسی کے زیر مطالعہ رہی ہوگی۔

"مآثر الامراء" کا انگریزی ترجمہ مشہور مترجم و مؤرخ ہنری بیورج نے ۱۹۱۱ء میں شروع کر کے ایک طویل مدت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ان کے انتقال کے بعد نظر ثانی کے فرائض بینی پرشاد صاحب نے انجام دئے لیکن یہ ترجمہ اتنا صحیح اور اصل کے مطابق نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ شاید قاسمِ ازل نے اس عظیم الشان علمی و ادبی اور تاریخی کام کے لئے پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم کا نام لوحِ محفوظ پر رقم فرمادیا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پاکستان کے مشہور علمی ادارے مرکزی اردو بورڈ (لاہور) نے اس اہم تاریخی ماخذ یعنی "مآثر الامراء" کا اردو ترجمہ اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا تو یہ کام مترجم مرحوم کے سپرد کیا اور انھوں نے شبانہ روز کی عرق ریزی و جانفشانی سے کم و بیش دو سال کی مدت میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ وہ خاص اس مقصد کے لئے ایبٹ آباد بھی گئے۔ ممتاز محقق و اہلِ قلم جناب ثناء الحق صاحب صدیقی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ صدیقی صاحب اپنے علمی و ادبی کام میں مصروف تھے اور ایوب قادری مرحوم اپنے دھن میں لگے ہوئے تھے۔ مرحوم کی اپنے کام سے دلچسپی و انہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دن میں دس دس صفحات کا ترجمہ کر لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اصل "مآثر الامراء"

۲۸۷۴۲

ترکی آمیز فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس کی زبان بڑی ادق و عسیر الفہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصل کتاب کو معدودے چند لوگوں نے ہی پڑھا ہے۔ ہم نے اس کتاب کے حوالے مولانا ابوالکلام آزاد یا نیاز فتحپوری کی اردو تحریروں میں ہی دیکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی اور نے بھی اس سے اعتنا کیا ہو لیکن ایوب قادری مرحوم نے جس سلیس و رواں شگفتہ و بامحاورہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے اس سے ان کی نہ صرف قدرتِ زبان و لطافتِ بیان ظاہر ہوتی ہے بلکہ علم دوستی و ادب پروری پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

ایوب قادری مرحوم "ماثر الامراء" کے ابتدا میں رقمطراز ہیں:

"اردو ترجمے میں بڑی حد تک اصل کی رعایت رکھی ہے۔ سادہ و سلیس زبان اختیار کی ہے تاکہ پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ اس سے بآسانی استفادہ کر سکیں۔ حسب ضرورت حواشی لکھے ہیں۔ ہم نے بعض حواشی انگریز مترجم کے بھی شامل کر دئے ہیں۔ ایسے حواشی کے اختتام پر بیوریج کی رعایت سے "ب" اور جہاں خود حواشی لکھے ہیں وہاں قادری کی "ق" لکھ دیا ہے۔ ہجری سنین کو عیسوی میں بدل دیا ہے۔ فارسی متن (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ) کے صفحات کا حوالہ اردو ترجمے میں قوسین [ ] کے اندر دیا ہے تاکہ اصل سے رجوع کرنے میں سہولت ہو۔"

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ مترجم مرحوم نے کس قدر جان کاہی و جگر تپی سے ترجمے کی ہفت خواں طے کی ہے۔ اتنا ہی نہیں، انھوں نے کتاب کے شروع میں کتب حوالہ جات کی فہرست اور آخر میں ایک طویل اشاریہ و صحت نامہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اور امراء کی فہرست بھی باعتبار حروف تہجی ترتیب دے کر شامل کر دی ہے۔ اس کے علاوہ شاہان مغلیہ کے سالہائے جلوس کی ایک فہرست بھی بطور ضمیمہ لگا دی ہے۔

المختصر! "ماثر الامراء" جو نثر کی آمیز فارسی میں تین جلدوں پر مشتمل تھی پروفیسر محمد ایوب قادری کے سلیس و شگفتہ ترجمے کی بدولت اردو ادب کی بھی ایک وقیع و گراں قدر کتاب ہو گئی ہے اور ہر علم دوست و ادب نواز شخص کی ضیافت طبع کے لئے مائدہ لذیذ فراہم کرتی ہے

غالب اور عصر غالب

(غالب پر چند تحقیقی مقالات)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مرزا غالب اپنے فکر و فن اور شعری و نثری تخلیقات کے لحاظ سے ان شخصیتوں میں سے تھے جنھیں ہر دور میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور دیکھا جائے گا۔ اگرچہ ان کی زندگی میں ہی لوگوں کو ان کی قلمی تخلیقات اور حالات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ اس سے خاطر خواہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عہدِ مستقبل ان کی صحیح مرتبہ شناسی اور قدردانی کے فرائض انجام دے سکے گا۔

طالعِ من در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

چنانچہ ان کی پیشن گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ بیسویں صدی عیسوی میں غالب شناسی کا نیا دور شروع ہوا۔ ان کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ خطوط کے خوبصورت مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں جب ان کے انتقال کو سو سال گزر گئے تو صد سالہ تقریبات کا اہتمام ہوا۔ صرف برصغیر پاک و ہند میں ہی ان کی شخصیت و کلام سے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں ان پر قابلِ قدر کام ہوا۔ اور "شہرتِ شعرم بہ گیتی" کی عملی شکل نظر آنے لگی۔ اس موقع پر جہاں اکثر اہلِ قلم اور انشا پردازوں نے

نے اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھائے وہاں پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اپنے قلمِ فصاحت رقم کو جنبش دی اور غالبؔ سے متعلق توگراں قدر مضمون لکھے جو پاکستان کے مختلف ممتاز و وقیع رسائل میں شائع ہوئے اور جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں نہایت پسندیدگی نظروں سے دیکھا گیا۔

ایوب قادری مرحوم کے ایک استاد پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر مرحوم بھی تھے جن کے ایک فرزندِ سعید جناب ثاقب علی خاں صاحب ہیں۔ انھوں نے قادری صاحب کے مضامین کو "غضنفر اکیڈمی" کی طرف سے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اس پر قادری صاحب نے مضامین مذکور پر نظرِ ثانی کی اور غضنفر اکیڈمی نے انھیں "غالبؔ اور عصرِ غالبؔ" کے نام سے قارئین کی خدمت میں پیش کرکے اردو ادب کی ایک قابلِ تحسین خدمت انجام دی۔

پروفیسر ایوب قادری مرحوم نے اپنی فطری خوش ذوقی کی بنا پر مذکورہ مضامین بھی نہایت کدوکاوش اور تلاش و تجسّس کے ساتھ لکھے اور حق یہ ہے کہ غالب شناسی کا حق ادا کر دیا۔ ساتھ ہی "عصرِ غالبؔ" کو بھی اس طرح اپنے مضامین کے دامن میں سمیٹا کہ بعض ایسے آب دار موتی بھی چمکتے ہوئے دکھائی دینے لگے جو اب تک پردۂ خفا میں پنہاں تھے۔ مثال کے طور پر نواب الٰہی بخش معروف کا غیر مطبوعہ کلام ہے۔ یہ غیر مطبوعہ کلام وہ ہے جو قادری صاحب کے اپنے کتب خانے میں موجود ایک ناقص مجموعے میں شامل تھا۔ اس مجموعے کا جب مطبوعہ مجموعے سے مقابلہ کیا گیا تو ۲۳ غزلیں ایسی نکلیں جو مطبوعہ کلام میں شامل نہیں تھیں جیسا کہ مرحوم نے خود لکھا ہے:

"ہمارے کتب خانے میں نواب الٰہی بخش معروف کے کلام کا ایک ناقص مجموعہ ہے جو صرف ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ ہے۔ ہر صفحے میں تیرہ سطریں ہیں۔ کاغذ و کتابت قدیم ہے۔ کتابت کا انداز بھی پرانا

ہے۔ ک یا گ ، یائے معروف یا یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔
ٹ پر چار نقطے لگائے گئے ہیں۔ بعض اوقات نقطوں سے بھی بے نیازی
برتی گئی ہے۔"

قادری صاحب نے ان غزلوں کو نہ صرف شائع کیا بلکہ شائع کرنے سے پہلے ان کی صحت و درستی میں بھی سخت محنت کی۔ اس کے ساتھ نواب الٰہی بخش خاں معروف کے مختصر سوانح حیات لکھ کر بھی شامل کر دئیے تاکہ ناواقف قارئین کو نواب مرحوم کی شخصیت سے بھی آگاہی ہو جائے۔

علاوہ ازیں غالبؔ اور سر سیّد احمد خاں کے باہمی تعلقات پر بھی اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاصرین (جن میں امیر حسن خاں بسمل، مولوی علی بخش شرر اور احسن بلگرامی شامل ہیں) سے غالبؔ کی جو ادبی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی اس کا تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ مارہرہ (ضلع ایٹہ۔ یوپی) کے کنبوہ شیوخ اور سادات واسطیہ سے مرزا غالبؔ کے روابط کا بیان بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔

"غالبؔ اور روہیل کھنڈ"، کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ بہت اہم ہے۔ اس مضمون کو محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش"، لاہور نے اپنے رسالے میں نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر اظہار پسندیدگی بھی فرمایا تھا۔ اگرچہ روہیلہ پٹھانوں کے زمانے میں روہیل کھنڈ کو بڑی اہمیت حاصل تھی لیکن امتدادِ زمانہ سے عظیم تغیرات ظہور پذیر ہوئے مگر اس کے بعض علاقے ایک کمشنری کی صورت میں باقی رہ گئے جو سات اضلاع بریلی، بدایوں، شاہجہان پور، پیلی بھیت، مراد آباد، رام پور اور بجنور پر مشتمل ہیں۔ مضمون ہٰذا میں اُن شعری، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے جو مرزا غالبؔ کی شخصیت کے زیر اثر علاقہ مذکور میں رونما ہوئے۔

"مطائبات غالبؔ"، کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ غالبؔ کے ظریفانہ مزاج یا

بقول حالی "حیوانِ ظریف"، کے مزاح و ظرافت کے آئینہ دار واقعات پر مشتمل ہے جو حضرت شیو ابریلوی سے منقول ہیں۔

اس کتاب کا آخری مضمون "قطعاتِ تاریخ انتقال و مزارِ غالب"، کے عنوان سے ہے۔ مرزا غالب چونکہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہترین مراسلہ نگار اور انشا پرداز بھی تھے۔ اور ان کے احباب و متعلقین کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ اس لئے ان کے انتقال پر علمی و شعری حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ بے شمار شاعروں اور ادیبوں نے قطعاتِ تاریخ کہے اور مراثی لکھے۔ اسی سلسلے کی بعض گم شدہ کڑیوں میں ایوب قادری کو دو غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئیں جن میں ایک تو وہ مکتوب فارسی ہے جو حکیم جعفر حسین دیوبندی نے اپنے بھائی یوسف علی کو لکھا ہے جو ضلع ہوشیار پور میں سب اوورسیر تھے۔ دوسری تحریر منشی فضل حسین برشتہ کا خطی دیوان ہے جو ایوب قادری کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے برشتہ نے مرزا غالب کے انتقال پر دو قطعات تحریر کیے تھے۔ قادری صاحب نے ان دونوں قطعات کو اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ علاوہ بریں چند ایسے قطعاتِ تاریخ بھی شاملِ کتاب کر دئے ہیں جو مطبوعہ تو تھے لیکن عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے۔

مزارِ غالب ایک مدّت سے شکستہ حالت میں تھا۔ سب سے پہلے محمد علی جوہر نے ۱۹۱۲ء میں اس کی تعمیر کے لئے آواز بلند کی تھی بعد میں اور لوگوں نے بھی اس کی طرف اعتنا کیا۔ مولوی نظام الدین نظامی بدایونی ایڈیٹر "ذو القرنین" بدایون (ف ۱۹۴۷ء) نے بھی اس سمت میں قدم اٹھایا تھا۔ چنانچہ ان کا وہ مضمون جس کا عنوان ہے "مرزا غالب کے مزار کی مرمّت"۔ ایوب قادری کو کہیں سے مل گیا تھا، مرحوم نے اسے بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون زیادہ دلچسپ اور مفید تر ہو گیا ہے۔

لولوئے از غیب

مصنّفہ

شیولال

مرتّبہ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم

مثنوی رسالہ شگن موسوم بہ "لولوئے از غیب" ۱۱۰۲ھ ایک ہندو شاعر شیولال کی مرہونِ منت ہے جو روہیل کھنڈ کے مشہور مردم خیز قصبے آنولے کے رہنے والے تھے۔ مثنوی کا نام تاریخی یعنی ۱۱۰۲ھ (مطابق ۱۶۹۰ء) ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تختِ دہلی پر اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ رونق افروز تھے۔ مثنوی نفسِ مضمون کے اعتبار سے تو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں۔ اس لئے کہ اس میں شگون لینے اور اس پر اعتقاد رکھنے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ تحقیقات و انکشافات کے دور میں اس قسم کی توہم پرستی و جہالت کی باتیں علمی و ادبی حلقوں میں بجز خندۂ زیرِ لب پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہاں! اگر اس کی زبان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو حیرت انگیز مسرت ضرور ہوتی ہے۔ سلاستِ زبان اور شگفتگی بیان واقعی لائق تحسین ہے۔ جناب ثناء الحق صدیقی اس کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

"تاہم زبان کے اعتبار سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا مضمون یقیناً غیر دلچسپ اور موجودہ زمانے کے لحاظ سے قطعاً غیر مفید ہے۔ اس میں شاعرانہ محاسن کی بھی خاصی کمی ہے۔ لیکن قواعدِ زبان، جملوں کی ساخت اور لب و لہجہ کے اعتبار سے یہ موجودہ دور کی اردو سے مختلف نہیں ہے۔ اگر پہلے سے نہ بتایا جائے تو کوئی شخص بھی اس کے مطالعے کے بعد یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ مثنوی تین سو سال پرانی ہے۔ زبان کی روانی

اور اندازِ بیان کو دیکھ کر اس پر دورِ حاضر کی تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ البتہ بعض الفاظ ایسے ہیں جو اب خواص کی گفتگو اور تحریروں میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ یا تو عوام اور دیہاتیوں میں مروج ہیں یا متروک ہو چکے ہیں:۔

"تین سو سال پرانی زبان"، پر "دورِ حاضر کی تخلیق کا گمان"، جہاں ایک طرف انتہائی حیرت انگیز ہے وہاں اس سے دوسری طرف اس غلط فہمی کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ ولی دکنی کی دہلی میں آمد سے قبل کوئی قابلِ قدر کلام یہاں موجود نہیں تھا۔ یہ زمانہ تحقیق و انکشاف کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح اس مثنوی سے یہ راز سربستہ منکشف ہوا کہ شمالی ہند میں ولی سے پہلے بھی فصیح زبان میں شاعری ہوتی تھی۔ اسی طرح بعض دوسری تحریریں بھی آگے چل کر زبان اردو سے متعلق دوسرے حقائق کو بے نقاب کر دیں۔

ہم ولی کی شاعرانہ عظمت کے منکر نہیں لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ جب تک شاہ سعد اللہ گلشن نے انھیں اردوئے معلیٰ میں شعر کہنے کی ترغیب نہیں دی تھی وہ خالص دکنی زبان میں ہی فکرِ سخن فرمایا کرتے تھے اور ان کا رنگ کلام کچھ اس قسم کا تھا ؎

یو تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا　　زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

نین دیوی میں پتلی یو ہے یا کعبہ میں اسود ہے　　ہرن کلا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور دستا

البتہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات اور ان کی فرمائش کے بعد ولی اس قسم کے اشعار کہنے لگے تھے ؎

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں نین تیرے غزالاں سوں کہوں گا

اسکی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم
بلبلِ باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا

آوے اگر وہ شوخ ستم گر عتاب میں
جرأت جواب کی نہ رہے آفتاب میں

مثنوی "لولوئے از غیب"، کے نفسِ مضمون سے قطع نظر اس کی سلاست وروانی سے لطف اندوز ہونے کے لئے اشعارِ ذیل ملاحظہ فرمایئے ؎

شگن منگل اگر ہر دم ستاوے	کسی عورت کو بستی میں رُلاوے
چلے، از بس ہوائے تیز اور تند	و یا بستی کا مالک ہو فکر مند
یہ باتیں وہ شگن اکثر دکھاوے	نہ دکھلاوے تو پھر بھونچال آوے
کہیں یہ کاش ہوتے اپنے گھر میں	صبح کے وقت یا پہلے پہر میں

اس مثنوی کا خطی نسخہ ایوب قادری مرحوم کے ذخیرۂ مخطوطات سے دستیاب ہوا ہے۔ انھوں نے اسے بڑی محنت اور توجہ سے مرتب کیا تھا اور حسبِ معمول بعض حواشی و تعلیقات کے ذریعہ اس سے متعلق بعض اختلافات و متروکات کو بھی واضح کیا تھا۔ یہ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی آخری ادبی خدمت تھی۔ اس کے بعد پیک اجل نے انھیں مہلت نہیں دی۔ وہ بہت جلد عازم خلد بریں ہو گئے ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قارئینِ محترم! ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی تالیفات، ترجمات اور مرتبات کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن جتنی کتابیں ہمیں دستیاب ہو سکیں ان پر ہی ہم نے تبصرہ کیا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر اختصار تھا لیکن اس کے باوجود یہ مضمون خاصا طویل ہو گیا۔ بطورِ اعتذار بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

صابر براری

چراغِ علم

۱۳۴۴ھ

"گوہرِ لاجواب پروفیسر محمد ایوب قادری"

۱۹۸۳ء

پروفیسر محمد ایوب قادری ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء مطابق ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو ضلع بریلی کے قصبے آنولہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی مشیت اللہ سے عربی و فارسی پڑھی ۱۹۵۰ء میں اسلامیہ کالج بدایوں سے انٹر پاس کر کے کراچی آگئے اور یہاں ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی۔ اے اور ۱۹۶۲ء میں کراچی سے ایم۔ اے کیا اور اردو کالج میں لکچرار ہو گئے اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں کراچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔

ڈاکٹر ایوب قادری کو تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا۔ ان کا میدان تاریخ، سوانح، ادب فنِ اسماء الرجال اور حوالہ جاتی ادب تھا۔ آپ اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق، مؤلف، مترجم کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ بے شمار مضامین و مقالے لکھے۔ کئی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ تراجم کی بڑی تعداد اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر ایوب قادری سادہ مزاج اور نام و نمود سے بے نیاز تھے۔ علماء و صلحاء کی عزت اور اہلِ علم و ادب کی قدر دانی اُن کا شعار تھا۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء مطابق ۱۴۰۳ھ میں ایکسیڈنٹ کے سبب کراچی میں وفات پائی۔

اردو کے منفرد ادیب مرزا ظفر الحسن مرحوم کی یاد میں
یہ کتاب کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو
حیدرآباد۔ دکن کو پیش کی جاتی ہے

غمزدہ ہیں یوں تو ہم اُن کی جُدائی سے مگر
دل کو تسکیں ہے کہ وہ عالی نسب جنّت میں ہیں

جن کے دل میں تھی لگن تصنیف اور تالیف کی
وہ مورّخ ماہرِ علم و ادب جنّت میں ہیں

تھی انھیں نسبت درِ دربارِ غوثِ پاک سے
وہ بہ فیضِ غوثِ جیلانی لقب جنّت میں ہیں

عاملِ احکامِ اسلامی رہے وہ ہر قدم
از طفیلِ رحمتِ محبوبِ رَب جنّت میں ہیں

کہئے صاؔبر ڈاکٹر ایوّب کا سالِ وفات
قادری ایوّب گوہر ریز اَب جنّت میں ہیں

۱۴۰۳ھ

مجلس ادبیات مشرق
۳ ڈی - ۹/۲۶ - ناظم آباد - کراچی